ہدایت نامۂ شاعر

ساقی فاروقی

ہدایت نامہ شاعر

تمام مطبوعہ اور غیر مطبوعہ مضامین

۱۹۵۵ء تا ۱۹۹۴ء

ساقی فاروقی

سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور

۱۹۹۵

نیاز احمد نے

این کیو پرنٹرز، لاہور سے چھپوا کر

سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور

سے شائع کی۔

قیمت ۲۵۰/۰۰ روپے

If you wanted to know something about an
automobile, would you go to a man who
had made one and driven it, or to a
man who had merely heard about it?

Ezra Pound

مٹی سے ہوا منسوب مگر آتش خانہ سا جلتا ہوں
کئی سورج مجھ میں ڈوب گئے مرا سایہ کم کرنے کے لئے

اپنے پیارے دوست

عبداللہ حسین کے نام

ایک بار عبداللہ نے کہا تھا کہ ”ساقی! جی نہ ہارنا۔ کسی نہ کسی کو معیار تو قائم رکھنا ہی ہے ——“ تو میری جان! یہ تو نہیں معلوم کہ میں معیار قائم رکھ سکا کہ نہیں مگر اس میں کوئی شک نہیں کہ میں اپنے اصولوں کی طرف داری میں مستحکم اور اپنے رویوں کی مدافعت میں ثابت قدم رہا۔

ساقی

31 دسمبر 1994ء

---خلق خدا غائبانہ---

"ساقی نے شاعری کی طرح نثر کو بھی کلیشے کی قید سے آزاد کیا ہے"
(مشفق خواجہ)

"اگر علامہ اقبال بھی ساقی کے زمانے میں ہوتے تو یہ عزیز انہیں بھی اپنے قیمتی مشورے ضرور دیتا"
(انتظار حسین)

"ساقی فاروقی کی شگفتگی تحریر کی جتنی تعریف کی جائے کم ہے"
(ادیب سہیل)

"Good manners are not in Saqi's personal code of conduct. That is why he is considered good company. He is a man who shocks with great ease."
انگریزی والے (اردو والے نہیں) خالد احمد

"ساقی فاروقی کی کتاب نے جو ادبی دھماکہ کیا ہے اس سے بڑے بڑے شاعر چاروں شانے چت ہو گئے ہیں۔ وہ واحد ادیب ہیں جو رہتے تو انگلستان میں

ہیں لیکن ان سے خوف کھانے والے پوری دنیا میں ملتے ہیں"

(انور سدید)

"ساقی فاروقی کے ان مضامین کی پسندیدگی کی وجہ ان کی صاف گوئی ہے۔ ان کی تنقیدی آرا سے اختلاف نہیں، سخت اختلاف کیا جا سکتا ہے مگر ہمارے نقادوں میں کوئی تو ہے جو دھڑے بندی سے علیحدہ رہ کر اپنے دلی محسوسات قاری کے سامنے پیش کرنے کی ہمت رکھتا ہے"

(عطاء الحق قاسمی)

"Saqi Farooqi is a tradition breaker and admirer of it simultaneously. His originality of thought reflects his intelligence and sagacity." (یونس احمر)

"ساقی فاروقی نے عمدہ شاعری کے جو محاسن گنوائے ہیں ان میں کلام نہیں۔ ان مضامین کی بنیادی خوبی یہ ہے کہ یہ تنقید کے مروجہ انداز میں نہیں لکھے گئے۔ شاعری کے تکنیکی عیوب اور نقائص کے بارے میں ساقی کی نظر بصیرت افروز حد تک گہری اور معلومات افزا ہے۔ جو باتیں ساقی نے فیض اور راشد جیسے سینئر اور صاحب عہد شعرا کے فن کے بارے میں ان کے منہ پر کہہ دیں وہ ہاری ساری کے بس کا روگ نہیں۔ اصیل شاعر اگر تنقید بھی لکھے تو سونے پر سہاگے کے مترادف ہوتی ہے"

(ظفر اقبال)

فہرست

نئے منظرنامے کی بساط

(دیباچوں سے اقتباس)

سب سے پہلے تو یہ سمجھ لیجئے کہ میں بیان کی بوسیدگی اور زبان کے پرانے پن کا سخت مخالف ہوں اور تمام تجربہ کرنے والوں کے ساتھ ہوں۔ اس عمل میں ناکامی اور کامیابی دونوں کے امکانات پوشیدہ ہیں۔ افسوس کہ بیشتر نئے لکھنے والے اپنے پیش روؤں کی طرح زبان اور بیان کی یکسانیت کا شکار ہو گئے ہیں۔ پھر اس یاددہانی کی ضرورت پڑ گئی ہے کہ مروجہ ادبی اسالیب میں نہیں بلکہ فنکار کو اپنی ذات کے اسلوب میں لکھنا چاہئے کہ نئے پن کا سراغ ملے اور انفرادیت چمک سکے۔

میں نے لندن کے ایک گم نام شاعر مسٹر بخش لائلپوری کے بے حد اصرار پر (فون، خط وغیرہ) ان کا فلیپ لکھ دیا۔ وہ بھی اس لئے کہ میں نے اس قدر انکار کیا تھا کہ انکار سے بھی شرمندگی ہونے لگی تھی۔ اس عزیز نے کمال حوصلہ مندی سے اپنی کتاب میں میری تحریر شامل کر دی۔ اس کے بعد نہ وہ گم نام رہے نہ میں۔ اس عبارت کے ایک دو فقرے چشم گزار ہیں: "1936ء والوں نے اپنے اردگرد بکھرے ہوئے مسائل کے اظہار کے لئے جو عوامی پیرایہ اختیار کیا تھا اس کی یکسانیت اور بے تہی مجھے سخت ناپسند ہے، مگر میری پسند ناپسند سے ساحرلدھیانوی اور کیفی اعظمی کی پاپولرٹی پر کوئی اثر نہیں پڑا بلکہ انہی لوگوں کا لہجہ اور الفاظ مستعار لے کر 35 سال (بلکہ 40 سال) بعد بھی حبیب جالب اور احمد فراز جیسے لوگ اپنی ایک پرت کی شاعری کے بل بوتے پر مشاعرے لوٹتے نظر آتے ہیں۔ آپ سے اتنی درخواست ہے کہ اگر آپ مندرجہ بالا شاعروں کی شاعری سے شغف

رکھتے ہیں تو پھر مسٹر بخش لائلپوری کا کلام بھی پڑھئے۔" بظاہر یہ فقرہ بے ضرر تھا' میں نے دانستہ اسے ضرر رساں کر دیا تھا۔ اس کا اثر یہ ہوا کہ دونوں جہاں دیدہ عندلیب (جن پر ساٹھواں برس یا تو لگ چکا ہے یا لگ رہا ہے) سرمہ اور خضاب لگا کر آہ و زاریاں کرتے ہوئے پکڑے گئے۔ تیس تیس' چالیس چالیس سال تک جہالت کے زور پر شعر لکھنے کا سب سے بڑا نقصان یہ ہوتا ہے کہ آدمی کو "مہرباں چھوڑ آئے' داستاں چھوڑ آئے" یا "شرابوں میں ملیں' پھول کتابوں میں ملیں" جیسے فرسودہ رومانی جذبات پر قناعت کرنی پڑتی ہے۔ دوسرا یہ کہ ٹنڈو آدم اور چک لالہ کے غریب پرور اور سادہ لوح عوام کو ایذا دینے کے لئے انہیں گلقندی سیاست اور سیاسی گلقند چٹانی پڑتی ہے۔

1940ء سے 1947ء تک نیاز حیدر' وامق جونپوری جیسے لوگ اس قسم کی شاعری کر کے ادبی نسیان کا حصہ ہو گئے۔ ان کی ناکامی کا سبب یہ نہیں تھا کہ خدانخواستہ ان کی نیت خراب تھی یا عوام کے لئے خیر کے جذبات بری چیز ہیں' بلکہ یہ کہ شعری جمالیات اور شعری لسانیات کے ساتھ وہ اپنے ابھرے جذبات کی آبیاری نہ کر سکے۔ ان لوگوں کو تو معاف کرنا پھر بھی آسان ہے کہ اردو ادب میں پہلی بار اس قسم کی زبان استعمال ہوئی تھی اور ان بیچاروں کو اپنے Pitfalls کی خبر نہ تھی' مگر چالیس سال بعد بھی اسی زبان میں اسی قسم کی جگالی کرنے والوں کی طرف عبرت اور حقارت سے دیکھنے کی ضرورت ہے۔

دوسری طرف اسلامی ادب کے نعرہ بازوں نے ہماری پیاری زبان کی مقدس فضاؤں میں اپنے شکرے چھوڑ رکھے ہیں کہ وہ تازہ خیالی اور دور بینی کا شکار کر سکیں اور مولوی نعیم صدیقی جیسے جغادری جنات' روح شعر کے سر پر سوار ہو کر "عجیب سی ان کی گنگناہٹ' لطیف سی ان کی بھنبھناہٹ" لکھ لکھ کر ہمارے صبر اور غصے کو چیلنج کریں!

تیسری طرف جدیدیت کے نام پر اظہار اور ترسیل کا المیہ ہے اور ہرچند کہ افتخار جالب اور انیس ناگی جیسے لوگ ناکام ہوئے' مگر ان کی عزت میرے دل میں ہے کہ انہوں نے تجربے سے چشم پوشی نہیں کی اور اپنے قد سے بڑھ کر دراز دستی کی کوشش کی۔ میں ان کا نوحہ بھی پڑھوں گا اور انہیں سلام بھی کروں گا کہ شاعری کی نجات نہ کلاسیکی سمندر میں ڈبکیاں لگانے میں ہے نہ انیس اور دبیر کی جھیلوں میں ڈھیلا پھینکنے میں' بلکہ زبان و بیان کے نت نئے تجربات میں ہے۔ اس میں ناکامی بھی ہو گی اور کامیابی بھی' مگر شاعری شرمندہ

نہیں ہو گی۔

میں نہ سیاست کے خلاف ہوں نہ مذہب کے

اور اس بات پر یقین رکھتا ہوں کہ دونوں طرح کے لوگوں کے یہاں اچھی اور بڑی شاعری کے جراثیم موجود ہوتے ہیں اور خود ہمارے یہاں بھی اقبال اور فیض نے دونوں طرح کے امکانات پورے کر کے دکھا دیئے ہیں۔ ''مسجد قرطبہ'' ہو کہ ''دریچہ'' شعری جمالیات اور شعری لسانیات دونوں روح کے تاروں کو چھوتے ہیں۔ کھلا کہ شاعر کا مسلک چاہے کچھ ہو وہ اپنے شعر کے آہنگ' لفظوں کی نشست' بیان کی تازگی' زبان کے سفر کے علم اور اپنی ذات اور عہد کے شعور کے بغیر نہ آگے جا سکتا ہے نہ پہچانا جا سکتا ہے۔

ریڈیو' ٹی وی اور اخباری شہرت بازی سے پاکستان اور ہندوستان کے نئے' تازہ کار' مخلص اور خوش الحان شاعروں کو بددل ہونے کی ضرورت نہیں اور انھیں اظہار اور بیان کے نت نئے تجربوں کے ساتھ احساس و خیال کے ہفت رنگ آسمانوں اور زمینوں کا سفر جاری رکھنا چاہئے اور صبر سے کام لینا چاہئے کہ دس پندرہ سال شعر کہنے کے بعد نہ کوئی عظیم بن سکتا ہے نہ منفرد لہجے کا مالک ہو سکتا ہے۔ ہاں اگر اس میں جان ہوتی ہے تو وہ اپنی انفرادیت کے امکانات کی طرف اپنے عہد کے بالغ اور صاحب نظر لوگوں کی توجہ منعطف کرانے میں ضرور کامیاب ہوتا ہے۔ ادب میں تسلیم اور شناخت کا عمل ست رو ہوتا ہے (اور اس بات پر خدا کا شکر ادا کرنا چاہئے)۔

1- ضمیمہ "نابالغ شاعری"

2- نابالغ شاعری کی ایک مثال ——— وزیر آغا

عرف

شاہ دولہ کا چوہا

پلٹنا آفتاب کا

(ضمیمہ "نابالغ شاعری")

کسی مضمون نگار کی اس سے بڑی کامیابی کیا ہو سکتی ہے کہ اس کے خلاف رسالے پر رسالے نکلیں اور مہینوں نہیں بلکہ برسوں ماتم جاری رہے۔ نصرت آرا نصرت (بنت وزیر آغا) نے نام بدل بدل کر (منصور کے پردے میں ناکتخدا بول رہی ہے) اپنی شاعری کی نتھ کھلائی اور فریب کاری کی پردہ دری پر خوب بین کیا ہے۔

اگر یہ صحیح ہے کہ مضمون وصول کرنے کے بعد وزیر آغا کو اتنا صدمہ ہوا کہ وہ تین مہینے تک وزیر کوٹ سے نہ نکلے' (مشفق خواجہ) یا یہ کہ تم نے وزیر آغا کو شہر میں منہ دکھانے کے قابل نہیں چھوڑا' (منیر الدین احمد) تو اس کا قلق مجھے بھی ہے کہ میں بھی ان کا معزز دوست رہ چکا ہوں۔ تو کیا آدمی تعلقات پر 'اپنی سی' معمولی سوجھ بوجھ والی سچائی کو قربان کردے؟ اسی باعث اپنے ادب کا وہ حال ہے جو سامنے ہے۔

میں نے اس بات پر عجب فاتحانہ مسرت محسوس کی کہ وزیر آغا' جن کی جاہلانہ شاعری کا بھانڈا میں نے چوراہے کے بیچ پھوڑ دیا ہے' کبھی میری شراب نوشی کی آڑ لیتے ہیں' کبھی میری 'امارت' پر لاف و گزاف کرتے ہیں اور کبھی اس دڑبے میں چھپنے کی حرکت کرتے ہیں کہ ساقی صاحب نے صرف اوزان و بیان و زبان کی غلطیاں نکالی ہیں۔ مگر میں چھپنے نہیں دوں گا کہ میں نے زبان و بیان کی بیوگی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اپنے ہر فقرے میں شعری جمالیات کے کسی نہ کسی گوشے سے اور جدید لسانیات کے کسی نہ کسی زاویے سے بحث کی ہے اور یہ ثابت کیا ہے کہ تجربہ' مشاہدہ اور مطالعہ کے فقدان کے

باعث وہ ایک نہایت حقیر شاعر ہیں۔

اس مضمون کے چھپنے کے بعد طرح طرح کے لوگوں نے رائی زنی کی ہے۔ ایک طرف تو نصرت آرا نصرت کی سیکڑوں سہیلیاں ہیں جو اپنی نائیکا کا دیا کھاتی ہیں اور ہر ربیع و خریف پر پارسل وصول کرتی ہیں (ساقی فاروقی کا مضمون ناشائستہ تنقید کی ایک مثال ہے اور اس کی جتنی مذمت کی جائے کم ہے ——— انور سدید) دوسری طرف اللہ کے وہ نیک بندے ہیں جو دوستی پر ادبی سچائی کو قربان کرنے میں شرم محسوس نہیں کرتے (اگر مجھے اپنے طالب علموں کو لیکچر تنقید کے بارے میں پڑھانا پڑے تو میں بلا تردد اس مضمون کی مثال دے سکتا ہوں ——— پرویز پروازی) تیسری طرف کچھ صاف گو ہنر مند شاعروں کی پزیرائی ہے (ساقی فاروقی نے وزیر آغا کی شاعری کا محاکمہ بڑی گہرائی سے کیا ہے۔ ان کا یہ مقالہ دراصل مبتدی اور نئے شعر کہنے والوں کے لئے ہدایت کا کام کرتا ہے۔ انہوں نے اسی طرح رموز و نکات سمجھائے ہیں جس طرح آج سے ذرا اس طرف کے زمانے میں استاد فن اپنے شاگردوں کے ذہن اور ذوق کی پرداخت کرتے تھے۔ ان کا مضمون ہدایت نامہ شاعر ہے ——— کرشن کمار طور) یا میں اس مضمون کو شاعری کی بائبل سمجھتا ہوں ---- ایسا خوبصورت مضمون ہر شاعر کو لازمی مضمون کی حیثیت سے پڑھنا چاہئے ——— یامین) اور چوتھی طرف وہ ہم عصر ہیں جن کی بصارت اور بصیرت کا مدت سے قائل ہوں (خدا کے لئے مضمون سے ذیلی عنوان "شاہ دولہ کا چوہا" نکال دیجئے ——— احمد ندیم قاسمی) (اگر تم شروع کے ذاتی صفحات نکال دو تو یہ ایک نہایت اعلیٰ علمی اور ادبی مضمون ہے ——— مشفق خواجہ) (تم نے ایک مچھر کو توپ سے مار دیا ہے ——— شمس الرحمٰن فاروقی) (ایسے مضمون کی اردو کو سخت ضرورت تھی ——— حمایت علی شاعر) (نئے شعرا ہی نہیں، ہم لوگ بھی اس مضمون سے بہت کچھ سیکھیں گے ——— زبیر رضوی) (آخری صفحات میں وزیر آغا کی تعریف کر کے ساقی نے ایک نہایت عمدہ مضمون کو داغدار کر دیا ——— مظفر علی سید) (نہایت خوبصورت مضمون ہے مگر آخر میں تم نے وزیر آغا کی ایک نظم کی نہایت واہیات تعریف کر دی ہے۔ بعض اوقات 'Balancing' کا اثر الٹا ہوتا ہے ——— ضیا جالندھری) (وزیر آغا اس مضمون کا جواب کیا دے گا، اس کا جواب ہو ہی نہیں سکتا ——— اعجاز بٹالوی)

میں نے قاسمی صاحب کے کہنے پر مضمون سے ذیلی عنوان نکال دیا تھا مگر اس عرصے میں وزیر آغا نے اتنی گریہ وزاری کی ہے کہ یہ عنوان دوبارہ بحال کر دیا ہے۔ قاسمی صاحب صدق دل سے معاف کر دیں۔ مگر بقیہ آرا کی روشنی میں 'کہ ہٹ دھرم نہیں ہوں' میں نے شکنجہ اور کھینچ دیا ہے اور پھانسی کے پھندے کو مزید کس دیا ہے۔ غرض کہ ذوق نغمہ کی کمیابی کے سبب اپنا لہجہ تلخ تر کر دیا ہے۔ اب یوں ہے کہ وزیر آغا کی شاعری پر میری رائے حتمی ہے اور محاکمہ مکمل۔ میں آپ کے اور مضمون کے درمیان زیادہ دیر تک حائل رہنا نہیں چاہتا۔ لیجئے مضمون' ترمیم و اضافے کے بعد' حاضر ہے۔

ساقی فاروقی

15 دسمبر 1994ء

مکرر آنکہ : ایک جگہ میرے افعی (ہ) دوست وزیر آغا نے اپنے زمرد جیسے میزبان پر بھی ٹھٹا فرمایا ہے کہ جب وہ میرے مہمان ہوئے تو میں نے انھیں نظر انداز کیا اور "اپنا زیادہ تر وقت اپنے کتے کے ساتھ کھیلنے اور اس کے لاڈ اٹھانے میں گزارا" اس بہتان کا جواب یہ ہے کہ "ایک کو مدعو کیا تھا' دوسرے کے ساتھ کھیلتا رہا"

ہ ایک قسم کا سانپ جو زمرد دیکھ کر اندھا ہو جاتا ہے۔

ساقی فاروقی

30 دسمبر 1994ء

نابالغ شاعری کی ایک مثال ——— وزیر آغا

عرف

شاہ دولہ کا چوہا

میرے پیارے بھائی اور دوست وزیر آغا!

آپ کی کلیات (چہک اٹھی لفظوں کی چھاگل) میں نے نہایت لجاجت سے منگوائی تھی اور آپ نے نہایت محبت سے بھیجی تھی۔ میں تو کتاب کا نام پڑھتے ہی "انٹا غفیل" ہو گیا تھا کہ شرفا ایسے نام اپنی کتابوں کو نہیں دیتے۔

کیا آپ اپنی بیٹی کو "چہک" یا "چھاگل" جیسے منحوس نام سے پکار سکتے ہیں ——— خیال اغلب ہے کہ انور سدید اور مشفق خواجہ اور عاشق حسین ہرگانوی (سردھنوی) نے انتقاماً یہ صم" بکم" نام تجویز کیا ہو گا۔ مگر آپ کی بے رس' بے تہہ' بکواس اور احمقانہ غزلیں پڑھ کر اندازہ ہوا کہ یہ نام سوچ سمجھ کر رکھوایا گیا ہے۔ حق تو یہ ہے کہ یہ مردوے اتنے کند ذہن بھی نہیں۔

اب اس اجمال کی تفصیل سنئے:-

(فی الحال میں صرف غزل پر بات کر رہا ہوں۔ نظم پر گفتگو مضمون کے آخری حصے میں ہو گی)

سب سے پہلے تو اپنی زبان دیکھئے! 1965ء سے اس میں لکنت پیدا ہوئی تو 1990ء تک (کتاب میں یہیں تک کی غزلیں شامل ہیں) جاری رہی۔ بلکہ لڑکھڑاہٹ بڑھتی گئی۔ اس لئے نہیں کہ۔

بات ادھوری مگر اثر دونا
اچھی لکنت زبان میں آئی
(یگانہ)

بلکہ اس لئے کہ آپ سیکڑوں الفاظ کے تہہ در تہہ معنوی پیکروں سے واقف ہی نہیں (ادھر آپ نے مصرعہ لکھا ادھر مولانا صلاح الدین احمد کی روح قبر میں تڑپی) آپ معنی کی ایک پرت سے (وہ بھی سوتیلے پن کے ساتھ) واقف ضرور ہیں مگر لفظ کے حسیاتی اور جمالیاتی، یعنی حسی اور جمالی زاویوں سے قطعی نابلد ہیں ورنہ ایسے مصرعے یا شعر قطعی نہ کہتے:

1- میں ایک ڈولتا ساگر مجھے اٹھاتا کون

(کبھی آپ نے ڈول کے دیکھا ہے۔ اگر ڈولے ہوتے تو ساگر کو نہ ڈلواتے۔ پھر یگانہ کی غزل پر غزل، ڈوب مرنے کا مقام ہے)

2- اندھی خنک ہواؤں کے اب کام آئیں گے

(اندھی، کیوں؟ 'بہری' کیوں نہیں اور ہاں 'گونگی' نے کیا قصور کیا ہے۔ پھر 'خنک' کس لئے 'گرم' کیوں نہیں 'تیز' میں کیا قباحت تھی۔ 'نرم' کیسا رہے گا۔ مجھے لگا کہ جو پہلا لفظ سر راہے آپ کو مل جاتا ہے اسے مصرعے کی بندوق میں ڈال کے دھڑسے داغ دیتے ہیں۔ جستجو عنقا ہے۔ پڑھنے سننے والے زخمی ہو کر کراہتے رہ جاتے ہیں۔ اگر اسم صفت سے نہ خیال کو ایڑ لگے نہ احساس پر چابک برسے تو اس کی آخر کیا ضرورت ہے)

3- کی عطا ہر گل کو اک رنگیں قبا + بوئے گل کو شہر میں رسوا کیا

(پھر وہی کام چوری پھر وہی مفلوک الحال اسم صفت "رنگیں"۔ فرض کیجئے کہ قبا رنگین نہیں ہے کہ آپ نے خود ہی کہیں فیض کی چوری کرتے ہوئے لکھا ہے، 'آنسو' ستارے اوس کے دانے' سفید پھول + سب میرے غم گسار سر شام آئیں گے۔ (۔) یعنی یہ کہ آپ اس بات سے آگاہ ہیں کہ پھول سفید بھی ہوتے ہیں۔ چاہے قبا سفید ہو یا رنگ دار یا بے رنگ' بوئے گل کو تو رسوا ہونا ہے۔ پھر 'شہر' کی تک سمجھ میں نہیں آئی۔ 'چمن' بھی ہو سکتا تھا۔ 'جنگل' میں کیا دقت تھی۔

اوہو! وزن کا مسئلہ ہو گا۔ تو یہ مسئلہ تو جان کے ساتھ لگا رہے گا۔ اردو میں ایک لفظ ہے "تلاش" اس کے معنی ہیں ---- رکئے ذرا میں 'نور اللغات' اور 'فرہنگ آصفیہ' دیکھ لوں ----- ہاں تو اس کے معنی نکلے جستجو' سعی اور تحقیق وغیرہ --- آپ کے پچاسوں اشعار دیکھ کر کھلا کہ آنسہ 'تلاش' سے آپ کی ملاقات ہی نہیں ہوئی حالانکہ وہ عزیزہ گیروے کپڑوں میں' منہ پر راکھ ملے' آپ کے یار بلدیو مرزا کی طرح' برسوں سے وزیر کوٹ اور سرگودھا میں' آپ کے تعاقب میں ہلکان ہو رہی ہے۔ مندرجہ شعر عامیانہ ہی سہی مگر اپنے مالک حقیقی سے آپ کی شکایت درست ضرور ہے)

-4 زمیں پر صورتیں ہی صورتیں ہیں
فلک پر آنسوؤں کا سلسلہ ہے

(یہ شعر بھی بیشتر اشعار کی طرح معمولی ہے کہ زمین کی صورتوں کا فلک کے ستاروں سے کوئی علاقہ نہیں۔ شاید قہقہے ہی قہقہے زمین پر ہوتے تو فلک کے آنسوؤں سے ایک طرح کا ربط قائم ہوتا۔ پھر اگر "فلک پر قہقہے" ہوتے تو "زمین پر آنسوؤں" سے بہتر ربط قائم ہوتا۔ شعر معنی دار بھی ہو جاتا۔ آپ کا سب سے بڑا سقم یہ ہے کہ بیان (Statement) دیتے چلے جاتے ہیں اور بھول جاتے ہیں کہ شاعری "بیان کرنے" کا نام ہے' "بیان دینے" کا بالکل نہیں' ورنہ وہ تقریر بن جاتی ہے)

-5 بہت روکا اسے پر نہ رکا وہ
کبھی جھونکا ہوا کا بھی رکا ہے

(ظاہر ہے "نہ" سے ناآشنائی کے باعث مصرعہ بے وزن ہو گیا ہے کہ اس کا وزن "کہ" کی طرح ہے "کہہ" کی طرح نہیں' ف نہ کہ فع۔ "نا" ہوتا تو وزن قائم ہو جاتا)

-6 ہر ایک پیڑ ہے منقار زیر پر اب تو
وہ شام کیا ہوئی جب ہر شجر چہکتا تھا

("منقار زیر پر" کا کتنا واہیات استعمال ہے۔ میں نے اور بہت سی جگہوں پر

بھی دیکھا ہے کہ آپ ٹھیٹھ (ٹھیٹ) ہندی بولتے بولتے ہیبت ناک فارسی اور عربی بولنے لگتے ہیں اور لفظوں سے ناجائز تعلقات قائم کر لیتے ہیں۔ اور آپ کے aesthetic sense کی تو کیا good sense کی بھی قلعی کھل جاتی ہے)

7- رات بھر نفرتوں کی شال بنیں
صبح دم ہر کسی سے پیار کریں

("ہر کسی" کی جگہ "دشمنوں" ہوتا تو شعر کیسا چمک جاتا۔ معنی میں تھوڑا سا تغیر ضرور ہوتا مگر یہ قربانی بہتر معنی کے لئے ہوتی۔ پھر لفظ "دشمنوں" کے نغمے سے مصرعے کا سپاٹ پن ختم ہو جاتا۔ آہ، ہزاروں بلکہ لاکھوں خواہشیں ایسی ---)

8- رات بھر کہکشاں کی مالا میں
دانہ دانہ تجھے شمار کریں

("مالا" نے مصرعے کا ستیاناس کر دیا ہے اور شعر کے فارسی آہنگ کو مجروح کر دیا ہے۔ اگر آپ جان بوجھ کے یہ اپج دکھاتے تو میں پہلا آدمی ہوتا جو آپ کو سلوٹ کرتا۔ مگر مصرعے کی کس مپرسی بتا رہی ہے کہ آپ نے جھک ماری ہے)

9- اک جوئے بے قرار ہو کیوں دلکشی تری
کیوں اتنی تشنہ لب مری آنکھوں کی پیاس ہو

(اس شعر میں آپ نے وہ حرکت کی جو 'اوراق' میں چھپنے والے نئے لڑکے لڑکیاں بھی نہیں کرتے۔ کہنا آپ صرف 'تشنہ' چاہتے ہیں مگر "تشنہ لب" چونکہ بکاؤ مال ہے اس لئے 'آؤ دیکھا نہ تاؤ' اور بھاؤ تو آپ پوچھتے ہی نہیں، آپ نے بھی جھٹ سے خرید لیا۔ اب ذرا دوسرے مصرعے کو نثرا کے دیکھئے۔ یعنی آنکھوں کی پیاس کتنی پیاسی ہے۔ مراد آپ کی یہ تھی کہ آنکھیں کتنی پیاسی ہیں۔ یا آنکھوں میں اتنی پیاس کیوں ہے اور کہہ کچھ اور دیا۔ اور رسالے میں تعریفی خطوط چھپوا کر بغلیں بجوالیں)

10- زرد رو ایک ہی پل میں ہوئی مدھ ماتی شام
لال ہونے بھی نہ پائے تھے ابھی گال اس کے

(نہیں، میرے بھائی نہیں، میرے دوست نہیں، مصرعے یا شعر کی غرابت تو

جانے دیجئے کہ یہ بات تو طشت ازبام ہوئی کہ آپ قدرت کلام کے نازیبا نام سے ناواقف ہیں۔ غزل کے باب میں، نہایت تغر سے آپ نے اپنی کتاب ''اردو شاعری کا مزاج'' میں جو احکامات ''غزل کے تینوں اہم موضوعات یعنی آزادہ روی کا رجحان، تصوف اور عشق'' جاری کئے ہیں، ان میں سے کس 'موضوع' کو پکڑنے کی آپ نے کوشش کی ہے۔ کامیابی یا ناکامی تو نصیبوں سے ہے مگر کم سے کم کوشش تو کر کے دیکھتے۔ کہیں یہ تو نہیں کہ کوشش آپ سے بھی زیادہ کم تر لوگوں کا نصیبہ ہے۔ یہ آپ کا مقام نہیں)

-11 کرتے ہو انتظار عبث اتنا جان لو
لوٹے گا اب تو شام ہی کو صبح کا گیا

(لاحول ولا قوۃ ——— کیا آدمی اس کی داد دے کہ آپ نے ایک محاورے کو نہایت پھوہڑپن سے باندھ دیا ہے ——— اور اگر اس کی داد نہ دے تو اور کس چیز کی داد دے، آپ ہی بتایئے)

-12 خزاں اک غم زدہ بیمار عورت
ہوا نے چھین لی جس کی ردا ہے

(دوسرے مصرعے کا سفلہ پن تف ہے۔ آپ اپنے مبتدیانہ کلام سے کس قسم کے شعر کے مزاج کی ترویج فرما رہے ہیں)

-13 ساگر میں نہیں تھی موج اک بھی

(اگر شعری جمالیات یا زبان سے ذرا سا بھی شغف ہوتا تو ''اک بھی'' آسانی سے ''کوئی'' میں بدل سکتا تھا)

-14 دیکھا تو نظر تھی اس کی جل تھل
مشکیزہ ابر پھٹ رہا تھا

(خرقہ خیال بھی پھٹ سکتا تھا۔ جامۂ جمال بھی۔ توبہ توبہ۔ ذہن میں کیسے کیسے مبتذل خیالات آ رہے ہیں۔ ''پھٹنا'' غیر شاعرانہ حروف کا مجموعہ نہیں۔ میں تو اس پر ایمان رکھتا ہوں کہ کوئی لفظ بھی ایسا شجر ممنوعہ نہیں جس کے پھلوں کا ذائقہ لکھنے والا نہ چکھے۔ ہاں لفظ کو برتنے کا سلیقہ آنا چاہئے۔ یاد ہے آپ کے اور میرے درمیان ایک شاعر

ہوا کرتا تھا۔ جس پر آپ نے اور میں نے، ہم دونوں نے، دو دو مضامین لکھے، سیالکوٹ کا رہنے والا تھا اور فیض تخلص کیا کرتا تھا۔ اس نے بھی پھٹنا لکھا ہے:

ع یہ حسیں کھیت پھٹا پڑتا ہے جوبن جن کا

اور کیسا لکھا ہے کہ اس لفظ کے آس پاس کے لفظوں کو ریشم کے پھموں میں مقید کر دیا ہے اور مصرعے کے پاؤں کے نیچے مخمل کی چادر بچھا دی ہے۔ خیر فیض کے کامیاب، یہاں کامیاب پر زور ہے، مصرعوں اور شعروں اور غزلوں اور نظموں میں احساس جمال تو ایسا ہے کہ اچھے اچھوں کو سر بسجود ہو جانا چاہئے۔ فیض صاحب، ہرچند کہ میں آپ سے عاجزی نہ سیکھ سکا مگر:

ع آج تم یاد بے حساب آئے ——Cheers——)

15- تم آ گئے تو یہ اچھا ہوا وگرنہ یہاں
شریک ہونے کو اس کی صدا میں تھے ہم بھی

(کس کی صدا میں حضرت اسی لئے کہتے ہیں کہ جب کہنے کو کچھ نہ ہو تو خاموشی عیوب کی پردہ پوش ہوتی ہے)

16- ناؤ پلٹ تو آئے مسافر اتار کے

(مصرعہ گوارا ہوتا تو میں بھی آپ ہی کی طرح کھینچ تان کے ''ناؤ'' میں پتوار لگ لے، اس لفظ کو ''فعلن'' کر لیتا۔ ورنہ یہ بات تو آپ سے بھی ڈھکی چھپی نہ ہو گی کہ ''ناؤ'' ''فعل'' کے وزن پر ہے)

17- اس راہ سے ضرور گزر کر گیا ہے وہ
کانٹے لہو میں تر ہیں اگر خار زار کے

(میں نے مرزا محمد تقی ہوس کو بڑی حسرت سے یاد کیا

ے تیز رکھیو سر ہر خار کو اے دشت جنوں
شاید آ جائے کوئی آبلہ پا میرے بعد

(آبلہ پا سرگودھے سے اٹھا ضرور مگر شعر کے تیور بتا رہے ہیں کہ وہ پورے خار زار سے ٹوٹی ہوئی چپل پہن کر گزر گیا۔)

18- جا بھی چکے تھے اور رکے بھی کھڑے تھے ہم
اپنے سے دور جا کے بھی ہم اپنے پاس تھے
(پہلے مصرعے کی یتیمی نوحہ کناں کہ
ع ہمارے بھی اک روز ماں باپ تھے
مگر مصرعے میں تو آپنے تصوف پر بھی ہاتھ صاف کر ہی دیا۔ قدما کے کتنے لاکھ اشعار یاد دلواؤں۔ اور سب اس سے بہتر۔ کلیشے پہ کلیشے' ارے ٹوٹ گئے شیشے' یعنی کٹورے پہ کٹورا' بیٹا باپ سے بھی گورا۔ سیلی بوجھ پہیلی۔)

19- ہم تو ترے غلام تھے ہم تیرے داس تھے
(آپ نے اپنے غزل والے مضمون میں نہایت دقت نظری سے یہ ثابت کیا ہے کہ "محبت" اور "عشق" میں "عشق" وسیع ہے۔ یہ بات پڑھ کر ابھی میں آپ کی دوربینی کی داد دے ہی رہا تھا کہ "غلام" اور "داس" سے ملاقات ہو گئی۔ جہاں تک "غلام" کا تعلق ہے' اردو زبان میں ایک بھاری پن کے ساتھ زنجیروں اور زندانوں سمیت آتا ہے' "داس" میں خادم ہونے اور چاکر بننے کا ہلکاپن ہے اور یہ لفظ زیادہ سے زیادہ دارابی ہے یعنی وہ رسی جس سے توپ یا کسی بھاری اسلحے کو کھینچتے ہیں۔ اگر آپ "داس" پہلے لکھتے تو بعد میں "غلام" کا جواز تھا ورنہ نہیں۔ پھر پہلے "ہم" کے بعد آپ نے "تو" لکھ کر پہلے "ہم" پر بالکل صحیح زور دیا ہے یہی کرشمہ دوسرے "ہم" کے ساتھ بھی دکھانا چاہتے تھے۔ مگر 'کاٹا اور لے دوڑے' کی وجہ سے آپ نے پھر سہو اختیار کیا۔ جب آپ اپنی پشاوری ٹوپی پہن کر' بر منکھی چھڑی گھماتے ہوئے سیر کو نکلیں تو میری بات پر ذرا غور کیجئے گا کہ 'ہم تو تیرے غلام تھے ہم تو تیرے داس تھے' ہی واجب ہے۔ یعنی "تو" دوبار۔ یعنی بات یہی صحیح ہے' مصرعے کو وزن میں لانا آپ کا کام ہے)

20- ہر چند ہم زمیں پہ بچھی سبز گھاس تھے
(گویا گھاس آسمان پر بھی بچھی ہوتی ہے۔ آپ تو گھاس کھا گئے ہیں۔ ورنہ آپ کہنا یہ چاہتے ہیں کہ "ہم گھاس تھے"۔ خیر۔ وہ تو آپ ہیں)

21- ہم طلب کرتے تو الفاظ کی ٹھنڈی مہکار
آسمانوں سے اتر کر بخدا آ جاتی

(اچھا تو الفاظ کی ٹھنڈی مکار آسمانوں پر رہتی ہے۔ بہت خوب۔ تو ذرا یہ بھی بتاتے چلئے کہ کمبخت وہاں کیا کرتی ہے۔ پھر آپنے اسے طلب کیوں نہیں کیا جب کہ جلال کا یہ عالم ہے کہ خدا کی قسم کھا رہے ہیں۔ ہر قسم کی اوٹ پٹانگ چیز آپ نظم کر دیتے ہیں۔ بس معنی کا پرندہ پھڑپھڑاتا رہتا ہے)

-22 رات دن بھٹکتا تھا تنگ بند گلیوں میں
اس ہراساں شہر میں وہ نڈر ہی ایسا تھا

(سنا ہے آپ "اوراق" کے لئے آنے والی غزلوں کی، یعنی وہ غزلیں جو نوجوان شاعر شاعرات آپ کو بھیجتے ہیں، اصلاح گاہے گاہے کرتے ہیں۔ وہ بدنصیب آپ کے بے وزن مصرعوں کے بارے میں کیا سوچتے ہوں گے۔ ظاہر ہے 'فاعلن مفاعلن' فاعلن مفاعلن' والی اس غزل میں آپ کا دوسرا مصرعہ، "ہراساں" کی وجہ سے بے وزن ہے۔ "ہراس" یا "فعول" کے وزن کا کوئی لفظ ہوتا تو وزن ٹھیک ہو جاتا۔ اپنے معاصر شمس الرحمٰن فاروقی سے ہی پوچھ لیا کیجئے کہ استاد فن ہے حالانکہ گاہے گاہے خود بھی بے وزن مصرعے لکھتا رہتا ہے اور برے برے اشعار کہتا پھرتا ہے)

-23 ایسا بھی کیا کہ تیرے لئے مر مٹوں گا میں
مت یہ سمجھ کہ آپ میں اپنا غنیم ہوں

(غالباً زبان آتی تو آپ شاید یوں کہتے کہ 'یہ مت سمجھ کہ آپ میں اپنا غنیم ہوں۔ لیکن یا چونکہ غزل کے چوتھے مصرعے میں، "کاتب بدل گئے تھے مگر میں قدیم ہوں"، کاتب بدل گئے اس لئے انہوں نے اپنے مدیر کے ساتھ من مانی کی)

-24 اس موجہ' لباس کی خوشبو سے سارا شہر
گل ریز ہو کے اور بھی گنجان ہو گیا

(بات تیری کی۔ یار یہ موجہ' خوشبو تو سمجھ میں آتا ہے مگر موجہ' لباس کیا بلا ہے۔ پھر گل ریزی اور گنجانی میں کیا نسبت ہے۔ جب میں اقلیم سخن میں داخل ہوا تھا تو کراچی میں مولانا چراغ حسن حسرت کے اس فقرے کی بڑی دھوم تھی 'دن بھر غلط سلط اردو سنتے سنتے اور بولتے بولتے جب زبان خراب ہو جاتی ہے تو رات میں آب حیات کے دو صفحے پڑھ لیتا ہوں' آپ کو بھی یہی مشورہ ہے کہ اس 'پنجابی بچے' پر میں سارے لکھنؤ کو قربان

کرنے پر تیار ہوں۔ بخال ہندوش بخشم سمرقند و بخارا را۔ حضرت' میں نے تو پنجابیوں سے ہی اردو سیکھی۔ کیا ظفر علی خاں' کیا پطرس' کیا صلاح الدین احمد کیا عبدالمجید سالک' کیا راشد کیا بیدی۔ نام گنوانے کا یہ موقع نہیں۔ ان لوگوں کو اگر آپ نے سرسری نہ پڑھا ہوتا تو ظاہر ہے' گل ریز ہو کے اور بھی گنجان نہ ہو جاتے۔)

-25 در پردہ سیل تند تھی وہ نظر التفات
میں اس نظر پر اور بھی قربان ہو گیا

(شعر تو خیر سارے کے سارے ہی لچر ہیں اس لئے یہ بات بار بار دہرا کے آپ کا اور اپنا وقت ضایع نہیں کروں گا۔ دوسرے مصرعے میں "نظر" سیدھی پڑ رہی ہے مگر پہلے مصرعے میں ترچھی۔ ترچھی اور وزن سے خارج۔ پہلے مصرعے میں آپ نے نذر محمد راشد کو ملحوظ نظر رکھا ہے اور دوسرے مصرعے میں خوشی محمد ناظر کو۔)

-26 تم اگر کہتے ہو ہر رشتے کی اک میعاد ہے

(اس مصرعے میں "ہو" اور "ہر" کو چولی دامن کی طرح ساتھ کر کے صوتیات کے پیٹ میں چھری گھونپ دی ہے ـــــ ہا ہا ـــــ ہے ہے ـــــ ہو ہو۔)

-27 ناواقف خوں گشتہ سحر میں بھی نہیں ہوں
انجان مگر تو بھی مری جان نہیں ہے

(ابھی اس شعر کی نثر کر کے دیکھتا ہوں' ذرا وسکی کا ساتواں جام تو بنا لوں' بس پینے کا جو رکارڈ ڈلن تھامس نے بنایا ہے' توڑنے ہی والا ہوں' تاکہ نشہ چڑھے تو آنکھوں سے رہی سہی مروت بھی جاتی رہے اور آنکھوں میں احمد فراز کا بال آ جائے ـــ تو شعر کی نثر بنی کہ اے میری جان خوں گشتہ سحر سے نہ تو ناواقف ہے۔ نہ میں۔ So what میرے ہم دم دیرینہ So what- اس بیان سے نہ احساس کا بال بیکا ہوا نہ خیال کا اور زبان تو خیر دیر سے ماتم میں ہے)

-28 میں بن گیا گہر تو مرا اس میں دوش کیا
بے وجہ مجھ کو خاک میں تم رولنے لگے

(لفظوں سے محبت ہوتی تو آپ 'اس میں دوش کیا' کی جگہ 'اس میں کیا قصور' لکھتے کہ گہر' بے وجہ' خاک جیسے الفاظ اس کے متقاضی تھے۔ مگر اس سے الگ' آیئے کان میں

ایک بات کہوں۔ پریشان ہونے کی کوئی خاص ضرورت نہیں' آپ گھر دو ہر کچھ نہیں بنے)

29- کہ تجھ سے شکوے ہزاروں تھے عمر بھر کے مجھے

(یا تو کہئے کہ تجھ سے ہزاروں شکوے تھے' یا کہئے کہ تجھ سے عمر بھر کے شکوے تھے۔ یہ دونوں چیزیں ایک ساتھ نہیں چل سکتیں یا کہئے کہ شکوے تو تجھ سے عمر بھر ملیں ہزاروں تھے)

30- سلا دیا جرس ناتہ سحر نے اسے
"جگا کے چھوڑ گئے قافلے سحر کے مجھے"

(اچھی گرہ لگائی ہے۔ ظاہر ہے دوسرا مصرعہ بہتر ہے کہ ناصر کا ہے۔ سنئے' دوسروں کے اچھے اچھے مصرعے اور شعر دیکھ کر کیا آپ کے دل میں کبھی یہ ہوک نہیں اٹھتی کہ "کاش میں بھی کسی دن کوئی اچھا مصرعہ یا شعر کہوں" آخر آپ ہی کے قرب و جوار کے لوگوں نے اس طرح کے شعر لکھے ہیں نا' صرف حافظے پر زور دے کر لکھ رہا ہوں کہ شراب نوشی اور غریب الوطنی کے باوجود' ہزاروں نہیں تو سیکڑوں اشعار اپنی کسی نہ کسی ہنر مندی —— نغمے کی لے' معنی' زور بیان' ایچ' زبان کے داؤ پیچ' تازگی وغیرہ —— کے باعث آج بھی یاد ہیں۔ ملاحظہ ہوں:

(الف) ایک مدت سے تری یاد بھی آئی نہ ہمیں
اور ہم بھول گئے ہوں تجھے ایسا بھی نہیں (فراق)

(ب) آنکھ نیچی ہوئی ارے یہ کیا
کیوں غرض درمیان میں آئی (یگانہ)

(ج) اپنے دیوانے پر اتمام کرم کر یا رب
در و دیوار دیئے اب انھیں ویرانی دے (فانی)

(د) کبھی کبھی تو اسی ایک مشت خاک کے گرد
طواف کرتے ہوئے' ہفت آسماں گزرے (جگر)

(ہ) خرمن گل سے لپٹ کر وہیں مر جانا تھا
اب کرے کیوں گلہ تنگی داماں کوئی (اصغر)

(و) حسن بے پروا کو خود بین و خود آرا کر دیا
کیا کیا میں نے کہ اظہار تمنا کر دیا (حسرت)

(ز) ہاتھ سے کس نے ساغر پٹکا موسم کی بے کیفی پر
اتنا برسا ٹوٹ کے بادل ڈوب چلا میخانہ بھی (آرزو)

(ح) افسوس بے شمار سخن ہائے گفتنی
خوف فساد خلق سے ناگفتہ رہ گئے (آزاد انصاری)

(ط) بے نیازانہ برابر سے گزرنے والے
تیز کچھ قلب کی رفتار ہوئی تھی کہ نہیں (عندلیب)

(ی) ہم ہی میں تھی نہ کوئی بات یاد تمہیں نہ آ سکے
تم نے ہمیں بھلا دیا ہم نہ تمہیں بھلا سکے (حفیظ جالندھری)

(ک) تمام عمر ترا انتظار ہم نے کیا —'
اس انتظار میں کس کس سے پیار ہم نے کیا (حفیظ ہوشیارپوری)

(ل) ہے غارت چمن میں یقیناً کسی کا ہاتھ —'
شاخوں پہ انگلیوں کے نشاں دیکھتا ہوں میں (سیماب)

(م) داور حشر مرا نامۂ اعمال نہ دیکھ —'
اس میں کچھ پردہ نشینوں کے بھی نام آتے ہیں (تاثیر)

(ن) امید تو بندھ جاتی' تسکین تو ہو جاتی
وعدہ نہ وفا کرتے' وعدہ تو کیا ہوتا (چراغ حسن حسرت)

(س) سب کا تو مداوا کر ڈالا اپنا ہی مداوا کر نہ سکے
سب کے تو گریباں سی ڈالے اپنا ہی گریباں بھول گئے (مجاز)

(ع) کیسے دن تھے کیسی راتیں کیسی باتیں گھاتیں تھیں
من بالک ہے پہلے پیار کا سندر سپنا بھول گیا (میرا جی)

(ف) وہ پھول ہوں جو کھلا ہو خزاں کے موسم میں
تمام عمر مجھے حسرت بہار رہی (اختر شیرانی)

(ص) در قفس پہ اندھیرے کی مہر لگتی ہے
تو فیض دل میں ستارے اترنے لگتے (چلو اپنے فیض صاحب ہیں)
(ق) ملتی ہی نہیں ہیں جو نگاہیں
صدیوں بہم آشنا رہی ہیں (عبدالمجید سالک)
(ر) ہاتھ زخمی ہیں تو پلکوں سے گل منظر اٹھا ---'
پھول تیرے ہیں نہ میرے باغ کس کا ہے نہ پوچھ (ناصر کاظمی)
(ش) آواز دے کے دیکھ لو شاید وہ مل ہی جائے
ورنہ یہ عمر بھر کا سفر رائگاں تو ہے ---' (منیر نیازی)
(خ) تجھے میں اپنی محبت سے ہٹ کے دیکھ سکوں
یہاں تک آنے میں مجھ کو کئی زمانے لگے (سلیم احمد)
(ذ) کس کس کو بتائیں گے جدائی کا سبب ہم
تو مجھ سے خفا ہے تو زمانے کے لئے آ ---'
(فراز - اس عزیز نے بھی ایک اچھا شعر کہہ رکھا ہے)
(ض) رات کی کوکھ سے پھوٹا ہے اک سوتا نرم خیالوں کا
دن ہوتے ہوتے یہ کس کس دھارے سے مل جائے گا (عالی)
(ظ) جانے کیا سوچ کے تم نے مرا دل پھیر دیا
میرے پیارے' اسی مٹی میں' مرا سونا تھا (خلیل الرحمٰن اعظمی)
(غ، نمبر1) دیکھ زنداں سے پرے' رنگ چمن' جوش بہار
رقص کرنا ہے تو پھر پاؤں کی زنجیر نہ دیکھ (مجروح)
(غ، نمبر2) تو اتنا قریب ہے کہ تجھ سے ---'
میں پوچھ رہا ہوں تو کہاں ہے
(ندیم - اور یہ آپ کو دق کرنے کے لئے نہیں لکھا)

لیجئے حروف تہجی تو ختم ہوئے۔ مگر آج اتنی چڑھ گئی ہے کہ کچھ اور شاعروں کو بھی خوش کرنے کو جی چاہ رہا ہے اس لئے عربی والے ابجد ہوز حطی کلمن سعفص قرشت ثخذ اور ضظغ پھر سے شروع کر رہا ہوں تاکہ آنے والے ایسے ہی شعروں کی چھاؤں میں اپنے

سفر کا آغاز کریں۔ گفتگو صرف غزل سے ہے۔

(الف) دشت سیراب ہوئے میرے لہو کے نم سے
موج در موج سمندر کا سفر ہے مجھ میں (ظفر اقبال)

(ب) ہم روح سفر ہیں، ہمیں ناموں سے نہ پہچان
کل اور کسی نام سے آ جائیں گے ہم لوگ (رضی اختر شوق)

(ج) ہمیں خبر ہے کہ ہم ہیں چراغ آخر شب
ہمارے بعد اندھیرا نہیں اجالا ہے (ظہیر کاشمیری)

(د) اب بھی دیواروں سے خوشبوئے نفس آتی ہے
ہائے زنداں میں بھی کیا لوگ تھے ہم سے پہلے (حسن عابدی)

(ہ) وابستہ میری یاد سے کچھ تلخیاں بھی تھیں
اچھا کیا کہ تم نے فراموش کر دیا ---' (م۔ حسن لطیفی)

(و) یاد ماضی عذاب ہے یا رب
چھین لے مجھ سے حافظہ میرا (اختر انصاری۔ اصلی)

(ز) اتنا ہی نہیں ہے کہ ترے بن نہ رہا جائے
وہ جاں پہ بنی ہے کہ جئے بن نہ رہا جائے (حقی)

(ح) ہم خس و خاشاک آوارہ، گزر گاہوں کا بوجھ
رقص کرنے تیرے کوچے کی ہوا میں آئے ہیں (محشر بدایونی)

(ط) خود اپنے ہی اندر سے ابھرتا ہے وہ موسم
جو رنگ بچھا دیتا ہے تتلی کے پروں پر (اطہر نفیس)

(ی) طلسم خواب زلیخا و دام بردہ فروش
ہزار طرح کے قصے سفر میں ہوتے ہیں (عزیز حامد مدنی)

(ک) سپردگی میں بھی اک رمز خود نگہ داری
وہ میرے دل سے مرے واسطے نہیں گزرے (مجید امجد)

(ل) اپنے حال کو جان کے ہم نے دل کا دامن تھاما ہے
جن داموں یہ دنیا ملتی، اتنے ہمارے دام کہاں (مختار صدیقی)

(م) دیکھ پھولوں سے لدے دھوپ نہائے ہوئے پیڑ
ہنس کے کہتے ہیں گزاری ہے خزاں بھی ہم نے (ضیا جالندھری)

(ن) یہ لوگ ٹوٹی ہوئی کشتیوں میں سوتے ہیں
مرے مکان سے دریا دکھائی دیتا ہے (احمد مشتاق)

(س) اک گونج ہے طلسم ہوا پر نہ جایئے
مت چونکیے خود اپنی صدا پر نہ جایئے (سجاد باقر رضوی)

(ع) صبح زنداں میں بھی ہوتی ہو گی
پھول مقتل میں بھی کھلتے ہوں گے (ادا جعفری)

(ف) اب اس گھر کی آبادی مہمانوں پر ہے
کوئی آ جائے تو وقت گزر جاتا ہے (زہرا نگاہ)

(ص) رات بہت سوئے بھی نہیں تھے پھر بھی خواب بہت دیکھے
باتیں کی تھیں اس لہجے میں جیسے اس سے چھپائی ہوں (کشور ناہید)

(ق) اتر کے ناؤ سے بھی کب سفر تمام ہوا
زمیں پہ پاؤں رکھا تو زمین چلنے لگی (شکیب جلالی)

(ر) پہلے ہی تازہ ہوا آتی تھی کم اس پر ستم
گھر کی دیواروں کو ہم نے اور اونچا کر لیا (مشفق خواجہ)

(ش) ذہن کے تاریک گوشوں سے اٹھی تھی اک صدا
میں نے پوچھا کون ہے، اس نے کہا کوئی نہیں (شہزاد احمد)

(ت) جستجو جس کی تھی اس کو تو نہ پایا ہم نے
اس بہانے سے مگر دیکھ لی دنیا ہم نے (شہریار)

(ث) ابھی کوئی سایہ نکل آئے گا
ذرا جسم کو روشنی تو دکھا (محمد علوی)

چونکہ "ت" اور "ث" پہلی گردان میں فرار ہو گئے تھے اس لئے انہیں دوبارہ گرفتار کر رہا ہوں کہ تیسری گردان نہ شروع کرنی پڑے۔

(ت) موسم سنگ و رنگ سے ربط شرار کس کو تھا
لحظہ بہ لحظہ جل گئی، درد بہار کس کو تھا (شمس الرحمٰن فاروقی)

(ث) منزل صبح آ گئی شاید ---،
راستے ہر طرف کو جانے لگے (محبوب خزاں)

(خ) میں خیال ہوں کسی اور کا مجھے سوچتا کوئی اور ہے
سر آئنہ مرا عکس ہے پس آئنہ کوئی اور ہے (سلیم کوثر)

(ذ) خموش ہوں تو مجھے اتنا کم جواز نہ جان
مرے بیان سے باہر بھی ہیں سبب میرے (جمال احسانی)

(ض) گفتگو کسی سے ہو تیرا دھیان رہتا ہے
ٹوٹ ٹوٹ جاتا ہے سلسلہ تکلم کا ---، (فرید جاوید)

(ظ) خواب میں جو کچھ دیکھ رہا ہوں اس کا دکھانا مشکل ہے
آئینے میں پھول کھلا ہے ہاتھ لگانا مشکل ہے (قمر جلیل)

(غ) راستوں میں اک نگر آباد ہے
اس تصور سے ہی گھر آباد ہے (سحر انصاری)

تین شعر اور لکھنا چاہتا ہوں کہ ساٹھ کی گنتی پوری ہو۔ معاف کر دیجئے کہ یہ کمبخت سلسلہ رکنے میں نہیں آتا اس لئے مُطغ جیسا ذلیل لفظ ایک بار پھر بروئے کار آ رہا ہے۔

(ض) شوق رقص سے جب تک انگلیاں نہیں کھلتیں
پاؤں سے ہواؤں کے بیڑیاں نہیں کھلتیں (پروین شاکر)

(ظ) باہر جو میں نکلوں تو برہنہ نظر آؤں
بیٹھا ہوں میں گھر میں درودیوار پہن کر (سلیم شاہد)

(غ) آہٹ پہ نہ چونکو کہ نہ آئے گی یہاں موت
دستک پہ نہ جاؤ کہ یہ آوارہ ہوا ہے (آصف جمال)

جیسا کہ شروع میں کہہ چکا ہوں کہ اس مضمون نما کے مخاطب صرف آپ نہیں ہیں ۔

مخاطب ہوں تجھ سے مگر تو نہ بول
کسی تیسرے سے مری جنگ ہے (جاوید شاہین)

یہاں وہ "تیسرا" خراب شعر ہے۔ مقصد چھوٹے بڑے شاعروں کو آپ کے خلاف محاذ آرا کرنا نہیں کہ ان میں سے کئیوں کی سانس تو بس ایک آدھ شعر کی کبڈی کھیلتے ہوئے ہی پھول گئی اور بتیوں میں بیشتر ایسے ہیں جو الفاظ سے گلی ڈنڈا کھیل رہے ہیں۔ ان کی طرف کبھی رجوع ہوا تو بہتوں کا اکثر کلام منسوخ کر دوں گا۔ منشا صرف یہ ہے کہ اظہار اور بیان اور خیال اور احساس اور زبان کا ایسا کمیا لگاؤں اور اس کمپے پر ایسا لاسا لگاؤں کہ آپ کی توجہ کا پرندہ پھنس سکے۔ فعاں کہ آپ کی غزل کی طرف مراجعت ضروری ہو گئی:-

31- کارگر اس مرتبہ بھی یہ دوا ہو جائے گی
دیکھ لینا درد کی شدت سوا ہو جائے گی

(زبان و بیان کی سادہ لوحی سے قطع نظر' کیا شاہ دولے کا چوہا ایسا ہاکا' کلیشے زدہ' پھسپھسا اور بے مزہ شعر کہنے پر قادر نہیں تھا۔ آخر اس میں وہ وزیر آغا کہاں ہیں جو اپنے ہر مصرعے اور ہر فقرے پر اپنے رسالے میں دنیا بھر کی تعریفوں کی دولتیاں چلواتے ہیں۔ آپ کی' احمد ندیم قاسمی کی اور شمس الرحمٰن فاروقی کی دیکھا دیکھی ایک بنگلوری پیر گمنامی کو بھی یہ جسارت ہوئی کہ اپنے رسالے میں تین معتبر لکھنے والوں سے اپنی تعریف کروا کے انٹرویو چھاپے۔ اب وہ دن دور نہیں جب ہر مدیر اپنے اپنے رسالے کا اپنا اپنا نمبر نکلوائے گا اور good taste کا جنازہ بھی۔)

32- ایک پل دیکھے گی تجھ کو آشنا نظروں کے ساتھ
دوسرے پل بے سبب نا آشنا ہو جائے گی

(کون؟ آخر کون دیکھے گی؟۔ میں نے فوراً اس سے پہلے والے شعر کو دیکھا کہ شاید اس شعر کا کوئی جواز ملے کہ غزل مسلسل بھی ایک چیز ہے۔ غرض کہ اس ملکوتی شعر سے ملاقات ہوئی۔

دائرے کے گنبد بے در میں ہو جائے گی بند
اور پھر بے دست و پا تیری صدا ہو جائے گی

تو میں نے اس "تیری صدا" کو آواز دی کہ اے جان یہ بتا کہ اگلے شعر میں تو نے آشنا نظروں سے کیوں دیکھا اور دیکھنے کے بعد نا آشنا ہو جانے کا کیا راز ہے۔ جواباً اس "تیری صدا" نے مجھے کیچڑ بھری آنکھوں سے دیکھا مگر بولی کچھ نہیں کہ بولتی کیا۔ یاد رہے کہ مسلسل غزل میں بھی ہر شعر ایک مکمل اکائی ہوتا ہے۔ اور آگے پیچھے کے شعروں سے گلے مل کر ایک فضا کی تعمیر کرتا ہے اور اپنی "وحدت" کی ہمہ جہتی کے ساتھ "کثرت" کا اٹوٹ حصہ بن جاتا ہے۔ یہ گر کی باتیں ہر کس و ناکس کو نہیں بتاتا' آپ کو اس لئے بتا رہا ہوں کہ آپ کا قدر شناس ہوں)

33- یقیں دلاؤ نہ مجھ کو تم پرائے نہیں
مجھے تو زخم لگے تم نے زخم کھائے نہیں

(پہلا مصرعہ بے وزن ہے "کو" کے بعد "کہ" کا ہونا لازمی ہے۔ سوچا کتابت کی غلطی ہے۔ پھر آپ کی کتاب "غزلیں" اٹھائی۔ اس میں بھی "کہ" غایب ہے۔ پھر "گھاس میں تتلیاں" کھولی۔ اس میں بھی وہی بے وزنی۔ مجھے معلوم ہے کہ آپ خود بھی اپنی کتابوں کے پروف پڑھتے ہیں اس لئے اجازت دیجئے یہ کہنے کی کہ اکثر "وزن" آپ کو جل دے جاتا ہے)

34- وہ بھی کیا دن تھے کہ بے چہرہ پھرا کرتے تھے لوگ
آدمی جب آدمی کی ہو بہو تصویر تھا ---'

(قاعدے سے مجھے اس شعر کو اس کے Face Value پر قبول کر لینا چاہئے' قبول نہیں کر رہا ہوں تو اس کا سبب یہ ہے کہ "بے چہرگی" اردو ادب میں یہی کوئی تیس چالیس سال سے داخل ہوئی ہے اور یہ انگریزی لفظ Face lessness کا لغوی ترجمہ ہے۔ انگریزی میں اس لفظ کے دسیوں معنی میں سے ایک' بہت کھینچ تان کے' خوشگواری یا اعتبار بھی ہے مگر اردو میں وہ بقیہ نو معنوں میں مستعمل ہے یعنی روباہی' کمینگی' بغل میں چھری منہ پہ رام رام' دو منی' دوغلا پن' بے شرمی' کم ظرفی' دلالت اور رذالت وغیرہ۔ انگریزی کے بہت سے الفاظ' عربی کے بہت سے الفاظ کی طرح اور فارسی کے بہت سے الفاظ کی طرح اپنے ساتھ اپنے تمام رنگوں یا سایوں (Shades) کا ذخیرہ لے کر اردو میں داخل نہیں ہوئے اور اردو والوں کے قبضے میں آنے سے پہلے اپنی بہت سی کینچلیاں اتار

آئے۔ آپ سے گذارش یہ ہے کہ ذرا احتیاط سے کام لیا کیجئے اور اگر کسی غیر مانوس لفظ پر کسی مطلب کا صرف شبہ سا ہو اور پورا مطلب ذہن کی زنجیر سے صید نہ ہو رہا ہو تو مزید چھان بین میں مضائقہ نہیں)

35- رات آئے تو یادوں کے سب زخم ہرے ہو جاتے ہیں
سانپوں ایسے تارے ہم کو ڈنک چبھونے لگتے ہیں

(یا مظہر العجائب !! یعنی سانپ ڈنک مارتے ہیں' ہاتھی بھونکتے ہیں' کتے میاؤں میاؤں کرتے ہیں۔ بلیاں چنگھاڑتی ہیں۔ سور ہنہناتے ہیں۔ یہ کیا ہو گیا ہے آپ کو۔ اسی تساہل پر غرہ ہے؟)

36- ضبط کرتا تھا مگر بات نکل جاتی تھی؟
اپنی آواز کی لرزش سے بہت تنگ تھا وہ

(وہ میرا یار جانی' دلی کا مشہور "کرخندار" محمود ہاشمی' جس کے نام' آپ نے نہایت دوربینی سے کام لیتے ہوئے' اپنی ایک کتاب بھی معنون کر رکھی ہے' اس شعر کی داد یوں دیتا "ویسے تو "لرزش" بھی مجاوے ریا ہے مگر "سازش" سے شعر آسمان پر پہنچ جاتا")

37- یاد ہے آج بھی وہ ساعت نمناک مجھے

(ناصر کاظمی سے متاثر ہونے کا مطلب یہ نہیں کہ اس کے مصرعے کا تتبع بھی کیا جائے۔ جدوجہد کئے بغیر سپر نہ ڈالئے۔ اپنے تجربے کی روشنی میں لکھئے۔ لمبی ہے غم کی شام مگر شام ہی تو ہے)

38- وہ کہ اب عالم حیرت سے ہے محروم' کبھی
دیکھ کر پھول کی پتی کو ہوا دنگ تھا وہ'

(اے غرابت بیان تیرا دوسرا نام وزیر آغا ہے)

39- کر وہ زمانہ یاد کہ تھی آنکھ میں حیا
مابین دوستوں کے ابھی کچھ حجاب تھا

(نہیں نہیں نہیں۔ یہ اس وزیر آغا کا شعر نہیں ہو سکتا جو اپنی غزل کا ڈھنڈھورا پیٹتا ہے۔ Statement after statement after statement ذرا دل پر اور ذوق سلیم پر یا ذوق سلیم آغا قزلباش پر ایمانداری سے ہاتھ رکھ کر یہ بتایئے کہ

(What the hell is this?

40- بدلا زمانہ ایسا کہ ہونٹوں پہ تیرے بات
آئی ابھی نہیں تھی کہ ورد زباں ہوئی

(صرف اسی شعر میں نہیں' بلکہ سیکڑوں شعروں میں' آپ خیال باندھنے کی کوشش میں نکس کی ہتے کرتے ہوئے نظر آئے ہیں اور نکس بھی وہ جو کُل بجزبیانی پر بیٹھی ہو۔ اس سے بہتر تو یہ ہوتا کہ آپ ہاتھ میں مورچھل لئے سبز آنکھوں والی پیپ خوار مکھیاں اڑاتے تاکہ ادب میں سل انگاری کا ہیضہ نہ پھیلتا)

41- چلو اپنی بھی جانب اب چلیں ہم
یہ رستہ دیر سے سونا پڑا ہے

(اس قدر عمدہ اور صاف دوسرے مصرعے پر کیسا کلنک کے ٹیکے جیسا پہلا مصرعہ لگایا ہے۔ جناب والا! "اپنی بھی جانب" نہیں بلکہ "اپنی جانب بھی" تاکہ "جانب" پر زور پڑے کہ جو آپ کہنا چاہتے ہیں اس کی پذیرائی ہو۔ وہی وزن کا مسئلہ۔

42- بھیگے پروں کے ساتھ جھپٹنے لگی ہے شام
لاکھوں چمکتی کرچوں میں بٹنے لگی ہے شام
میری سیہ قبا میں سمٹنے لگی ہے شام
کانٹا سا بن کے تن سے چمٹنے لگی ہے شام

(میں نے ایک شعر کا مصرعہ دوسرے میں' دوسرے کا تیسرے میں' تیسرے کا چوتھے میں لگا کر غزل پڑھی تو غزل تھوڑی سی Improve ضرور ہو گئی مگر فرق کچھ نہیں پڑا۔ طبیعت رواں ہوئی تو میں نے بھی ایک شعر کہا۔ ملاحظہ ہو۔

اے ہم صفیر ہاضمہ اس کا بحال کر
سورج نگل کے درد سے پھٹنے لگی ہے شام

43- بھری محفل میں تنہا ہو گئے ہو

(تو یہ ہوا اجتہاد کہ مصرعہ پڑھ کر ایک کروڑ مصرعے یاد آ گئے۔ خدا آپ کو بخشے)

44- آپ کی غزل ہے' بکھرنے لگی ہے شام' بھرنے لگی ہے شام' اترنے لگی ہے شام

اور مصرعہ دیا ہے آپ نے۔ کس کی گداز گود میں گرنے لگی ہے شام ——
میں زبان کی غلطیاں نہیں نکال رہا بلکہ صرف آپ کی جہالت کی نشان دہی کر رہا ہوں کہ آپنے ایک نوجوان شاعر کی غزل سے ایک شعر بجا طور پر اسی قسم کی غلطی کی وجہ سے خارج کر دیا تھا۔ خدا کا شکر ہے کہ آپ اپنی غزل دوبارہ نہیں پڑھتے ورنہ آپ کی تنقیدی بصیرت سارا کلام ہی ردی کی ٹوکری میں پھینک دیتی۔ اور آپ ٹسوے بہاتے ہی رہ جاتے)

45- جو آ کے میرا ہی منظر مجھے دکھا جائے
وہ یار مخلص و نا مہرباں نہیں ملتا

(مبارک ہو۔ دعا کارگر ہوئی۔ آپ جسے ڈھونڈ ڈھونڈ کر تھک گئے تھے وہ یار مخلص و نامہرباں میں ہی ہوں۔ سو اب میرے اخلاص اور نامہربانی کا گلہ مت کیجئے گا)

46- شب سیاہ میں جس طرح کا ہکشاں آباد

(مصرعہ بے وزن ہے۔ اسے تو شمس الرحمٰن جیسا عروضیا بھی اپنی ایڑی چوٹی کا زور لگا کر "موزن" (ـ) نہیں کر سکتا۔ یہاں "کہکشاں" چھپکتی تو وزن درہم برہم نہ ہوتا)

47- چھپکی جو چاندنی تو چٹخنے لگیں گے ہم
اور گفتگو کے پھول سحر تک کھلائیں گے

(اگر نئے پن کی کوشش ہوتی تو میں چٹخنے کو معاف کر دیتا۔ مگر یہاں آپ صوتیات کے چکر میں مارے گئے۔ آپ کے کانوں میں اس لفظ کی صوت سے ملتا جلتا ایک لفظ مقید تھا۔ خیال اغلب ہے کہ دونوں الفاظ 'چٹخنا بھی اور چٹکنا بھی' کانوں میں محفوظ ہوں گے مگر آپنے داہنے کان کی بات نہ مانی اور انگلیاں چٹخا کے بائیں کان کے ہو رہے۔)

48- بیتی باتوں سے مجھے بہلا نہیں ---
اے زمانے ! لوٹ کر اب آ نہیں

(حد ہو گئی۔ بنجر زمینوں میں مضحکہ خیز ابیات کا جنگل لگا رکھا ہے۔ اس کی ذرا پروا نہیں کہ جنگل کے انسپکٹر کو کیا منہ دکھائیں گے)

49- جدھر دیکھتا ہے ہوا روبرو ہے
یہ دل زرد پتے کی صورت کھڑا ہے

(گویا زرد پتا کھڑا رہتا ہے یعنی یہ اس کی سب سے اہم خصوصیات ہے۔ یہ تو ممکن ہے کہ دو پتھروں میں پھنسا کر یہ تلقین کی جائے کہ "سالے کھڑا رہ، مجھے دل کے لئے ایک تشبیہ چاہئے" ورنہ حقیقت یہ ہے کہ بیچارے زرد پتے پڑے رہتے ہیں۔ کھڑے کبھی نہیں رہے۔ پیڑ پر بھی نہیں۔ وزیر کوٹ میں بھی نہیں۔ ۔ بدنام کرے گی انھیں تلقین عدو کی۔ یہاں "انھیں" سے مراد پتے اور "عدو" سے مراد آپ ہیں)

50- وہ دن بھی یاد کر کہ بھرے شہر میں یہاں
تیرے سوا کوئی بھی تجھے جانتا نہ تھا

(جب "بھرے شہر" کہہ دیا تو "یہاں" کمبخت کہاں سے در آیا۔ ظاہر ہے بیچارہ خانہ پری کے لئے منگوایا گیا ہے۔ خیر آپ زمین دار جاگیردار آدمی ہیں جس کو چاہئے جہاں بسوا دیجئے مگر یہ نہ بھولئے کہ جب ہمارا زمانہ آئے گا تو ہم مزارع لوگ یہ زمین اور جاگیریں خالی کروالیں گے)

51- ایسے بڑھے کہ منزلیں رستے میں بجھ گئیں
ایسے گئے کہ پھر نہ کبھی لوٹنا ہوا ---

(بظاہر اس شعر میں کوئی خرابی نہیں مگر "گئے" کی جگہ اگر "چلے" ہوتا تو مصرعہ چل نکلتا۔ اس میں حرکت آجاتی اور پہلے مصرعے کے "بڑھے" کو تقویت ملتی۔ "گئے" کہہ کر آپ نے حتمیت کو راہ دی ہے یعنی ایک ایسا واقعہ جو اختتام پذیر ہوا نہ کہ ایک ایسا بیان جس کے ڈانڈے اس معتوب زمانہ "سلسلہ جاریہ" سے ملتے ہیں)

52- میں صدا دوں اور تو' آواز دے
اس بھری دنیا میں ممکن کیا نہیں

(فرض کیجئے کہ وہ 'صدا دے' اور آپ 'آواز' دیں تو احساس یا خیال یا معنی کا کیا بگڑے گا۔ ایک زمانے میں ہنس کی چال چلتے چلتے اپنے لکھنوی سقے بچے افتخار عارف نے ایک سوقیانہ شعر لکھا تھا۔

مرے خدا مجھے اتنا تو معتبر کر دے
میں جس مکان میں رہتا ہوں اس کو گھر کر دے

(شعر ہم جیسے سرگرانوں کے لئے عامیانہ ہی سہی مگر اس عزیز نے' اپنی بساط بھر'

"مکان" اور "گھر" کا جواز تو پیدا کیا تھا۔ مگر آپ بتایئے آخر آپ نے کون سا تیرا مارا ہے)

53- چلو مٹا دیئے سارے نشان پا تو نے
بیاض دل پہ یہ کیسا نشان باقی ہے

(اگر "چلو" کہا تھا تو "تم" کہتے۔ اگر "تو" سے محبت تھی "چل" کہتے ——— میں سر پیٹ رہا ہوں۔ اے غلام جیلانی اصغر آپ کہاں تھے! اور اے انور سدید تم کہاں ہو! آپ حضرات اپنے دوست کی بے حرمتی کروانے کے اتنے شائق کیوں ہیں۔؟)

54- یا ابر کرم بن کے برس خشک زمیں پر
یا پیاس کے صحرا میں مجھے جینا سکھا دے

(گلے لگ جایئے۔ یاد ہے نا "پیاس کا صحرا" میں نے 36 سال پہلے ایجاد کیا تھا۔ آپ کے ہاں دیکھ کر جھوم اٹھا۔ اب احساس ہوا کہ فیض صاحب احمد فرازوں کے یہاں اپنی تراکیب دیکھ کر اتنے مگن کیوں ہوتے تھے۔ خوش رہیئے۔)

55- آنکھ کھولی تو دوریاں تھیں بہت
آنکھ میچی تو فاصلہ نہ رہا

(آپ کے پردادا میر تقی میر اگر آپ کے ساتھ سرگودھا سے دلی تک کا سفر کر رہے ہوتے تو "میچی" کا یہ استعمال دیکھ کر بگھی سے اتر جاتے اور آپ اپنے اب و جد کے پیشے "گھوڑوں کی تجارت" سے دست کش ہو جاتے)

56- اب آپ اپنی 96 غزلوں میں سے آخری غزل کا آخری شعر بھی دیکھتے چلئے کہ بدلحاظی اور بے مروتی کی چھپنویں چھری جو میں چلا رہا ہوں اس کا آخری وار دیکھ کر خود میں بھی لہولہان ہو جاؤں اور غزلوں کے سلسلے کا یہ خونیں باب خدا خدا کر کے بند ہو کہ بس آنکھوں میں دم باقی رہ گیا ہے۔ ساغر کو مرے ہاتھ سے لینا کہ چلا میں ---- غالب اور سودا ساتھ ساتھ کیا مزا دے گئے۔

میں آوارہ بھاگ کے تجھ سے دیس بدیس پھروں
رک جاؤں تو ہاتھ تمہارا کھینچے میری ڈور ---،

(وہی اونٹ اور بلی وہی "تجھ" اور "تمہارا"۔ صیغہ جمع و مفرد ایسی چیزیں نہیں کہ

معمولی نظر ثانی سے دور نہ ہو سکیں۔ حماقت کی مولی اور جہالت کی کچی پیاز سے پرہیز کیجئے کہ آپ نہایت بدبودار شاعری ڈکارتے رہتے ہیں۔ شامہ سر بہ گریباں کہ اسے کیا کہئے۔

میں نے 56 اشعار پر الگ الگ جو گفتگو کی ہے وہ اتنی الگ الگ بھی نہیں کہ مزید 56 شعروں پر اسی خشوع و خضوع کے ساتھ یہی سب کچھ کہوں گا کہ میری آرا کا اطلاق آپ کی بیشتر شاعری پر ہوتا ہے۔ آپ کے ہاں کم مائگی' مشاہدے کا فقدان' تجربے کی یکسانیت وغیرہ ایسی چیزیں ہیں جو آپ کو اپنے اچھے ہم عصروں سے ممیز کرتی دکھائی دیتی ہیں۔ آپ نے اپنے حمق کا شور اتنا مچوایا کہ مجھ جیسے مجذوب کا خاموش رہنا مشکل ہو گیا۔ اس لئے صدق دل سے معاف کر دیجئے اور خوگر گلہ سے تھوڑی سی حمد بھی سن لیجئے مگر اس سے پہلے ایک اور مجذوب کا ایک شعر بھی سنتے چلئے۔

یہ رات خیر سے کٹ جائے سونے والوں پر
پلٹ پڑا جو کہیں آفتاب' کیا ہو گا ---'

ظاہر ہے Warning shot نہیں ہے ——— خیر ———

آپ ایک معزز' دل دار اور روح نواز شخصیت کے مالک ہیں اور جب غور و فکر کرتے ہیں تو استنجے کے لئے ڈھیلے پر آب شفاف کو ترجیح دیتے ہیں اور Fluke میں ایسے ایسے بانکے مصرعوں اور شعروں کو شعری جمالیات کے جنتیوں کی صف میں لا کھڑا کرتے ہیں کہ ہم گنہگار جھاگ کی طرح بیٹھ جاتے ہیں۔ اس عذاب سے آپ کم کم گزرتے ہیں مگر جب گزرتے ہیں تو سبحان اللہ:

1-ع ذرا سی ٹھیس لگی اور گھر کو اوڑھ لیا

(گھر اوڑھنے کی تازگی سے کون منکر ہو سکتا ہے۔ مگر اس مصرعے میں ٹھیس لگنے اور گھر اوڑھنے کے درمیان ایک دکھی دل کی ایک طویل داستان بھی مقید ہے۔ یہ بھی کہ دنیا سے زک اٹھا کر آدمی اپنے اندر سمٹ آیا کہ سارا آرام تو اندر ہی ملتا ہے نا۔ اس مصرعے میں سامنے کی ایک پرت' پیچھے کی کئی پرتوں میں چھپی ہوئی ہے۔ یہی اس مصرعے کی کامیابی کا راز ہے)

-2 اپنی عریانی چھپانے کے لئے
تو نے سارے شہر کو ننگا کیا ٠

(کیسی لہک اور کیسے اجمال کے ساتھ آپ نے ایک انسانی کمزوری کی نقاب کشائی کی ہے۔ میں شاعروں سے اس طرح کے شعروں کا طلب گار رہتا ہوں۔ 'To the point
Lyrical اور fresh'

امیر مینائی یاد آ گئے

؎ آنکھیں دکھلاتے ہو جوبن تو دکھاؤ صاحب
وہ الگ باندھ کے رکھا ہے جو مال اچھا ہے

آپ کہ آنکھیں دکھلاتے رہتے ہیں آخر اپنے جوبن کے درشن کے سلسلے میں لجاتے کیوں ہیں)

3- دن رات گزر رہے تھے ایسے
میں جیسے ورق الٹ رہا تھا

(آپ نے بے کیفی اور "بوریت" کے عالم کو کیسی چابک دستی سے اسیر کیا ہے۔ لطف آ گیا۔ پھر جب آدمی ورق الٹتا ہے تو ایک صفحے کے مقابلے میں دوسرے صفحے پر زیادہ اجالا یا اندھیرا آتا جاتا رہتا ہے اور دن اور رات کی کیفیت پیدا ہوتی رہتی ہے۔ اور بحر آپ نے ایسی چنی ہے جو الفاظ کو آہستہ رو کرتی ہے۔ ان چیزوں نے شعر کی شخصیت مکمل کر دی ہے)

4- تشنگی کی سبیل جاری تھی
ہم مسافر جہاں جہاں پہنچے

(مصرعوں کی صفائی کے علاوہ اس شعر کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ اس نے سبیل کے بارے میں نئی معنویت کے احکام جاری کر دیئے ہیں اور یہ بھی کہ "سبیل" اور "تشنگی" اور "مسافر" نے One unit کی تعمیر کی ہے۔ اس میں ازل سے ابد تک کے سفر کی کہانی بھی پوشیدہ ہے۔ "جہاں جہاں" نے ایک صورت یہ بھی ابھاری ہے کہ دل کی طرف رجوع ہوئے تو بھی پیاس ہی ملی اور ذہن کا رخ کیا تو وہاں بھی عطش ہی کا سامنا ہوا)

5- دشت در دشت ہے مسافت شب
کس خرابے میں کارواں پہنچے ...،

(دنیا جہان کے اچھے شعروں کی طرح یہ شعر بھی اکہرا نہیں۔ اور غزل کا یہ آخری شعر، غزل کے دوسرے شعر، ـــــ وہ جو اوپر درج ہے ـــــ کی تکمیل کرتا ہے۔ پہلے مصرعے میں آپنے تین شیشوں سے ایسی لے اختراع کی ہے کہ خرابے میں پہنچنے کے بعد بھی کارواں ٹھہرا ہوا معلوم نہیں ہوتا۔ ایک طرح کی حرکت جاری ہے۔ دوسرے مصرعے میں دو باتیں ہیں یعنی "کس" سے پہلے "افسوس" یا "آہ" بھی رکھ دیا ہے اور "آخر" بھی ـــــ اور دو طرح کی فضاؤں کو جنم دیا ہے)

6- کھلی جو آنکھ تو دشت خیال تھا ہر سو
پھر اس کے بعد سفر سارا خواب ایسا تھا

(ظاہر ہے یہ زمین آپ کی نہیں مگر اس شعر کی بدولت آپ بھی اس زمین کے اجارہ دار بن گئے ہیں۔ شعر پڑھ کے میں کھل اٹھا۔ جوان الرگ بانی یاد آگیا کہ اس خوش گو نے ایسے ہی مجرد پیکروں سے اپنی غزلوں میں حزن و نشاط کی فضائیں بنائی تھیں۔

سدا رہے اس کا نام پیارا سنا ہے کل رات مر گیا وہ

کاش آپ کسی پوری غزل میں اس قسم کی فضا بنا سکتے۔ اس شعر نے، میرے سخت دل کو بہت کاٹا، میری کھردری روح سے بڑی سرگوشی کی)

7- خزاں کو کچھ نہ ملا بے لباس کر کے مجھے

(کیا اچھا مصرعہ ہے)

8- اور خزاں آئی تو اک جلوہ صد رنگ تھا وہ

(زندہ باد)

9- کورے کاغذ کی سادگی پہ نہ جا

(یہاں آپ نے لفظ "سادگی" کو نئی زندگی بخش دی ہے۔ خوش رہئے)

10- یہ کارواں مجھے چھو کے گزرتا جاتا ہے

(اس مصرعے کی روانی مجھے بہت پسند ہے۔ اس میں اس سنگ میل کی تنہائی اور حسرت بھی پوشیدہ ہیں جسے چھوا گیا، پھر چھوڑ دیا گیا)

آپ کی کلیات میں (غزل والے حصے کی بات کر رہا ہوں) پہلے درجے کی اور کوئی چیز نہیں۔ اور یہ "پہلا درجہ" بھی آپ ہی کے دوسرے درجے اور تیسرے درجے کے

شعروں سے مقابلہ کر کے بتایا ہے۔ ہم عصروں یا قدما سے معاہدہ کر کے آپ کی سبکی نہیں کرواؤں گا۔ دوسرے درجے یا تیسرے درجے کے چار غنیمت شعروں کا ورد بھی بغیر رائے زنی کے کرتا چلوں کہ بہت تھک گیا ہوں:

1- سفرِ شب کا تقاضا ہے ترے ساتھ رہوں
دشت پر ہول ہے طوفان ہے آنے والا

2- مجھ کو در پردہ سناتا رہا قصہ اپنا —
اگلے وقتوں کی حکایات سنانے والا

3- کیا عجب آئے ادھر بھی وہ ہوا کا جھونکا
گھر کی دہلیز پہ اک شمع جلا دی ہم نے

4- بانسری بول رہی تھی کہ ادھر آ جاؤ
اس کی آواز میں آواز ملا دی ہم نے

(یہاں "بولنے" کی جگہ "کہنے" بلکہ "پکارنے" قسم کا کوئی لفظ ہوتا تو شعر بے داغ ہو جاتا)

اس قسم کے یا ان سے ملتے جلتے سیکڑوں نہیں ہزاروں اشعار آپ کے اور میرے ہم عمر شعرا کے ہاں مل جائیں گے اور ان کے یہاں بھی جنھوں نے پچاس کی سرحد بھی پار نہیں کی۔ خود میرے پاس ہم عصروں کے 388 دواوین موجود ہیں اور میں نے ان پر (ان شعروں پر) نشانات لگا رکھے ہیں جن میں خیال کی کوئی اپج، نغمے کی کوئی لے، بیان کی کوئی خوبی اور زبان کی کوئی نئی جہت نظر آئی ہے۔ ان شعرا کا قصور صرف یہ ہے کہ ان کے پاس "اوراق" ہے نہ ڈھول بجانے والوں کی فوج۔ اسی لئے ان کی پذیرائی نہیں ہوئی۔ یہ بڑی ناانصافی کی بات ہے۔

اب آیئے آپ کی نظم پر گفتگو کی ابتدا کروں۔ اب تک جو کچھ میں نے آپ کی غزل کے باب میں لکھا ہے اسے بھول جایئے۔ میں نے خود یہ احتیاط برتی کہ دونوں صنفوں (غزل اور نظم) پر اپنے تاثرات کے اظہار کے درمیان فصل کے زنداں میں قیام پذیر رہا اور سات دن کے وقفے کی دیوار کھڑی کر دی۔ یہ اس لئے کہ کہیں میری

معروضات میری اور آپ کی شرمندگی کا باعث نہ بنیں۔

دو طویل نظموں (آدھی صدی کے بعد' اور 'اک کتھا انوکھی') سمیت کلیات میں کل 186 نظمیں شامل ہیں۔ اور 45 برس پر محیط۔ نظم کا سفر آپ نے 1946 میں شروع کیا تھا یعنی غزل پر چھاپہ ماری سے بیس برس پہلے۔ چونکہ ناشاعری اور نابالغی آپ کے ٹریڈ مارک ہیں اس لئے پڑھنے والا آپ سے زیادہ توقعات وابستہ نہیں کرتا۔ اسی لئے پوری کتاب میں صرف ایک نظم ایسی ملی جو مجھے پسند کرنی پڑی۔ یاد ہے' آپ کے اور قاسمی صاحب کے مابین صلح صفائی کروانے کے سلسلے میں' راقم آپ کا مہمان تھا۔ آدھی رات کے بعد جب سارے احباب (غلام جیلانی اصغر' انور سدید' خورشید رضوی' سجاد نقوی اور دوسرے تمیں بھی) رخصت ہو گئے تو آپ میرے کمرے میں آئے اور اپنی دل موہ لینے والی آواز میں گویا ہوئے آ ساقی جی' کل رات ایک نظم ختم کی ہے' ابھی کسی کو سنائی نہیں' اور میں نے کہا تھا 'زندہ باد۔ میں تو کنواریوں پر جان دیتا ہوں۔ بسم اللہ'۔ تب آپ نے اپنی گوارا (ـ) نظم "چھنی کچی کا اسٹیشن" سنائی تھی اور میں نے بھی دل کھول کر داد دی تھی۔ صرف ایک مشورہ دیا تھا کہ نظم کا عنوان بدل کر صرف "ٹرمنس" کر دیجئے اور آپ مان گئے تھے۔ اس نظم کے اوصاف پر باتیں مضمون کے آخر میں ہوں گی (اور آخرت قریب ہے)۔ فی الحال ضروری امر یہ ہے کہ اردو کی ان نظموں کی نشاندہی کر دوں جن کے پہلو میں شاید یہ نظم اپنی جگہ بنائے۔

جگہ کی قلت اور حافظے کی علت کے باعث یہ تو ممکن نہیں کہ میں تمام اچھی نظموں کو مقید کر سکوں مگر جن نظموں کا احسان مجھ پر ہے اور میں جن کا باج گزار ہوں ان میں سے چند کے عنوانات لکھے دیتا ہوں:-

کتبہ (تصدق حسین خالد) حسن کوزہ گر نمبر1- اس کے علاوہ 15 اور نظمیں۔ (ن۔م۔ راشد) دریچہ اس کے علاوہ 14 اور نظمیں (فیض احمد فیض' میرے انتخاب میں کل نظمیں 14 تھیں مگر آپ کے فیض والے مضمون کی وجہ سے میں نے "شام" کو بھی شامل کر لیا ہے۔)

لب جو ئبارے' مزید بارہ تیرہ نظمیں (میرا جی) ایک لڑکا' اور پان ساتھ نظمیں اور (اختر الایمان) آوارہ (مجاز: نوچ لوں اور توڑ دوں والے دو بندوں کو منہا کر کے) اندھیرا

(مخدوم)۔ تالاب (ندیم۔ ان کی کئی اور نظموں نے بھی کئی سکھ دے) آخری ملاقات اور خاک دل (جاں نثار اختر)۔ قیوم نظر کی ایک نظم' عنوان ذہن میں نہیں آ رہا مگر شروع اس مصرعے سے ہوتی ہے۔

عمر رواں نے' اک جھٹکا سا کھایا اور اک سال گیا

اناؤنسر (مختار صدیقی) آٹو گراف اور توسیع شہر' آٹھ دس نظمیں اور ——— مجید امجد) بشارت (ضیا جالندھری' ملازمت سے سبکدوشی کے بعد انہوں نے 2'3 بانکی نظمیں اور کہی ہیں) تنہائیاں (ساحر لدھیانوی' نظم کا رومانی ٹریٹ منٹ مجھے سخت ناپسند ہے' اسے میں نے ذہن میں ایڈٹ کر کے آدھا کر رکھا ہے' یوں اپنی پسند کا جواز نکال لیا ہے) آخری ٹرام (عزیز حامد مدنی۔ 2'3 نظمیں اور بھی) میرے دشمن کی موت' چھ سات نظمیں اور (منیر نیازی) اکیلی' تین چار نظمیں اور (بلراج کومل) محمد علوی کی آٹھ دس نظمیں (عنوانات یاد نہیں' محمد علوی جان بخشی کر دو)۔ زاہد ڈار کی وہ خوبصورت نظم: میرے لئے تو یارو / عورت کا خوبصورت / ننگا بدن خدا ہے۔ دو تین اور نظمیں بھی۔ "اکیلی بستیاں" اور "تم کہاں ہو" دو تین نظمیں اور (محبوب خزاں) نیل کا سیلاب (قمر جمیل)۔ لیجئے میں نظموں کے نام گنوانے نکلا تھا مگر' نظموں کا تاثر تو ذہن میں محفوظ ہے' کمبخت عنوان جل دے گئے۔ خیر' میں نے اچھی نظموں کی اچھی خاصی تعداد کا جال پھر بھی بچا دیا ہے۔ اس خیال سے کہ کہیں وہ لوگ آزردہ نہ ہوں ان سب سے جن کی نظموں کے نام یا جن کے نام اس فہرست میں آنے سے رہ گئے ہیں' میں معافی مانگتا ہوں۔ مجھے اچھی طرح معلوم ہے کہ شہریار نے' کمار پاشی نے' عمیق حنفی نے' فہمیدہ ریاض نے' کشور ناہید نے' ندا فاضلی نے زبیر رضوی نے' فاروق حسن نے' احمد ہمیش نے اور کئی دوسروں نے چار چار پانچ پانچ بہت عمدہ اور بھرپور نظمیں کہہ رکھی ہیں۔ اس طویل جملہ تعلقات عامہ کے بعد یہ کہنے کی گنجائش نکل آئی ہے کہ آپ کی نظم "ٹرمنس" بھی شاید اسی فہرست میں شامل ہو جائے۔ مجھے آپ کی دوستی عزیز ہے۔ مضمون کے آخر میں اس نظم کی خوب تعریف و توصیف کروں گا۔ آگے اللہ مالک ہے۔

اب کہ میں آپ کی طرف آ نکلا ہوں مناسب ہے کہ میں ان کوتاہیوں کی طرف شروع میں ہی اشارے کرتا چلوں جو' املے' زبان و بیان اور وزن کے سلسلے میں' آپ سے

سرزد ہوئی ہیں کہ تیس برس تک انگریزی بولتے بولتے اور پڑھتے پڑھتے اور ہجرت کے شب و روز و مہینہ و سال کاٹتے کاٹتے اس معاملے میں بہت Touchy ہو گیا ہوں۔ خود میری زبان بگڑتی جاتی ہے۔ مندرجہ 8 ادیبوں کا شکر گزار ہوں کہ انہوں نے میری 10 غلطیوں کی طرف توجہ دلوائی:۔

1- راشد (میں نے کرہ کو کرے لکھ دیا تھا)

2- مشتاق احمد یوسفی (میں نے مافی الضمیر کو مافی ضمیر لکھ دیا تھا)

3- مشفق خواجہ (میں نے فیض صاحب کی "مقتل گاہ" کی دیکھا دیکھی "مذبح خانہ" لکھ دیا تھا۔ خواجہ پیا نے مذبح کروایا۔ میں نے زاویہ کی جمع زاویے لکھ دی تھی، اس زبان دراز نے زوایا کروایا۔ میں نے اپنی ایک نظم میں اسم معرفہ کے طور سے جواد لکھا۔ کھٹ سے اس بدزبان کا خط آیا کہ نام جواد ہے، تشدید کے بغیر۔ میں نے زچ ہو کر نام ہی بدل دیا اور اسے مختار کر لیا۔)

4- شمس الرحمٰن فاروقی (میں نے ذخیرہ کو "ز" سے لکھ دیا تھا)

5- نظیر صدیقی (میں نے ایک غزل میں میعاد کو معیاد لکھا تھا)

6- شمیم حنفی (میں نے جرات کو جرئت لکھ دیا تھا)

7- آصف جمال (میں نے چھتنار کو چھتناور لکھ دیا تھا)

8- احمد الیاس (اس نووارد کشمیری شاعر نے میری نظم مستانہ ہیجڑا کے بارے میں لکھا تھا کہ اس کے ایک مصرعے "یعنی ضمیر عالم کے" میں لفظ "یعنی" کھٹکتا ہے کہ اس سے حتمیت آگئی ہے۔ مجھے اس کی بات بہت بھائی اور میں نے اس لفظ کو "شاید" سے بدل دیا)۔

یہ سب مجھے اس لئے لکھنا پڑا کہ آپ نے نسبتاً نوجوان شاعر جمال احسانی کو شکایتاً لکھا تھا کہ "ساقی فاروقی میری اصلاح کیا کرتے ہیں۔" پیارے دوست! مشورہ، اصلاح نہیں ہوتا۔ اگر خدانخواستہ ایسا ہوتا تو وہ پچاسوں شاعر و افسانہ نویس و مضمون نگار جو ہندوستان اور پاکستان اور یورپ اور امریکہ میں براجمان ہیں مجھ سے بدگمان ہو جاتے کہ میں گاہے گاہے انہیں اپنی آرا سے آگاہ کرتا رہتا ہوں۔ افسوس کہ میں پھر بہک گیا۔ مگر ہر پھر کے آپ کی نظموں کی طرف دوبارہ نکل آیا ہوں۔ اور بات، آپ کی زبان اور آپ

کے بیان کے گرد چکر کاٹ رہی ہے۔ غرض کہ ۔

ذکر جب چھڑ گیا قیامت کا
بات پہنچی تری جوانی تک

بلکہ بقول مخمور جالندھری مرحوم:

؎ بات چاہے کسی بنگلے کے پلستر سے چلے
آخرش جنس کے محور پہ گھما لیتے ہیں

صفحہ 295- تو اک بھیگی گٹھڑی بنا کر سرد زینے کے قدموں میں دم توڑتا ہے۔
(یہاں 'کر' کی تک سمجھ میں نہیں آئی۔ اس سے مصرعہ بے وزن ہو گیا کہ نظم فعولن فعولن میں چل رہی تھی۔ "کر" کے نکل جانے سے وزن بھی درست ہو جائے گا اور معنی بھی)

صفحہ 339- میری جانب غیض بھری نظروں کا ریلا آیا
(لفظ غیض نہیں بلکہ غیظ ہے)

صفحہ 351- کاپی لگانے والے نے آدھی نظم کھا لی۔ دھچکا کھا کے میں نے آپ کی کتاب 'دن کا زرد پہاڑ' کھولی۔ وہاں یہ نظم اپنی مکمل صورت میں چھپی ہے۔ دوسرے لوگ اتنی دوڑدھوپ نہیں کریں گے اور اسے بھی آپ کی غلطی سمجھیں گے)

صفحہ 379- بوڑھے سورج کی ٹوٹی ہوئی قاش پر
("قاش" ترکی لفظ ہے اس کا مطلب "بادل" بھی ہے اور "ابرو" بھی اور "پھانک" بھی۔ اردو میں تیسرے معنی میں مستعمل ہے۔ آپ نے بھی اسے "پھانک" ہی کے طور پر برتا ہے۔ پھانک اس وقت وجود میں آتی ہے جب کسی کل سے اس جزو کو کاٹ کر الگ کیا جائے نہ کہ توڑ کے)

صفحہ 381- کہ میں ایک دل دوز سی چیخ سے اس کو للکارتا

صفحہ 393- کھڑ کھڑاتے زنگ آلودہ سے پہیوں کی صدا

صفحہ 485- ہوا کے ایک باریک سے تیز چابک کی صورت
("سی"، "سا" اور "سے" کا یہ ایک پر تی استعمال غلط نہیں ہے۔ مگر یہ حرف تشبیہ

آپ کے ہاں اور جگہوں پر بھی صرف خانہ پری کے لئے آیا ہے اور اپنے جمالیاتی تموں سے عاری۔ اپنی شاعری میں اس کا صحیح استعمال یوں ہوا ہے۔ (ع) بیٹھ گیا کچھ اٹھتے ہی چھوڑ گیا خیال سا (داغ) (ع) پنکھڑی اک گلاب کی سی ہے (میر) (ع) کچھ قفس کی تیلیوں سے چھن رہا ہے نور سا (فراق)

صفحہ 398- ہائے تو کیسے گری/باجی تو کیسے گر پڑی

(غرابت بیان پر رونے کو جی چاہتا ہے۔ مردانگی کا تقاضا تھا کہ خود قعرمذلت کے مزے لوٹتے بیچاری باجی نے کیا قصور کیا تھا۔)

صفحہ 422- نظم کا عنوان ہے "آنکھ بھنور کی'

تشدید ناجائز ہے۔ میری جان' تشدید پر یہ تشدد کس لئے!

صفحہ 423- میں وہ کھلی ہوئی سی آنکھ کہ جس میں

("کھلی ہوئی سی" کیوں صرف "کھلی سی" کیوں نہیں تا کہ صفائی بیان بھی آ جائے اور وزن کی کھینچا تانی بھی نہ کرنی پڑے)

صفحہ 426- نظم کا عنوان "سلوی" غلط ہے۔ "سلوی" ہونا چاہئے۔

(آپ تو واقعی امی ہیں۔)

صفحہ 432- فعولن فعولن کرتی ہوئی یہ نظم 35 ویں مصرعے پر آ کر ہکلانے لگتی ہے۔ میں' 34 واں' 35 واں اور 36 واں' تینوں مصرعے لکھے دیتا ہوں کہ میری بات گوش گزار ہو۔ وہ کائی زدہ تال/جن کے اندر سے/ منحوس سادھو نکل کر کناروں پہ بیٹھے ہوئے ہیں (-"تال" کے بعد یا 'جن' کے پہلے آدھے رکن یعنی فع کے وزن کا کوئی لفظ ہونا چاہئے ورنہ دوسرا مصرعہ اس بحر سے باہر ہو جائے گا)

صفحہ 443- کالے قرنوں کے سفر مسلسل کی اک داستاں

(مصرعہ بے وزن ہے سفر فعویا مفا ہے نہ کہ فعل- یہ وہی عبرتناک غلطی ہے جو آپ نے اپنی غزل میں نظر کے واسطے سے کی تھی)

صفحہ 465- ہوا سے کیسے کہوں کہ میری یہ سانس تو ایک واہمہ ہے

(یہ مصرعہ بھی بے وزن ہوتے ہوتے رہ گیا ہے۔ "ایک" کی وجہ سے)

صفحہ 469- مجھے نظم کے بہاؤ کو متقید کرنے کے لئے چھے مصرعوں کو کوٹ کرنا پڑ رہا ہے۔ غلطی 5 ویں اور چھٹے مصرعے کے درمیان فع یعنی آدھے رکن کی کمی کے سبب در آئی ہے۔ عجب روشنی ہے /اندھیرے کے کشکول میں کس نے دینار پھینکا/کہ کلیاں شعاعوں کی کھلنے لگیں/سارے جنگل کے پتے زمرد بنے' ٹہنیاں پیلے سونے کی چھڑیاں ہوئیں/ جھاڑیوں میں دہکنے لگے سرخ پھولوں کے فانوس/سات رنگوں کی پریاں انوکھا سا اک رقص کرنے لگیں ——— ("فانوس" اور "سات" کے بیچ لفظ "اور" بڑھا دیجئے کہ نغمہ مکمل ہو ———
By the way دیکھا آپ نے' یہاں بھی "سا" filler کے طور پر آیا ہے)

صفحہ 470- جلی ہوئی ہڈیوں کے اولے

(مصرعہ بحر رواں سے خارج ہو گیا کہ آپ نے "ہڈیوں" باندھا ہے۔ تشدید کے بغیر فعل' فعولن یا فعلن فعلن کرتے ہوئے ایک دم سے' صرف اس ایک مصرعے میں' آپ مفاعلاتن مفاعلاتن کرنے لگے۔ خدارا یہ نہ کہئے کہ 'من نہ دانم فاعلاتن فاعلات'۔ اس کا حق آپ کو نہیں پہنچتا۔ پکاسو نے مرنے سے تین مہینے پہلے اپنے Sunday Times والے انٹرویو میں کہا تھا and Iquote "میں تو دس گیارہ سال کی عمر میں ہی Masters کی طرح پینٹ کرنے لگا تھا۔ پھر ساری زندگی ان کی لکیروں (آپ کی زبان میں ان کی ریکھاؤں) کو توڑنے میں گزاری"۔ کھلا کہ توڑنے کے لئے یہ جاننا ضروری ہے کہ توڑنا کیا ہے۔ اور یہ کام رمز آشنا ہی کر سکتا ہے۔

صفحہ 485- ہوا کے ایک باریک سے تیز چابک کی صورت

(میرے جاہل وزیر کوئی دوست' یہ مصرعہ بھی بے وزن ہے اور اگلے پچھلے مصرعوں کے سیاق و سباق میں بے معنی بھی)

صفحہ 488- گرہیں بنی ہیں

(یہ مصرعہ بھی بے وزن ہے۔ لفظ گرہ (فعل) نہیں گرہ (فعو یا مفا ہے۔)

صفحہ 502- کس نے دیکھا/ اک سیال سونے کا ساگر/ پتھر دل ساحل سے اپنا پنڈ چھڑاتا/ مچل مچل کر گرتا اٹھتا اور غراتا۔ دوسرا مصرعہ بحر سے خارج ہے۔ یوں کر دیجئے (ع) سونے کا ساگر سیال' نغمہ بحال ہو جائے گا)

صفحہ 520- سنہری چنگیروں/میں ٹپ ٹپ اترتی ہوئی/روٹیاں ——
(گفتگو چونکہ آپ کی نظم 'آدھی صدی کے بعد' تک آ پہنچی ہے اس لئے کم و بیش وہی باتیں دہراؤں گا جو آپ کو ایک طویل خط میں لکھ چکا ہوں۔ آپ نے رائے مانگی تھی اور میں نے کھل کے نہایت تفصیلی رائے بھیجی تھی۔ بہت دنوں بعد جب آپ نے مضمون کی فرمائش کی تھی تو میں نے لکھا تھا کہ وہ خط واپس کر دیجئے تاکہ مجھے دوبارہ محنت نہ کرنی پڑے اور آپ نے نہایت عیاری سے یہ لکھ کر ٹال دیا تھا "آپ چونکہ اس زمانے میں احمد فراز سے خفا تھے اس لئے آپ نے اس خفگی کے عالم میں وہ خط لکھ دیا تھا جو گم ہو گیا ہے" to this effect or words آپ کے خطوط تو کراچی اور لاہور میں پڑے ہوئے ہیں' لفظا" لفظا" کیسے کوٹ کروں۔ میں ایک سے خفگی کا غبار دوسرے تک farward Carry نہیں کرتا بلکہ ہر فن پارے کو اس کے merit کی کسوٹی پر پرکھنے کا عادی ہوں۔ یہ بات آپ کو خوب معلوم ہے۔ خیر۔ مجھے اچھی طرح تو نہیں مگر یاد ہے کہ میں نے لکھا تھا۔ ٹپ ٹپ اترتی ہوئی روٹیوں کی بجائے جھپ جھپ اترتی ہوئی روٹیاں کر دیجئے۔ لکھنے بیٹھا تو بات یاد آ گئی۔ اس کا جواز شاید اس وقت نہیں دیا تھا۔ اب دے رہا ہوں۔ آپ نے نظم کے پہلے مصرعوں سے ایک مسرت' ایک لہک کی فضا بنائی ہے اور ٹپ ٹپ گرنے میں آنسو کی آواز ہے جو قائم شدہ فضا کو تباہ کرتی ہے۔ پھر جھپ جھپ کا صوتی تاثر بھی بہتر ہے)

صفحہ 566- زمین پر بچھی ندیاں /بے قراری سے/اک دوسری کی طرف/آ رہی تھیں۔ (ایک ندی دوسری ندی کی طرف آ رہی تھی' تو صحیح ہے۔ مگر ندیاں ہمیشہ ایک دوسرے کی طرف بڑھیں گی۔ دریا بھی ایک دوسرے کی طرف آئیں گے اور ندیاں بھی۔ تذکیریا تانیث سے کوئی فرق نہیں پڑے گا یعنی اسم نکرہ "دوسرے" کی تجنیس پر اثر انداز نہیں ہو سکتا۔ میں اس بھول کو آپ کی تساہل پسندی کا نام دوں گا۔ ابھی فون پر اپنے دوست خالد حسن قادری سے بھی اپنی بات کی تصدیق کروالی ہے۔ وہ "بدنصیب غزلوں" کے بانی

بھی ہیں اور گرامر کے استاد صادق بھی۔)

صفحہ 599- وہاں جس جگہ آج/ایک صحرا بچھا ہے/کبھی صدیوں پہلے۔ (یا تو پہلے مصرعے سے "آج" کو نکالنا پڑے گا یا دوسرے مصرعے سے "ایک" کو۔ تاکہ بحر کا بھرم رہ جائے۔ نہ بھولئے کہ یہ نظم آپ نے فعولن فعولن میں لکھی ہے۔)

صفحہ 603- حسیں بادباں اپنے سینے پھلائے
کنارے اسے اپنی جانب بلاتے

(کاتب صاحب نے اپنی ہنرمندی دکھائی ہے اور پھلاتے کو پھلائے کر دیا ہے۔ میں کراما کا تین اور حراما کا تین (یہ مرکب "حرامی" سے مرتب کیا ہے) یعنی تمام کاتبوں سے تنگ ہوں۔ تمام احتیاط کے باوجود ظالموں نے میری کتاب "زندہ پانی سچا" میں بھی مجھے کئی دکھ دیے ہیں مثلاً (ع) ہونے لگتے ہیں درد محو خرام کو (ع) ہوئے لگتے ہیں درد محو خرام' لکھ دیا ہے۔ ایک غزل میں "ڈھونڈ" کو "ڈھونڈھ" لکھ دیا ہے۔ دوسری غزل میں "دنیا" کو "دینا" کر دیا ہے۔ کمبختوں کو پتہ نہیں چلا کہ (ع) نقطے کے ہیر پھیر سے دنیا بدل گئی (مصرعے کی داد چاہتا ہوں)۔ خدا کا شکر ہے 300 صفحات کی کتاب میں تین غلطیوں سے جان چھوٹی۔ وہ حضرات تو اس سے کہیں زیادہ ذلیل کرنے کی اہلیت رکھتے ہیں۔ چھوڑیئے' میں تو بہت دور بیٹھا ہوا ہوں۔ آپ تو ان لوگوں کے سروں پر سوار ہو سکتے ہیں کہ آپ کے وسائل لامحدود ہیں)

صفحہ 604- لرزتی ہوئی گھنٹیوں کی صدا/مشکی گھوڑے کے ٹاپوں کی آواز/ کالے بادل کی بوجھل خوشی۔ (یہاں "آواز" کے بعد "اور" کا اضافہ ضروری ہے کہ نغمہ نہ ٹوٹے۔ جیسا کہ اس سلسلے میں لکھ چکا ہوں کہ کبھی کبھی تو میں لے (Rhythm) پر معنی کی قربانی کو بھی جائز سمجھتا ہوں۔ یعنی اندر کے سروں پر جان دیتا ہوں)

صفحہ 623- کون سی ایسی انہونی سی بات تھی جس نے/ برسوں پہلے/نہ کہنے کے پلو سے خود کو باندھا تھا ('نہ' وزن میں نہیں 'نا' ہونا چاہیے)

o

صفحہ 627- سمندر کے یہ گونگے لبوں پر' کے بعد "اک" کا اضافہ ضروری ہے
کہ مفاعیلن مفاعیلن والی بحر ٹوٹتی ہے کہ اگلا مصرعہ ہے (ع) دلکتی مسکراہٹ کی
کرن بن کر جھمکتا ہے۔ اب "اک" لگا کر پڑھئے تو میری بات سمجھ میں آ جائے
گی)

صفحہ 630- رمق جو کھلی آنکھ کا مرکزہ تھی/ رمق جس کے گہرے اندھیرے کی
/لاکھوں سلیں گھومتی تھیں /جس کا ایندھن تھیں' سوکھی ہوئی ہڈیاں'
خواہشیں۔ (چوتھے مصرعے میں آپ پھر مار کھا گئے۔ 'جس' سے پہلے ایک اور
'رمق' لگا دیجئے تاکہ مصرعہ بحر سے خارج نہ ہو اور لے میں بھی طاقت آ
جائے۔)

صفحہ 639- آپ کی نظم 'ورانتی رقص کرتی ہے' ندیم کی نظم "ورانتی" کا چربہ
ہے۔ ان کی نظم نعرہ بازی پر ختم ہوتی ہے' اس لئے بری ہے۔ آپ کی نظم
احساس و خیال میں کوئی اضافہ نہیں کرتی' اس لئے بری ہے)

صفحہ 642- اور صفحہ 643 ——— تو جب چاہے /جہاں چاہے/مگر تجھ کو خبر
شاید نہیں ہے/مرے چاروں طرف/بے نور آنکھوں/ان کہے بولوں کی
دیواریں/کھڑی ہیں/مرے چاروں طرف مجھ کو ڈراتی --- (چوتھے مصرعے
سے پہلے "کیوں" کا اضافہ اور ساتویں مصرعے کے بعد "اور" کا اضافہ ضروری
ہے کہ نظم بحر سے خارج نہ ہو)

صفحہ 644- عمارات کی ہڈیاں/خشک ندیوں میں/کہنہ چٹانوں کے اعضاء/جلی
کھیتیوں کے بدن/اور پرندوں کے جھلسے ہوئے پر/کوئی ایک بھی چیز/زندہ
نہیں ہے (کوئی ایک بھی چیز' غرابت بیان کی منتہا ہے اسے یوں کر دیجئے 'کوئی
چیز بھی آج'۔ کوئی بتلاؤ کہ ہم بتلائیں کیا۔)

صفحہ 678- اور صفحہ 679- "وداع" کا لفظ آپ نے تین جگہوں پر استعمال کیا
ہے اور ہر جگہ بحر سے خارج ہے۔ "ودع" کر دیجئے الف کے بغیر۔ "بحر"
جاری ہو جائے گی۔ شاعر بھی چغد نہیں لگے گا۔

صفحہ 745- وہ دن اور پھر آج کا دن/اس دھرتی پر نہ رات آئی/نہ دن نکلا/نہ

شام ہوئی۔ (دوسرے، تیسرے اور چوتھے مصرعوں کو یوں کر دیجئے کہ لوگ وزن کا طعنہ نہ دیں۔ اس دھرتی پر رات آئی/نا دن نکلا/نا شام ہوئی)

صفحہ 752- اپنے آپ کی پرچھائیاں ہیں (مصرعہ بے وزن ہے۔ یہاں پرچھائیاں کو پرچھائیں کر دیجئے کہ جانگلو پن فاش نہ ہو۔)

قبل اس کے کہ میں نظموں پر اپنے مجموعی تاثر کا اظہار کروں، اچھی بری نظموں کو دودھ اور پانی کی طرح الگ کر کے دکھاؤں، آپ سے بس اتنی استدعا ہے کہ میرے بچھائے ہوئے خارزار سے آبلہ پا کی طرح گزریے اور کانٹے چنتے جائیے کہ ادھر سے گزرنے والے دیوانوں کو مزید تکلیف نہ پہنچے۔ ایک دفعہ آپ نے میرے اعتراضات کے جواب میں لکھا تھا "کاش آپ کا خط پہلے مل گیا ہوتا، افسوس کہ وہ نظم چھپ گئی۔ دوبارہ جب یہ نظم (یہ آپ کی کتاب "آدھی صدی کے بعد" کا ذکر ہو رہا ہے) چھپی تو آپ کے مشوروں کی روشنی میں تبدیلیاں کر لوں گا" اب کیا دیکھتا ہوں کہ کلیات میں وہ نظم بالکل اپنی پرانی شکل میں، جوں کی توں موجود ہے۔ آپ اپنی ہٹ دھرم انانیت کا شکار ہو گئے۔ یہ چیز جہلا کو راس آتی ہے آپ جیسوں کو نہیں کہ آپ ایک روشن ضمیر آدمی ہیں۔ میں رائے دینے سے پہلے فن پارے کو دو تین بار پڑھتا ہوں notes بناتا ہوں، غور و فکر کرتا ہوں، ادھر ادھر کی کتابوں کی ورق گردانی کرتا ہوں اور جان کھپاتا ہوں۔ آپ کے اس رویے سے مجھے اپنی محنت کے اکارت جانے کا بڑا صدمہ ہے۔ اس بار میری باتوں سے سرسری نہ گزر جائیے گا۔ میں بھرا نہیں دے رہا۔ آپ ہی کی بھد ہو گی۔

کلیات کی 21 نظمیں کاٹ کے پھینک دینے والی ہیں۔ یہ ایک ناکتخدا وزیر آغا کی نظمیں ہیں (دھرتی کی آواز۔ نوجوانی۔ تخلیق۔ دائرہ۔ ندامت۔ یاد۔ سرراہ۔ یہ لوگ۔ ننھے مزدور۔ حیات نو۔ شب یلدا۔ بازگشت۔ فن کار سے۔ زندگی۔ سلسلہ در سلسلہ۔ رت جگا۔ ہتھیلی۔ اندھی کالی رات کا دھبہ۔ سورج کے آنے سے پہلے۔ حادثہ اور برف) یوں محسوس ہوتا ہے کہ آپ کی سہیلی نصرت آرا نصرت آج بھی آپ کی روح میں راج کر رہی ہے۔ یہ نظمیں اپنے اسلوب میں بے رنگ، اپنے موضوعات کے لحاظ سے بوسیدہ

(ساقی، ہمایوں اور نگار جیسے رسالوں میں ایسی سیکڑوں نظمیں چھپتی تھیں جو مر کھپ گئیں) اور اپنے آہنگ میں بے رس ہیں۔ سوائے "برف" کے جس کا آہنگ مجھے عزیز ہے (اب کچھ بھی نہیں کوئی بات نہیں/اب رات کی پھیلی شاخوں پر/اک بھی تو لرزتا پات نہیں/ اک جھونکا تپتے صحرا کا/ اس پیڑ سے آ ٹکراتا تھا ـــــــ الخ)۔ صرف اس وجہ سے آپ کی دوسرے درجے کی نظموں میں شامل نہیں کیا کہ جاں نثار اختر کی خوبصورت نظم " آخری ملاقات" کا آہنگ یاد آگیا۔ (مت روکو انھیں، پاس آنے دو/ یہ مجھ سے ملنے آئے ہیں/میں خود نہ جنھیں پہچان سکوں / کچھ اتنے دھندلے سائے ہیں ـــــــ الی آخرہ) آہنگ کی چوری، اسلوب کی چوری سے بھی زیادہ بدتر چیز ہے۔ آئندہ پرہیز کیجئے۔

اب اپنی دوسرے درجے کی نظموں کی طرف آجایئے (ظاہر ہے یہ سارا تقابل آپ کی واحد اچھی نظم "ٹرمنس" کو سامنے رکھ کر کیا ہے کہ اس کے بغیریات نہیں بنے گی اور درجہ بندی کا مطلب بھی سمجھ میں نہیں آئے گا۔ اس حصے میں 164 نظمیں شامل ہیں۔ اور چونکہ اردو میں اس طرح کی ہزاروں نظمیں لکھی جا رہی ہیں صرف 16 (سولہ) نظمیں ایسی ملیں جو اپنے لحن میں ٹھیک ٹھاک اور اپنے اظہار میں کسی حد تک جامع ہیں۔ جو کام عظمت اللہ خاں نے شروع کیا تھا (وہ عربی اور فارسی عروض "کی بجائے" یا "کے بجائے" ہندی پنگل سے استفادہ کرنا چاہتے تھے --- ہندوستانیت اور ہندی مزاج پیدا کرنا چاہتے تھے ــــــ خلیل الرحمٰن اعظمی) وہ میرا جی اور مجید امجد اور آرزو لکھنوی (تقدیم و تاخیر میں چوک ہو گئی، آرزو لکھنوی کا نام مجید امجد سے پہلے آنا چاہئے تھا) کہ رہنمائی میں، آپ نے آگے بڑھایا۔ یہ فرض، آپ نے نہایت خوش اسلوبی اور خاطر جمعی سے ادا کیا، اپنی تنقید میں، اپنی شاعری کو بیساکھی دینے کے لئے، اپنے رویے کی مدافعت میں، طرح طرح کے پس منظر اجاگر کئے (اوپر کا سفر، نیچے کا سفر، اندر کا سفر، باہر کا سفر، ارضی سفر، آسمانی سفر وغیرہ) یہ کام میرا جی یا مجید امجد نے نہیں کیا یا کروایا تھا۔ یہی نہیں، آپ نے اپنی شاعری پر توصیفی مضامین لکھوا لکھوا کر اور اپنا ڈھنڈورا پٹوا پٹوا کر سلیم احمد، وارث علوی اور فضیل جعفری جیسے صاحبان علم و فراست کو اپنا مخالف کر لیا۔ بہتوں کو اس غل غپاڑے کی وجہ سے آپ کی شاعری سے ہی نفرت ہو گئی۔ اس گروہ کا قصور آپ کے گروہ کے قصور

سے کم نہیں۔ سب سے بڑے مجرم آپ ہیں کہ آپ اپنے کو سب سے الگ اور سب سے اہم شاعر گردانتے رہے۔ حقیقت اس کے برعکس ہے۔ آپ عظمت اللہ خاں کے ندیدے خوشہ چیں ہیں اور مجید امجد سے کہیں کم تر ہیں۔ پھر صوفی میرا جی (یہ میں سارتر کے "سینٹ ژینے" کے تتبع میں لکھ رہا ہوں) کی شاعری کو تو آپ کی شاعری چھو تک نہیں پائی۔

مگر اس میں شک نہیں کہ ان لوگوں کی روایت کے آج آپ ایک (منیر نیازی کو چھوڑ کے) نمایاں شاعر ہیں۔ یہاں "آج" پر زور ہے۔ پہلے ان نظموں کے نام لکھ دوں جن کی بدولت آپکو اس روایت کا شاعر گردانا ہے:-

میں اور تو - تعاقب - اجڑتا شہر - سفر کا دوسرا مرحلہ - ہوا کہتی رہی آؤ - اشومیدھ یگیہ (اس عنوان کا مطلب ہی مجھے معلوم نہیں تھا - ہر طرف ہرکارے دوڑائے - راشد صاحب چلے گئے - یوسفی صاحب بھاگ گئے - لفظوں کے سلسلے میں کوئی دقت پڑتی ہے تو بڑی پریشانی ہوتی ہے۔ وہ تو کہئے کہ بی بی سی اردو سروس کے کم گو مگر ہونہار شاعر عبید صدیقی ہاتھ آ گئے۔ ہندی زبان اور ہندو دیومالا پر اچھی نظر رکھتے ہیں۔ انہوں نے اشومیدھ یگیہ کے معنی کچھ اس طرح بتائے کہ ان کا نام بھول جاؤں گا مگر یہ معنی نہیں بھولوں گا۔ ظاہرا صدیقی مگر باطنا" کا ئستھ ہیں۔ اس چومکھی میں کہیں بقیہ نظمیں نہ بھول جاؤں۔ اس لئے جلدی جلدی گنتی مکمل کر لینے دیجئے:-) دست بستہ کھڑا ہوں - ہوا کے جھونکے نے پنکھ کھولے - نباض - واپسی - آدھی صدی کے بعد - مچھ ریکھا - تماشہ - چڑنوبل - کہاں گئی ہو - اگر آج تم۔

اگر میں گوپی چند نارنگ ہوتا تو تمام نظمیں نقل کر کے ایک پوری کتاب کی بشارت دیتا۔ چونکہ یہ ایک اچھے مضمون نگار کا شیوہ نہیں اس لئے حذر کرتا ہوں۔ مگر اپنے پڑھنے والوں سے گذارش کروں گا کہ وہ ان نظموں کو ایک بار پڑھیں اور دیکھیں کہ ایک محدود اور مسدود منظرنامے کے باوجود (چڑنوبل کو چھوڑ کے) یہ نظمیں غنیمت ہیں۔

"آدھی صدی کے بعد" پر مجھے جو کچھ کہنا تھا کہہ چکا۔ یہ آپ کی بدقسمتی ہے کہ وہ خط آپ نے نہیں لوٹایا۔ ورنہ پڑھنے والوں پر میری پسند کے معنی کھلتے۔ دیگر 14 نظموں پر جو کچھ کہنا ہے وہ "ٹرمنس" کا تجزیہ کرتے ہوئے کہوں گا کہ "آدھی صدی کے بعد" اور "

ڑمنس" ان کامیاب نظموں کی ترقی یافتہ شکلیں ہیں۔ اس لئے ان تمام باتوں کا اطلاق، جو ڑمنس کے تجزیئے کے سلسلے میں ہوں گی، ان نظموں پر بھی ہو گا۔ آپ نے ایک ہی طرح کے تجربے اور مشاہدے کو بار بار دہرا کر میری مشکل آسان کر دی ہے۔ آج تک ایک ملاقات چلی آتی ہے۔(ب) یہ نہ بھولئے کہ یہ سولہ نظمیں بھی اسی دوسرے گرپ (Group) کی دیگر 148 نظموں کی ترقی یافتہ شکلیں ہیں۔ اس لئے کہ آپ گھنی جھاڑی کے پیچھے چھپ کے کائنات کا نظارہ کرتے ہیں۔ وہی کھڑکی بھر آسمان (اے اسد محمد خاں، تیرا شکریہ) نظر آتا رہتا ہے۔ اسم صفت بدل بدل کر آپ مندرجہ ذیل الفاظ سے اپنے خیالات و احساسات کے پیکر بناتے چلے جاتے ہیں :- ہوا - شام - سانجھ - صبح - بھور - شب - رات - پیڑ - درخت - شاخ - ٹہنی - پتیاں - پات - کوہ - پہاڑ - چوٹی - چڑیا - پرندہ - بن - جنگل - انگار - غم - دکھ - رنج - منڈیر - قاش - شوک - ہار - مالا - چونچ - چمٹا - میچی - میچا - چاند - قمر - سورج - غار - گپھا - بانجھ - دھرتی - زمین - بندی - بندیا - ندیا - مرگھٹ - نور - روشنی - اندھیارا - دھبہ - پیسہ - وغیرہ وغیرہ وغیرہ۔ اس کتے فلپ لارکن نے (جسے میں اس کے نازی خیالات کی وجہ سے نہایت ذلیل انسان مگر بہت اہم شاعر سمجھتا ہوں) اپنے "پیرس ریویو" والے انٹرویو میں کہا تھا کہ "کسی لفظ کو دہرانے سے پہلے اس پر ہفتوں بلکہ مہینوں غور کرتا رہتا ہوں" اور آپ ہیں کہ ہوا کے لمس کو محسوس کرتے ہی اور درخت کو دیکھتے ہی ٹانگ اٹھا دیتے ہیں۔ یکسانیت، ہم ایسے بد قسمتوں پر عذاب کی طرح نازل ہوتی رہتی ہے۔ (اقبال کے کلام کے ابتداء ہی میں جب ایک بار آپ یہ دریافت کر لیں کہ جنوں، ایمان، خودی، عمل وغیرہ کے بغیر مرد کامل ظہور میں نہیں آ سکتا تو ان کی باقی شاعری افسوس ناک حد تک حرف مکرر بن جاتی ہے -----ن - م - راشد) اپنے راشد صاحب نے بڑی جسارت اور بڑے پتے کی بات کہی تھی۔ جب آپ کی آٹھ دس نظموں سے ہی قاری پر یہ حقیقت کھل جاتی ہے کہ آپ کا "میں" ایک ہی طرح کے لینڈ اسکیپ میں ""انسان" کی طرف سفر کرتے ہوئے، بار بار وزیر کوٹ اور سرگودھا کے درمیان شٹل رہا ہے تو وہ آپ سے اور آپ کی شاعری سے بور ہونے لگتا ہے۔ برا نہ مانئے اگر یہ کہوں کہ آپ نے پچھلے تیس برسوں سے اپنے اوپر انکشاف کے دروازے بند کر رکھے ہیں۔ آپ کو گھگیاتا دیکھ کر اردو شاعر کی آنکھیں شرم سے جھک جاتی ہیں۔

اب رہ گئی بیچاری "چرنوبل" تو اس کے سلسلے میں اتنا کہنا کافی ہو گا کہ یہ نہ ہوتی تو آپ کے مرنے کے بعد کسی کو پتہ ہی نہ چلتا کہ آپ بیسویں صدی کے دوسرے ادھے میں زندہ تھے۔ اس نظم نے آپ کی لاج رکھ لی۔

کائنات کی تباہی کے اندیشے نے ایک عجب حزنیہ کو جنم دیا ہے۔ موضوع بڑا ہو تو زبان کی ناہمواری بھی پگھل جاتی ہے۔ نئے موضوع نے اندر کی دنیا کو باہر کی دنیا سے ملا دیا ہے۔ یہ واقعہ ان 15 نظموں میں بھی رونما ہوا ہے جنہیں میں آپ کی نیم کامیاب نظمیں کہتا ہوں مگر اس اہتمام کے ساتھ نہیں۔ ایک بار آپ نے اپنے ایک خط میں میری کسی نظم کی بے حد داد دیتے ہوئے لکھا تھا کہ "آپ کو اتنے نئے نئے موضوعات آخر سوجھتے کیسے ہیں" اس کا جواب یہ ہے کہ سوجھتے تو شاید آپ کو بھی ہوں گے یہ الگ بات ہے کہ آپ کا شاعری والا خانہ خالی ہے۔ خانہ خالی را دیوی گیرد۔

میں لکھتے لکھتے تھک گیا۔ آپ پڑھتے پڑھتے تھک گئے ہوں گے اس لئے اب وہ ساعت آ پہنچی ہے کہ آخر آخر میں چند باتیں "ٹرمنس" کے بارے میں بھی کرتا چلوں۔ حق تو یہ ہے کہ اس نظم کا یہ حق بنتا ہے۔

دو سو اکیس (221) مصرعوں پر مشتمل' بیان و زبان کی تین خامیوں (خزانے پہ کنڈلی سی اک مار کر بیٹھتی ("اک" کا استعمال عبث ہے) چوتھی پراسرار سی کھونٹ کے در پہ ("سی" پھر بھرتی ہے)۔ اور اپنے پیارے بابا مرحوم کے لئے آپ نے لکھا۔ مگر پھر اچانک مجھے میرے بابا نے /پلنگ سے بیدار ہو کر کہا (مرحوم زندہ ہوتے تو آپ پر ہتک عزت کا دعویٰ کرتے کہ آپ نے انہیں ایلچی بنا دیا) کے باوجود یہ نظم (ایک حد تک' آدھی صدی کے بعد' بھی) اپنے اظہار میں دل آویز اور اپنے احساس و خیال میں بھرپور ہے۔ ہرچند کہ آپ نے اپنے اردگرد شور شرابے کو روا رکھا ہے۔ مگر بنیادی طور پر آپ تنہائی پسند آدمی ہیں اور اصطبل میں دلدل رکھنے کے باوجود آپ کی شریعت انسانی ہے۔ ان اکیس نظموں میں بھی' جن کے بارے میں' میں نے کاٹ کے پھینک دینے کی سفارش کی ہے' اور ان ایک سو اڑتالیس نظموں میں بھی' جو موضوع کی جان لیوا یکسانیت اور زبان و بیان کی وزیر آغانہ ناہمواریوں کی وجہ سے بے طرح ناکام ہو گئی ہیں' آپ کے "میں" نے "انسان" کی

طرف سفر کرنے کی کوشش جاری رکھی ہے۔ اس نظم کا بچہ "میں" نوجوانی کی سرحدوں کو عبور کرتا ہوا، بوڑھے "انسان" کے پہاڑ تک آنکلا ہے۔ میں نے آپ سمیت بے شمار دوستوں کو مشورہ دیتے ہوئے بار بار لکھا ہے کہ کسی بھی فن پارے کی کامیابی کا راز یہ ہے کہ شروع کا بنیادی لفظ آخر میں استعارہ بن جائے۔ اس نظم میں (اور دوسرے درجہ کی سولہ نظموں میں بھی) یہ عمل' کامیابی کے ساتھ اپنے اختتام تک پہنچا ہے۔ اس نظم کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ آپ نے آئینے (آدمی) کی حیرت کو آخر تک برقرار رکھا ہے یعنی حیرتی ہے یہ آئینہ کس کا (میر) چونکہ آپ پہلی بار جھاڑی کے پیچھے سے ایک امنگ لئے باہر آئے ہیں اس لئے چھنی کھچی کا سفر شاعر کی کائنات کا سفر بن گیا ہے اور (آپ ہی کی سی زبان میں) آپ نے عمودی آسمانی رموز مسخر کرنے کے لئے مظاہر فطرت کی افقی زمینی اشیاء کے ضمنی کنایوں کا جال بن دیا ہے۔ (دیکھا آپ نے، میں مروجہ ادبی Jargon میں بھی گفتگو کرنے پر قادر ہوں مگر ترسیل (ابلاغ) کے لئے تنقید کی سیدھی سادی زبان ایجاد کی ہے)۔ اردو شاعری میں' بیانیہ اختیار کرنے کی وجہ سے' بے شمار نظموں میں اس طرح کے مصرعوں کا ورود ہوا: پھریوں ہوا' لگتا ہے' اس کے سبب' یوں محسوس ہوا' اس کے بعد' اے کاش' ایسا نہ ہوتا تو' اگرچہ' تب میں نے' پھر' اور' تب' جب (اور یہ مصرعے ہیں لفظ نہیں) وغیرہ وغیرہ۔ آپ کی نظم چار افسوسناک مصرعوں (1- اور ہم' 2- اب اٹھو' 3- اور پھر' 4- چمٹا ہوا) کے باوجود کامیاب ہے۔ شاعر کو ہڈی پر نہیں گودے پر زور دینا چاہئے۔ ضرورت اس کی ہے کہ شمس الرحمٰن' وارث علوی' جالبی' فضیل جعفری' سہیل احمد خاں' گوپی چند نارنگ' شمیم حنفی' وزیر آغا' آصف فرخی جیسے لوگ مصرعے کی بازیافت پر مضامین لکھیں۔ اور محمد حسن عسکری کے معرکہ آرا مضمون "قحط رجال نہیں قحط افعال" جیسے مضمون سے دوبارہ استفادہ کریں۔ اور جو رویہ انہوں نے افعال کے بارے میں اختیار کیا ہے اسی طریقے کی "مصرعے کی بازیافت" میں ترویج دیں۔ میں ایک Part time نقاد ہوں' مجھ سے اس قسم کی توقع بیکار ہے۔ نظم ایک کل ضرور ہے مگر اس کی تعمیر میں ہمہ جہت جزوی مصرعوں کی مضبوط اینٹیں لگی ہوتی ہیں۔ میرے اڑیل خیال' چل بھئی چل۔ اپنے حافظے کی باگ انگریزی شاعری کی طرف موڑ رہا ہوں:-

1 How I wonder, what you are (Shakespeare)

2 Take, O take those lips away (Shakespeare)

3 The dead shall live, the living die (Dryden)

4 Tiger Tiger burning bright (Blake)

5 If winter comes, can spring befar behind

اور

6 I fall upon the thorns of life! I bleed! (Shelley)

7 My love is like a red red rose (Burns)

اور نیوں (جدیدیوں) کے دس بارہ مصرعے بھی' اور یاد رکھئے یہ غزلوں کے مصرعے نہیں' نظموں کے ہیں کہ یہ مغربے غزل بالکل نہیں جانتے:

8 Like a patient etherised upon a table. (Eliot)

9 mixing/memory and desire ---- (Eliot)

10 I have measured out my life with coffee spoons (Eliot)

11 The enemy has changed its addresses (Auden)

12 The force that through the green fuse drives the flower (Dylon Thomas)

13 They fuck you up, your mum and dad (Harkin)

14 Tearing a cry from us. (Lawrence)

15 I kill where I please because it is all mine. (Ted Hugles)

16 Daddy, daddy, you bastard, I' m through. (Sylvia Plath)

17 The slap and plop were obscene threats... (Seamus Heaney)

18 I am a Jew/can't you do something with it.

(Anne Sexton جو یہودی نہیں تھی)

19 Trapped in the spectrum of a dying style. (Lawrence Durrell)

20 I was / and I no move exist (Pound)

آیئے اس عظیم صناع کے مصرعے پر یہ سلسلہ ختم کیا جائے۔ یہ معنیوں سے لبریز مصرعے (جزو) اپنی ہمہ گیری کے ساتھ نظم (کل) کی طرف نہایت ہوشمندی سے بڑھتے ہیں اور نظم کے سیاق و سباق میں ان کا حسن اور نشہ اور بڑھ جاتا ہے۔ یہ نہ بھولئے کہ جدیدیت ' انفرادیت کی طرح' ایک طرز زندگی ہے۔ آپ کی اس نظم میں بھی مصرعے اپنے نغمے اور معنی کو شانوں پر لئے آہستہ روی سے ابد کی طرف بڑھتے رہتے ہیں۔ کئی دفعے اس نظم کے "آدمی" نے پلٹ پلٹ کر ماضی (ازل) کی طرف بھی دیکھا ہے۔ اس لئے کہ وہ تنہا ہے اور بے بس' اور چونکہ حال میں محبوس ہے اس لئے اساطیر سے رہائی کی کشمکش میں مبتلا ہے کہ نئی دنیا کی خبر دے سکے۔ تمام عمر آپ جس ایک بات کو کہنے کے لئے ہکلاتے رہے آخر اس نظم میں نہایت ہنر مندی سے کہہ دی ہے۔ خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ یہاں تک پہنچتے پہنچتے زبان کی گرہ اور بیان کی زنجیر کھل گئی۔ تنقید ہو یا شاعری نعرہ بازی کا الزام آپ پر کوئی نہیں رکھ سکتا (ہاں پارٹی بازی میں آپ گلے گلے تک دھنسے ہوئے ہیں) مگر ان شائستہ مصرعوں نے (مدرس کی دستار / کھونٹی سے نیچے اترتی - یا - چھڑی کے سہارے کھڑا ہو کے / چاندی کے برتن کی صورت کھنکتا - یا - کمرے کے باہر' نظر کی مسافت پہ - یا - جہاں ریل کی لائنیں رک گئی ہیں / سیہ رنگ کا ایک تختہ ہے / تختے پہ لکھا ہے / اب آگے کچھ بھی نہیں ہے - یا - پرندوں کے اوپر / کسی نرم ریشم کی بدلی کی / بکھری ہوئی دھجیاں تھیں۔ یا ——— '... کالے انجن نے / اک چیخ ماری تھی / اور اس کی کالی جٹاؤں نے -- یا ——— میں خود بھی تو اک ننھی منی گرہ تھا / مری ذات میں چھنی کچھی چھپا تھا) نظم کو ایک تازہ اور انوکھا Locale (پتہ نہیں اردو میں اسے کیا کہیں گے) مہیا کیا ہے۔ اگر وہ سات عبرت انگیز غلطیاں اس نظم میں نہ ہوتیں (جن کی طرف میں نے پچھلی سطروں میں اشارہ کیا ہے) تو یہ آپ کی اکلوتی ہی سہی مگر واقعی کامیاب نظم ہوتی۔

شاید مینڈک سے یہ تقاضا' کہ وہ بلبل کی طرح نوا سنج ہو' عبث ہے۔ سرشت پر کس کو اختیار ہوتا ہے۔ خدا آپ کی عمر کی رسی دراز کرے مگر مرنے کے بعد آپ کو کون پوچھے گا۔ ہاں "اوراق" میں جگہ کی تبدیلی ضرور ہو جائے گی اور "مدیر وزیر آغا" کی جگہ "بانی وزیر آغا" چھپنے لگے گا ——— بہت تھک گیا ہوں اس لئے اب اجازت دیجئے۔ میری نیت پر شبہ نہ کیجئے کہ میں وہی مومن مبتلا ہوں جس کے بارے میں آپ نے لکھا تھا

کہ "آپ فن کی ان بلندیوں پر ہیں کہ لوگ آپ کی طرف نظر اٹھا کے دیکھتے ہیں تو ان کی ٹوپیاں اور پگڑیاں گرتی ہیں"

بے شمار محبتوں کے ساتھ۔

آپ کا'
ساقی
(15-6-93)

1 To be influnced by does not mean necessarily to echo.

(James Reeves)

2 I believe that one should be able to control and manipulate

Experiences with on informed and intelligent mind. (Sylvia plath)

3 Sometimes you Come across in the works of some what weaker

figures

reflection of the personalities of stronger ones... because the

weaker poet

can not get the other poet out of this system. (Peter Porter)

4 ایجاد بندہ۔ مجھ جیسے شاعر نقادوں کو اس قسم کی توڑ پھوڑ کی آزادی ہے۔ (ساقی)

5 It is not just an intellectual statement to me,its a whole, its a

musical statement. (James Reeves)

6 I like concentrated form; a very good poem could say as much

as a novel of two or three hundred pages. (Carl Frederick Prytz)

7 ---The intellectual warfare goes on always and every where---

(Audens letter to spender.)

8 ابھی ابھی مشفق خواجہ نے لکھا ہے کہ "ایک" کو اگر توڑ دیا جائے تو مصرعہ وزن میں ہے۔
اگرچہ احساس جمال پر سخت گراں گزرتا ہے۔ (ساقی)

۔ (عمر بھر ایک ملاقات چلی جاتی ہے — میر)

10 Modern art is that in which the artist reflects awarness of an

unprecedented modern situation in its form and idiom. (Spender.)

شہر میں مضموں نہ پھیلا ---

(ایک اعتراض کے جواب میں
احمد ندیم قاسمی اور مشفق خواجہ
کے نام دلچسپ خطوط)

غزل

(جو نزاع کا سبب بنی)

ہم تو بس ایک درد کی رحمت سے تنگ آ گئے
سینے میں آگ جل اٹھی لہجے میں رنگ آ گئے

اک دن جو احتیاط کا غرفہ ذرا سا کھل گیا
دیکھا کہ دور دور سے نفرت کے سنگ آ گئے

لاکھوں توہمات کے جالے پڑے ہیں ذہن میں
مشرق کے مرغ زار میں اہل فرنگ آ گئے

ثابت قدم عجیب ہیں، آنکھیں تری شبیہ سے
خالی ہوئیں تو روح میں بھر کے امنگ آ گئے

وحشت کہ سائباں نہیں ساقی کہیں اماں نہیں
یادوں کے ساحلوں پہ بھی کیا کیا نہنگ آ گئے

28-1-94

پیارے قاسمی صاحب، آج آپ کا خط ملا۔ اس کے ساتھ ہی مشفق کے اس خط کی نقل بھی جو اس نے آپ کے 29 دسمبر والے خط کے جواب میں 2 جنوری کو لکھا تھا۔ اسی ڈاک سے مشفق کے دو خطوط بھی ملے جو اس نے 18 جنوری اور 19 جنوری کو لکھے۔ ایک ساتھ چار تحفے دیکھ کر میرے ویرانے میں بہار آگئی۔

مشفق نے اپنے پہلے خط کو (جس میں آپ سے اتفاق کیا گیا تھا) اپنے دوسرے خط سے (جو مرے نام ہے) منسوخ کر دیا ہے۔ پہلے خط کی اساس اس مفروضے پر تھی کہ غزل بحر رجز مطوی مخبون (مفتعلن مفاعلن مفتعلن مفاعلن) میں لکھی گئی ہے۔ اس سلسلے میں اس نے مسٹر چنگیزی کے "چراغ سخن" سے استفادہ کیا۔ اس نے صحیح آدمی کی مدد مانگی مگر چونکہ سوال ہی نازیبا (غلط) تھا اس لئے میرزا کہ ہوشیار آدمی تھے سوال کی خشت اول کی کجی دیکھ کر زندہ ہی گڑ گئے (ع میں ایک ہوشیار کہ زندہ ہی گڑ گیا) اور ان کی قبر سے اب بھی یہ آواز آرہی ہے کہ اے ساقی کے یار جانی، اے آمنہ کے لعل (آمنہ خواجہ پیا کی بیوی ہیں جو میرے مقابلے میں اپنے شوہر کو دوسرے درجے کا شہری سمجھتی ہیں) ساقی نے یہ غزل غالب کی مشہور غزل، ۔ ہر چہ فلک نہ خواست است ہیچ کس از فلک نہ خواست، والی بحر میں نہیں لکھی جو کہ مفتعلن مفاعلن مفتعلن مفاعلن (یا مفاعلان) میں ہے۔ اس لئے کہ اس نے (یعنی ساقی نے) احمد ندیم قاسمی سے (بجا طور پر) اور مشفق خواجہ سے (بے جا طور پر) اتنا ضرور سیکھ لیا ہے کہ وہ وزیر آغا جیسے نابالغ لیجڑ شاعر کی طرح غلطیاں نہیں کرے گا۔

جب آپ کے استفسار پر میں نے غزل کی بحر کی طرف اشارہ کر دیا اور بتا دیا کہ میں نے ایک ذلیل اور متروک بحر بسیط (مثمن سالم) کے رکن فاعلن میں م کے زحاف کا اضافہ کر کے مستفعلن مفاعلن مستفعلن مفاعلن میں پوری غزل لکھی ہے اور ہر مصرعے کی تقطیع بھی آپ دونوں کو بھیج دی اور ثابت کیا کہ ہر مصرعہ مستفعلن مفاعلن مستفعلن مفاعلن میں ہے۔ غرض کہ میرے حساب سے اس بحث کو ختم ہو جانا چاہئے تھا۔ اس وقت پورے اردو ادب میں (شمس الرحمن سمیت) کوئی ماہر عروض ایسا نہیں ہے جو یہ کہہ کے

دکھا دے کہ ساقی سے سہو ہوا ہے۔ مشفق نے بھی پینترا بدلا۔ اب وہ میرے سمجھائے ہوئے راستے پر چل کر یہ نہیں کہہ رہا کہ میری غزل کے بعض مصرعے بے بحر ہیں (یہ الزام اس نے اپنے پہلے خط میں عجلت میں لگایا تھا۔ اور عجلت اس لئے کہ آپ سے برسوں بعد تجدید عہد کیا تھا اس نے۔ یاد رکھئے کہ اس تجدید عہد میں آپ دونوں کی پرانی understanding تو شامل ہے ہی مگر اس میں میرے خطوں، ٹیلی فونوں اور منہ زبانی گفتگو کا بھی دخل ہے۔ گواہ آپ دونوں -) بلکہ اب یہ کہہ رہا ہے کہ چونکہ میری غزل کے آدھے مصرعے (میری جائز بحر کے علاوہ) دوسری بحر میں بھی پڑھے جا سکتے ہیں اس لئے یہ "موجد" کا عجز ہوا۔ یہ نہیں لکھا کہ پڑھنے سننے والا کا عجز ہوا۔ اسے (یعنی اس دیدہ چھنالی کو) پڑھتے ہی میں نے اس کی خوبصورت اور ذہین بیوی اور اپنی بانکی دردمندی بہن آمنہ کو لکھ دیا کہ اب وقت آگیا ہے کہ جب مشفق کے لئے نمکین کاشمیری چائے کا مگ بناؤ تو اس میں تھوڑا سا زہر بھی ملا دو تا کہ یہ واصل جنت ہو (کہنا جہنم چاہتا تھا مگر اس کی نمازیں یاد آگئیں) اور نیکے کے پیسے پر زندگی کے بقیہ ایام گزار دو۔ اس لئے کہ اس نے جو کمایا وہ تو وزیر آغا اور انور سدید کی ضیافت کر کے اڑا دیا سوائے اس 50 ہزار کے جو پچھلے سال اسے انعام میں ملے اور جن میں سے 5 ہزار اس نے میری دعوت پر خرچ کئے وہ بھی اس لئے کہ "تم نے وزیر آغا کو نہایت کرب میں مبتلا کر دیا ہے۔ 2 مہینے وہ بیچارہ وزیر کوٹ ہی سے نہ نکلا۔ مضمون نہ چھپواؤ" اب سنئے، میں تو یہ بے ضرر مضمون ہی نہ لکھتا، دو سال تک خط لکھ لکھ کے اور فون پر بات کر کر کے اس نے مجھ سے وزیر آغا پر مضمون لکھوایا پھر میری یاد دہانی پر یوسفی صاحب کے گھر پر اور بھری محفل کے سامنے یہ بھی بتانے کی بلکہ جتانے کی کوشش کر رہا تھا "مجھے کیا معلوم تھا تم ایسا مضمون لکھ دو گے" وہ تو خدا کا شکر ہے کہ جب یہ اپنی کار میں مجھے میرے گھر چھوڑنے لے جا رہا تھا اور کار میں صرف آمنہ، یہ اور میں ہی تھے، میرے دلائل سے زچ ہو کر اس نے کہا "چلو مان لیا کہ وہ (یعنی وزیر آغا) ایک چ شاعر ہے (ٹھیک سے یاد نہیں کہ اس نے چ کہا تھا یا ح)

مگر اس کی (وزیر آغا کی) جہالت کو عام کرنے کی کیا ضرورت تھی۔" یہ گالی سن کر میری پیاری لکھنؤی آمنہ تو کار سے باہر دیکھنے لگی تھیں مگر میں اس بات پر مست ہو رہا تھا کہ میں اس کی تربیت ٹھیک کر رہا ہوں اور اب اسے گالی والی دینی (دینا) بھی آتی جا رہی

ہے۔

اس طویل جملہ متفقہ کے بعد آیئے پھر ادبی بحث کی جانب مڑا جائے۔ تو اب مشفق کا کہنا یہ ہے کہ چونکہ کئی مصرعے۔ بحر بسیط (زحافات کی تبدیلی کے بعد) کے علاوہ بحر رجز (مطوی مخبون) میں بھی پڑھے جا سکتے ہیں اس لئے یہ شاعر کی غلطی ہو گی۔ قطع نظر اس کے کہ میں نے رجز میں غزل لکھی ہی نہیں (اگر لکھتا تو ہر مصرعے کی تقطیع کا خیال رکھتا) میں تصور اور تحیر کی آنکھ سے دیکھ رہا ہوں کہ آپ دونوں کو مغالطہ کیسے ہوا۔ چونکہ عروض میں متحرک کو ساکن اور ساکن کو متحرک کر سکتے ہیں اور کر لیتے ہیں اس لئے تقطیع میں یہ ممکن ہے کہ بحر رجز اور بحر کامل ایک ہو جائیں۔ یعنی متفاعلن کی "ت" جوں ہی ساکت ہو گی وہ عروض کی رو سے مستفعلن کے وزن پر قائم ہو جائے گا۔ میں نے ہرگز وہ کام نہیں کیا جس کی طرف نظم طبا طبائی نے (شرح غالب میں) اشارہ کیا تھا "اگر کوئی انگریزی قصیدہ بحر طویل میں کہے تو کوئی انگریز اسے موزوں نہ کہے گا"۔ حضرات میں نے اردو قصیدہ (غزل) اردو ہی بحر میں زحافات کی تبدیلی کے ساتھ لکھا ہے اور انصاف چاہتا ہوں۔

اب ذرا ایک اور پہلو کی طرف آیئے۔ میر سے لے کر میرا جی تک کوئی شاعر ایسا نہیں ہے جس کے بعض مصرعوں بلکہ شاید پوری پوری غزل کی تقطیع دو بحروں میں نہ کی جا سکے اور ماہرین عروض اور اساتذہ تو اسے شاعر کے کمالات میں شمار کرتے تھے بلکہ سیماب نے تو اس بات پر فخر کیا کہ ان کی غزل ۔ اڑ کے پروانہ گیا شمع فروزاں کی طرف۔ فاعلاتن فاعلاتن فاعلن' والی بحر میں بھی پڑھی جا سکتی ہے اور فاعلاتن فعلاتن فعلن والی میں بھی۔ مجھے یہ استادانہ موشگافیاں نہیں آتیں۔ (حالانکہ اس بدمعاش محقق خواجہ نے مجھے راغب مراد آبادی اور عروضی سمرقندی کا طعنہ بھی دیا ہے) ساری زندگی مروجہ بحروں میں بجلی بھرنے اور موسیقی کی آگ جلانے میں مصروف رہا۔ ایک ایک مصرعے کی لے اور ایک ایک لفظ کی کھرج اور ایک ایک حرف کی گندھارا کو مقید کرنے کے لئے معنی تک کو قربان کرتا رہا۔ (اے ارض و سما بتاؤ اقبال' یگانہ اور راشد کے بعد آج کون ہے جو اس قسم کا دعویٰ کر سکے) خود خواجہ پیا کی زبان میری ان باتوں کی تعریف کرتے کرتے سوکھ گئی۔ کیا یہ بتانے کی ضرورت ہے کہ وہ میری شاعری ہی کی نہیں میری

رگ رگ سے بھی خوب خوب واقف ہے اسی لئے اس رمز آشنا کا الناس کر کلیجہ مسوس کر رہ گیا (اے مالک، اب وقت آگیا ہے کہ تو، مجھے اٹھا لے اور اگر مجھے اٹھانے میں جھجک ہے تو اسے اٹھا لے کہ بس ایک ماتم کرنے والا زندہ بچے)۔ زبان اور بیان اور الفاظ کی صحت پر زور اس لئے دیتا ہوں کہ معنی (احساس و خیال) الفاظ ہی کے تابع رہتا ہے مگر تیس سال سے دوسری زبان میں، اپنے ملک اپنی تہذیب اور اپنے ہم عصروں سے کٹ کر بیٹھا ہوا ہوں اس لئے گاہے گاہے میرے املا پر ضرب پڑنے لگی ہے۔ اور جوں ہی کوئی ٹوکتا ہے فوراً لکھ کر شکریہ ادا کرتا ہوں بلکہ مضامین میں بھی ذکر کر دیتا ہوں تیس برس میں کم از کم 15 الفاظ درست کئے ہیں اپنے۔ خواجہ پیا کے ساتھ میرا معاملہ یہ ہے کہ میری 51 فی صد باتیں وہ مان لیتا ہے اور اس کی 49 فی صد باتیں میں۔ اس نے تہیہ کر رکھا ہے کہ میرے مرنے کے بعد ہی میرے اوصاف گنوائے اور یہ بتائے کہ اس نے مجھ سے کیا سیکھا۔ اسی لئے میں جلد سے جلد مرجانا چاہتا ہوں کہ جب خدائی فوج دار منکر نکیر مجھے آکے بتائیں کہ تمہارے فلانے دوست مشفق خواجہ نے بھی تمہاری خدائی کا اعلان کر دیا ہے تو میری سفید براق ہڈیوں کے کیلشیم کو قرار آئے۔ ہاں خدائی پر یاد آیا ابھی راشد صاحب زندہ تھے تو میں نے خواجہ پیا کو اور سلیم احمد کو لکھا کہ اتنی دور بیٹھا ہوا ہوں، وہاں ہوتا تو شاعری پر لکچر دیتا۔ رسالہ نکالتا۔ آئے دن ریڈیو اور ٹی وی پر ہوتا۔ ہفتے میں ایک بار اخبارات میں بیان دیتا۔ بحثیں کرتا۔ جنگ کرتا۔ اخبار میں کالم لکھ کر اپنی ذہانت اور جودت طبع اور فراست کی دھاک بٹھاتا اور چونکہ ارد گرد زیادہ Competition نہیں ہے اس لئے خیال اغلب ہے کہ ادب پر چھایا رہتا مگر چونکہ یہ سب میسر نہیں ہے اس لئے آپ دونوں کا فرض ہے کہ جہاں جہاں (اخبار، ریڈیو، ٹی وی، رسالے) موقع ملے میری "بنتی ہوئی خدائی" کا اعلان کرتے رہیں۔ سلیم خاں نے تو جواب نہیں دیا کہ وہ اپنے ہی چکر میں لگے ہوئے تھے مگر اس عزیز کا خط آیا "میں یہ کام ابھی شروع نہیں کر سکتا، ابھی راشد و فیض و ندیم زندہ ہیں" میں چپ ہو کے بیٹھ رہا اور محنت کرتا رہا۔ جب راشد صاحب چلے گئے تو میں نے آہستہ سے پھر یاد دہانی کرائی۔ جواب آیا "تم کمال کرتے ہو، دیکھتے نہیں کہ ابھی فیض و ندیم زندہ ہیں" میں 10 سال تک منہ میں گھنگنیاں بھر کے گمر گمر کرتا رہا۔ خدا خدا کر کے فیض صاحب بھی (خدا انھیں کروٹ

کروٹ جنت نصیب کرے) جب اٹھ گئے تو میں نے اس ظلم کی یادوں کی راکھ کو وزیر کوٹ سے لائی ہوئی ایک پرانی خشک ٹہنی سے پھر چھیڑا (میں نے احتیاطا یہ ٹہنی اس درخت سے کاٹ لی جو آغا صاحب کے گھر کے پاس تھا۔ صرف اس خیال سے کہ کہیں وہ اس ٹہنی پر بھی کوئی مکروہ نظم نہ لکھ دیں۔ وہ بقیہ تمام ٹہنیوں پر لکھ چکے تھے' بس یہی سہاگن بچی ہوئی تھی) اس راکھ کو بار بار چھیڑنے کی ضرورت اس لئے پیش آتی رہی کہ مشفق کا حافظہ کثرت تحقیق اور قلت تخلیق سے پاش پاش ہوگیا ہے۔ یہ بات مجھے ڈاکٹر انور سجاد اور ڈاکٹر ایوب مرزا نے بتائی۔ ان میں سے ایک ڈاکٹر تجرید کی طرف جا کے مجرد ہوگیا دوسرا مغرب میں بس کر مخفف۔ غرض کہ اب اس ظالم کا جواب سنئے "ساقی' ذرا صبر کرو ابھی قاسمی صاحب زندہ ہیں۔" دیکھا آپ نے ٹینس کی بال میرے کورٹ میں پھینک کر مجھ سے یہ توقع وابستہ کر رہا ہے سسرا کہ خدانخواستہ میں آپ کے جانے کا انتظار شروع کر دوں۔ (خدا آپ کی عمر میں میری شرابی کبابی تمباکوی عمر لگائے) آپ کو اچھی طرح معلوم ہے اور اسے بھی کہ پہلے میں ہی جاؤں گا۔ اسی لئے آپ سے کہتا ہوں کہ تجدید محبت کو دوبارہ دشمن سے بدلئے۔ اس پر اعتبار نہ کیجئے (ذرا کان قریب لائیے تو ایک بات کہوں) یہ بدبخت ہم دونوں کے جانے کا شدت سے انتظار کر رہا ہے تاکہ خود اپنی خدائی کا اعلان کر کے گل چھرے اڑائے۔ سخت احتیاط کی ضرورت ہے۔ خبردار رہیے۔

اب اس کے جملے کی طرف آیئے "عروض کی چادر سے باہر پاؤں نہ پھیلاؤ' شاعر کو اس کے بنیادی وصف 'نغمگی' سے محروم نہ کرو" چونکہ اس جملے میں دو باتوں کی طرف اشارہ ہے اس لئے میرے جواب کے بھی دو حصے ہوں گے۔

(الف) عروض کی چادر: خواجہ پیا نے لکھا "یہ ایک اصولی مسئلہ ہے اس لئے طے ہو جانا چاہیے تاکہ تم کوئی نئی بحر ایجاد کرو تو کسی پرانی بحر پر دست تصرف نہ دراز کرو" میں دو دن تک یہ فقرہ ذہن میں گھماتا رہا۔ سوچتا رہا کہ میں موجد ضرور ہوں اور میرا کیش ترک رسوم بھی ہے مگر یہ کمبخت موجد کیا ہوتا ہے۔ مجھ میں یہ جرات کہاں کہ موجد بن بیٹھوں۔ مجھے بھی ندیم قاسمی اور مشفق خواجہ کی طرح عروض کی Working knowledge ہے۔ میں ایسا عروضیا کہاں سے ہوگیا کہ مجھ پر ایجاد اور تصرف کا الزام میرا خواجہ پیا لگائے۔ غرض کہ اسی تگ و دو میں ہلکان ہو رہا تھا کہ ناگہاں دروازے کی گھنٹی

بجی۔ اٹھ کر دروازہ کھولا تو کیا دیکھتا ہوں کہ میرزا نوشہ غالب اور ڈاکٹر محمد اقبال کھڑے ہیں۔ دونوں کی قدم بوسی کی اور انھیں اپنی لائبریری میں لے آیا۔ دونوں کا خیر مقدم کرتے ہوئے ان کا ایک ایک شعر پڑھا۔

ہے خبر گرم ان کے آنے کی
آج ہی گھر میں بوریا نہ ہوا

اور

چاہئے خانہ دل کی کوئی منزل خالی
شاید آ جائے کہیں سے کوئی مہمان عزیز

علامہ کی گود میں ایک "بلی" بٹھا کر اور میرزا کو اپنے Wine - cabinet سے Port کا ایک جام دے کر ان سے دیر تک لاہور کی ایک رنڈی اور دلی کی ایک ڈومنی کا قصہ سنتا رہا۔ وہ ساری شام مجھے سجادہ نشین (جیسے میں قیس ہوں) اور ہمارے جانشین (جسے میں کوئی اہم شاعر ہوں) کہ لقب سے پکارتے رہے اور میں نہایت بے دلی سے ساری شام احتجاج کرتا رہا مگر میرے چہرے پر تشنج کے آثار دیکھ کر علامہ بولے "بیٹے' آخر ماجرا کیا ہے اور یہ تردد کیوں ہے" دست بستہ عرض کیا "لاہور کے ایک بہت اہم شاعرو افسانہ نگار اور کراچی کے ایک بہت ذہین' محقق نے ایک بحر کے سلسلے میں مجھ پر تصرف اور ایجاد کا الزام لگایا ہے حالانکہ نہ میں تصرف کے قابل ہوں نہ ایجاد پر قادر" میرزا گویا ہوئے "پہلے اپنی غزل تو سناؤ" چنانچہ سنانی پڑی۔ دونوں نے بے تحاشہ داد دی اور اٹھ کر بار بار گلے لگایا۔ پھر علامہ بولے "اچھا تو تم نے مستفعلن مفاعلن مستفعلن مفاعلن میں غزل لکھی ہے۔ بڑی پاور فل بحر ہے لندن کے قیام کے دوران میں نے بھی اس بحر میں چند مصرعے لکھے تھے یہ کہہ کر انسوں نے اپنی وہ مشہور غزل سنائی جس میں یہ مصرعے آتے ہیں ۔ مصرو حجاز سے گزر' پارس و شام سے گزر یا ۔ ایسی نماز سے گزر' ایسے امام سے گزر انسوں نے یہ بھی بتایا کہ "چونکہ بحر میں دو برابر کے ٹکڑے آتے ہیں اس لئے بحر میں مستفعلن مفاعلن کی جگہ مستفعلن مفاعلان کی بھی اجازت ہے" ابھی وہ خاموش ہوئے ہی تھے کہ میرزا نوشہ بولے "بھئی ہمارے اسی بحر کے مصرعے تو سن لو عزیزو" ہم دونوں گوش بر آواز ہوئے تو ان کی پاٹ دار آواز گونجی۔ ان کی غزل اردو کی

5'4 بڑی غزلوں تو خیر ہے ہی مگر جس مستی سے انہوں نے اس غزل کے یہ دو مصرعے پڑھے تھے اس کا دنیا میں کوئی جواب نہیں۔ ایک تو وہی۔ بوسے کو پوچھتا ہوں میں' منہ سے مجھے بتا کہ یوں' اور دوسرا۔ موج محیط آب میں' مارے ہے دست و پا کہ یوں۔ یکا یک وہ اٹھ کر جانے لگے تو میں نے ان کی خاک پا کو سرمہ چشم بنایا۔ میرزا چلتے چلتے یہ ضرور کہہ گئے کہ "کراچی اور لاہور کی سڑکوں پر اتنی گرد اڑتی ہے کہ آنکھیں آ جاتی ہیں۔ تھوڑا سا سرمہ اپنے کراچوی دوست کو ضرور بھیج دینا۔ تمہارا لاہوری دوست تو خواہ مخواہ کراچوی دوست کے کہنے میں آگیا ہے" ——— سو مرزا نوشہ کے کہنے کے مطابق میں نے خواجہ پیا کو سرمے کی ایک شیشی پارسل کر دی ہے ———

(ب) اب خواجہ پیا کے فقرے کے دوسرے ٹکڑے کی طرف لوٹتا ہوں یعنی "شاعری کو اس کے بنیادی وصف 'نغمگی' سے محروم نہ کرو" ساری عمر یہ نابجار میری نغمگی کی قسم کھاتا رہا ہے اور میرے تمام دشمنوں کے سامنے میری نغمگی کی مدافعت کرتا رہا ہے اور آج مجھی کو نغمگی کے بارے میں خبردار کر رہا ہے۔ یہ سب قرب قیامت کے آثار ہیں۔ چاہوں تو اپنے مصرعوں کے حوالے سے نغمگی اور موسیقی پر دفتر کے دفتر سیاہ کر سکتا ہوں مگر یہ کام اسی پر چھوڑتا ہوں۔ میری زندگی میں یا میری موت کے بعد جب بھی یہ مضمون لکھے گا خود اس سلسلے میں مجھے defend کرے گا کہ اس کے علاوہ کوئی چارہ نہیں۔ اس باب میں ایک واقعہ سنانا ضروری ہے۔ کوئی برس پہلے جب میں کراچی گیا تو اس نے میرے اعزاز میں' اپنی بہن کے کلفٹن والے خوبصورت فلیٹ میں' نہایت شاندار دعوت کا اہتمام کیا (ساری عمر یہی مجھ پر پیسے خرچ کرتا رہا ہے۔ مجھے "اعزاز لوٹانے" کا موقع نہیں دیتا۔ لندن اس لئے نہیں آتا کہ اسے میری بیوی سے صبح سے شام تک انگریزی بولنی پڑے گی۔ اس تصور سے ہی اس کی گھگی بندھ جاتی ہے۔ میں بھی ایک کائیاں ہوں' ایسے ہی لوگوں سے بچنے کے لئے بیوی کو اردو نہیں سکھائی۔ بیوی کو اردو نہ سکھانے کا دوسرا سبب مشفق کو بھی معلوم ہے خود اسی نے مجھ سے ایک بار کہا تھا "ساقی' سنا ہے اپنی بیوی پر تم نے اپنی شاعری کی بڑی دھاک بٹھا رکھی ہے' خبردار انھیں اردو نہ سکھا دینا ورنہ وہ شاعری میں تمہارے اصلی مقام سے واقف ہو جائیں گی" ———) خیر' اس لمبے بریکٹ کے بعد واپس کلفٹن چلتے ہیں۔ جیسا کہ شرفا کا قاعدہ ہے کہ بڑی بہن پر نیت خراب ہو تو

چھوٹی بہن سے رازونیاز شروع کر دیتے ہیں یا اگر بڑے بھائی کی کمزوریاں اور برائیاں معلوم کرنی ہوں تو چھوٹے بھائی سے دوستی کی ابتدا کرتے ہیں۔ تو اس حکمت عملی کی وجہ سے میں Fifties کے اواخر میں اس کے برادر خورد سے دوستی گانٹھنے میں کامیاب ہو چکا تھا۔ اب کیا دیکھتا ہوں کہ وہ صوفے پر مشفق کے بائیں ہاتھ کی طرف بیٹھا ہوا ہے۔ یہی نہیں اگر باورچی خانے میں کسی کام کے سلسلے میں بہن بلاتی بھی تھیں تو پھر آکر بائیں جانب ہی بیٹھ جاتا تھا۔ اگر وہ سیٹ خالی نہ ہوتی اور مشفق کے دائیں ہاتھ والی سیٹ خالی ہوتی تو کھڑا رہتا اور جوں ہی بائیں سیٹ خالی ہوتی دھڑام سے بیٹھ جاتا اور کھسر پھسر کرتا۔ مجھ سے نہ رہا گیا اور میں اس کے چھوٹے بھائی کو ایک کونے میں لے گیا اور پوچھا "طارق، یہ تم مشفق کے بائیں ہاتھ پر ہی کیوں بیٹھتے ہو"۔ طارق خواجہ ایک نہایت دردمند اور دل نواز شخصیت کا مالک ہے۔ کہنے لگا "آپ کو نہیں معلوم! پیدائش کے بعد، ابا جان کی غیر موجودگی میں، ڈاکٹر سید عبداللہ نے، بھائی جان کے داہنے کان میں اتنی گرج دار آواز میں اذان دی تھی کہ کان کا آدھا پردہ پھٹ گیا تھا مگر وہ پھر بھی اس کان سے تھوڑا بہت سن لیا کرتے تھے مگر دو تین سال پہلے سرگودھا کا کوئی ڈیم فول شاعر کہ اپنا نام وزیر آغا بتاتا تھا، کراچی آیا۔ بھائی جان نے اس کی ضیافت کی کہ بھائی جان کو ضیافت اور تحقیق کے علاوہ اور کوئی کام نہیں آتا۔ بھائی سے بھی ٹھیک سے محبت نہیں کرتے۔ خیر اس جانگلوس شاعر نے (جو بھائی جان کے داہنے ہاتھ پر بیٹھا ہوا تھا۔ یعنی اسی کان کی جانب جو ڈاکٹر سید عبداللہ damage کر چکے تھے) اپنا مشہور مصرعہ پڑھا، وہی ۔ مشکیزہ ابر پھٹ رہا تھا۔ مصرعہ سنتے ہی بیچارے بھائی جان کا رہا سہا بقیہ آدھا پردا بھی پھٹ گیا۔ وہ دن ہے اور آج کا دن ہے میں بھائی جان کی داہنی جانب نہیں بیٹھتا اس لئے کہ وہ داہنے کان کی طرف سے بالکل "بے بہرہ" ہو گئے ہیں۔ اس لئے گاہے گاہے لوگوں سے بے رخی کی شکایت کر بیٹھتے ہیں۔ برا مت مانئے گا" یہ کہہ کر طارق حسب معمول اپنے بھائی جان کی بائیں جانب جا بیٹھا ــــــ

حکایت ختم ہوئی، دلائل ختم ہوئے، خط ختم ہوا۔ اب بھی اگر تذبذب ہو تو غزل پر نجمہ (*) لگا کر غزل کے نیچے میرے نام سے یہ نوٹ دے دیجئے "یہ غزل مستفعلن مفاعلن

مستفعلن مفاعلن میں لکھی گئی ہے ساقی"۔ تاکہ پوری ذمہ داری شاعر کی ہو مدیر کی نہیں۔
غزل نہایت تزک و احتشام سے چھاپئے کہ یہ اس کی مستحق ہے اور اس میں میرا وہ نوٹ بھی لگایئے جو میں نے آپ کی 77 ویں سال گرہ کے سلسلے سے لکھا ہے۔ اس خط کی کاپی رجسٹری سے ہی مشفق کو بھی بھیج رہا ہوں۔ وہ بھی میری ہی طرح ہے۔ یا تو اپنی غلطی مان لے گا یا دلیل سے مجھے رد کر دے گا۔ اپنی غلطی پر اڑے گا نہیں۔

بے شمار محبتیں، آپ کا
ساقی

25-4-94

مشفق خواجہ میری جان،

تمہارے اور آمنہ اور قاسمی صاحب کے فقروں کی مماثلت سے شبہ ہوا کہ خانوادۂ قاسمی اور خانوادۂ خواجہ میں ایک طرح کی Telepathy کا عمل دخل ہے۔

چونکہ اس بحث کا حرف اول بھی (غزل) میرا ہی تھا اس لئے مناسب ہے کہ حرف آخر بھی میرا ہی ہو۔ چنانچہ ان خطوں کا گوشوارہ (خلاصہ) بنانے کی اجازت دو:

1- میں نے قاسمی صاحب کو "فنون" کے لئے غزل بھیجی۔
2- قاسمی صاحب نے لکھا "حیرت زدہ رہ گیا کہ آپ سے بھی وزن کی فروگذاشتیں ہو سکتی ہیں۔ جی مان نہیں رہا مگر کیا کیا جائے۔ یہ بحر ہی ایسی ہے کہ اس میں بڑے بڑوں سے لغزشیں ہو جاتی ہیں۔ صرف محترم مشفق خواجہ سے مشورہ ضروری تھا۔ انہیں لکھا ہے"
3- میں نے قاسمی صاحب کو لکھا کہ میں نے اردو کی ایک ذلیل اور متروک بحر بسیط میں ایک زحاف کا اضافہ کر کے غزل لکھی ہے۔ یعنی مستفعلن فاعلن مستفعلن فاعلن کو مستفعلن مفاعلن مستفعلن مفاعلن کر دیا ہے۔ انہیں غزل کے ہر مصرعے کی تقطیع کر کے بھیج دی اور ثابت کیا کہ میں نے یہ تصرف بالالتزام کیا ہے اور بالاعلان بھی ہے۔ میں نے یہ لکھا کہ مشفق مجھی سے پوچھے گا۔
4- میں نے اپنے اس خط کی نقل مشفق خواجہ کو بھیج دی۔
5- مگر مشفق نے مجھ سے پوچھے بغیر میرزا یاس یگانہ چنگیزی کی کتاب پڑھ کر، کہ نام

اس کا "چراغ سخن" ہے، اپنی تحقیق کے اندھیرے میں، قاسمی صاحب کی ہاں میں ہاں ملادی اور قاسمی صاحب کو مزید کنفیوز کرنے کے لئے اپنی لاعلمی میں لکھ دیا کہ "ساقی کی غزل میں نے دیکھی۔ اس میں عروض کی وہ غلطیاں موجود ہیں جن کی نشاندہی آپ نے کی ہے۔" میری اس بحر بسیط مثمن سالم سے بے خبری کے باعث یہ بھی لکھ دیا "ساقی کی بحر کا نام بحر رجز مطوی مخبون ہے یعنی مفتعلن مفاعلن مفتعلن مفاعلن۔" اسی بحر میں تقطیع کر کے انہوں نے میرے چھ مصرعوں کو ناموزوں قرار دیا۔ اور قاسمی صاحب کو خط لکھتے ہوئے یہ بھی لکھا "ساقی یا تو اپنی غلطی مان لے گا یا اس بحث کو دلیل سے رد کر دے گا۔ وہ تیسرا راستہ اختیار نہیں کرے گا یعنی اپنی غلطی پر اڑے گا نہیں" مشفق نے نہیں بلکہ قاسمی صاحب نے مجھے اس خط کی نقل بھیجی۔

6- مگر مشفق نے قاسمی صاحب کے نام اپنے خط کی اطلاع دیتے ہوئے مجھے اتنا ضرور لکھا "قاسمی صاحب نے تمہاری غزل مجھے بھیجی اور اس کے وزن کے بارے میں اپنے شکوک کا اظہار کیا۔ میں نے ان کی تائید کی اور لکھا کہ یہ غزل مروجہ بحر سے خارج ہے" مروجہ بحر سے مشفق کی مراد بحر رجز مطوی مخبون تھی یعنی وہ بحر جس میں نادانستہ طور پر انہوں نے میری غزل کی تقطیع کی، نہ کہ وہ بحر بسیط مثمن سالم جس میں اس غزل کے دسوں مصرعے لکھے گئے تھے۔

7- اس خط کے ساتھ ساتھ مشفق کا ایک اور خط آیا اس لئے کہ میں نے بحر کی نشاندہی کے سلسلے میں جو خط قاسمی صاحب کو بھیجا تھا اس کی نقل انہیں بھیج دی تھی۔

8- میرا خط پڑھ کر مشفق کو اپنی غلط فہمی کا احساس ہوا کہ آدمی کٹ حجت نہیں ہے مگر انہوں نے ایک اور قلابازی کھائی۔ مجھ پر لگایا ہوا "بے بحری" کا الزام تو انہوں نے واپس لے لیا کہ اس کے علاوہ کوئی چارہ نہ تھا مگر مجھ پر "عاجزی" کا نیا اور شرم ناک الزام لگایا جس سے مجھ گوشہ نشین کی عزلت اور بڑھ گئی۔ غرض کہ شبیر پر عجب عالم تنہائی تھا۔

9- میں نے جواباً ایک نہایت شگفتہ اور مدلل خط لکھا، قاسمی اور خواجہ، دونوں

خانوادوں نے اسے "ادب پارہ" اور "ادبی شاہکار" کہہ کر میری عزت بڑھائی۔ حق تو یہ ہے کہ میرا خون بھی بڑھایا۔

10- قاسمی صاحب اب (یہاں اب پر زور ہے) تمام موانع سے آزاد ہو چکے ہیں اور ان کی شخصیت میں ایک ایسی بڑائی آگئی ہے کہ ساقی و مشفق تو کیا آج زندوں میں شاید ہی کوئی ادیب یا شاعر ایسا ہو جو ملنساہت میں ان کا مقابلہ کر سکے۔ اس بڑے آدمی کا جواب آیا "پیارے ساقی جی --- اوپر تلے متعدد پیارے خط ملے --- نہایت خوبصورت خط تھے۔ خاص طور پر وہ طویل خط جو آپ نے عروض کی لڑائی میں اپنی فتح کے نشے میں لکھا ہے --- قصہ مختصر یہ کہ آپ فتح یاب ہوئے اور ہم دونوں جو بڑے ٹھسے سے ابھرے تھے صابن کے جھاگ کی طرح بیٹھ گئے۔ فتح مبارک ہو۔ مگر یاد رہے کہ ہماری شکست بھی کچھ کم لذیذ نہیں۔ آخر ہم شکست یاب نہ ہوتے تو دس صفحے کا اتنا پیارا دلارا خط ہمیں کاہے کو ملتا"۔ قاسمی صاحب کا خط ملتے ہی میں نے انہیں لکھ بھیجا "پیارے قاسمی صاحب، اگر مجھے شکست ہوتی تو وہ بھی آپ ہی کی ہوتی۔ اگر فتح ہو گئی ہے تو یہ بھی آپ ہی کی ہے کہ میں نے آپ ہی سے سیکھا ہے اور آپ ہی کا آدمی ہوں"

سو خواجہ پیا، یہ تو ہوا گوشوارہ ہم تینوں کی آج تک کی خط و کتابت کا۔ اس سلسلے کا تمہارا 13 فروری کا لکھا ہوا آخری خط مجھے 20 اپریل کو ملا کہ ضیا جالندھری اور شمس الرحمٰن فاروقی کے تربیت یافتہ ڈاکیوں کو ڈکیتی کی لت پڑ گئی ہے۔ خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ تم نے اس خط کی نقل محفوظ کر لی تھی اور مجھے رجسٹری سے بھیجی۔

اس خط میں پہلی بار تم نے کھل کر یہ اعتراف کیا ہے کہ غزل پڑھ کر قاسمی صاحب کی طرح تمہارے ذہن میں بھی پہلا خیال یہ آیا کہ "اس کی بحر میں گڑ بڑ ہے" مگر جب میں نے ہر مصرعے کی تقطیع کر کے تمہیں یہ بتایا کہ ہر مصرعہ بحر بسیط مثمن سالم کے دوسرے رکن میں ایک حرکت کا اضافہ کر کے کہا گیا ہے تو تمہارا موقف یہ ہو گیا کہ لبیک، یہ بات تو صحیح ہے مگر چونکہ ذہن دوسری بحر کی طرف بھی، چھ مصرعوں کی وجہ سے، جا سکتا ہے اس لئے یہ موجد کی عاجزی ہو گی ---------------

—————————— اتنے بہت سے Dashes (وقفے یا جملہ معترضہ ظاہر کرنے کے نشانات) اس لئے لگائے ہیں کہ تمہیں مہلت نماز ملے اور تم اپنے مالک حقیقی سے گڑگڑا گڑگڑا کے یہ دعا مانگو "اے رحیم و کریم میرا کوئی قصور نہیں، مجھے انتقاماً قاسمی صاحب نے پھنسوا دیا ہے۔"

میں تو غزل کی تقطیع بھیج کے اور بحر کے باب میں اپنے اجتہاد اور اختراع کی خبر دے کر کب کا خاموش ہو گیا ہوتا مگر جب تم نے چیلنج کر دیا کہ "یہ ایک اصولی مسئلہ ہے جسے طے ہو جانا چاہئے" تو میں نے نہایت جانفشانی سے طے کر کے دکھا دیا کہ تم سراسر غلط ہو۔ چالیس سال تک مروجہ بحروں میں نظمیں غزلیں کہنے کے بعد دنیا کے ہر شاعر کو یہ فطری حق حاصل ہو جاتا ہے کہ اگر کبھی کبھار اس کا دل چاہے تو مروجہ بحروں کو الٹ پلٹ کر کے بھی دیکھے۔ اور پھر تجربہ جب یہ ہو کہ ہر مصرعے میں ایک ہی التزام رکھا گیا ہو تو معترض کی شکایت کا کوئی جواز نہیں۔

جب میں نے تمہیں فنون (فن کی جمع) کئے اور تمہارے ہاں اپنے حقی صاحب بھی مل گئے تو جیسا کہ تمہیں یاد ہو گا میں نے مطلع سنا کر ان کی رائے مانگی۔ ان کا جواب تم نے بھی سن لیا ہو گا کہ "مجھے تو اس کی بحر میں کوئی قباحت محسوس نہیں ہوتی" —————
اور اب اپنے خط میں انہوں نے یہ بھی لکھ دیا ہے "بھائی، جہاں تک اس مطلع کا تعلق ہے اور اس میں آپ کے عروضی اجتہاد کا تو اتمام حجت میرے خیال میں وہیں ہو گیا تھا جب آپ نے کہا کہ یہ میرے اندر کی آواز ہے۔

تجریدی آرٹسٹ اس بات کا برا نہیں مانتے کہ آپ کو ان کی کوئی تصویر پسند نہیں آئی۔ وہ آپ کی انفرادی شخصیت کا اتنا ہی لحاظ کرتے ہیں جتنا اپنی انفرادیت پر اصرار" مگر آگے چل کر انہوں نے یہ بھی لکھا ہے کہ "تمہارے ہاں اوزان اور بحور میں اتنا تنوع ہے کہ تصرف کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔ بحور اور ارکان بحور میں برتے جانے والے زحافات کی افراط کے ہوتے مزید اختراعی کاوشیں تکلف بے جا نظر آتی ہیں —— پھر بھی میں کہتا ہوں کہ اختراع اور اجتہاد کا دروازہ بالکل بند نہیں ہونا چاہئے۔ ثبوت تو آپ

جانتے ہیں پڈنگ کے اندر ہوتا ہے"

جس طرح تم نے بحر کے سلسلے میں اپنی غلطی کا اعتراف کر لیا ہے اسی طرح مجھے بھی کھلے دل سے یہ اعتراف کر لینے دو کہ میں نے جو پڈنگ بنائی اس میں اپنے ذائقے کا (ذائقہ کا) خیال کیا۔ چاشنی اپنی زبان کا مزاج دیکھ کر تیار کی۔ یعنی چینی یا تو زیادہ کر دی ہے یا کم رکھی ہے اور مٹھائی کے تین نام ور اور مہذب شائقین (قاسمی - حقی - خواجہ) کے کام و دہن کو آزمائش میں ڈال دیا ہے۔

مگر یہ بھی ایک اٹل حقیقت ہے کہ حلوا فروش نے تمام جزویات ترکیبی صد فی صد صحیح استعمال کئے ہیں۔

اس خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے (جسے تم جیسا بانکا محقق بلا تحقیق مانتا ہے کہ دلیل و حجت سے بات بگڑ بھی سکتی ہے) اور اس رسولؐ کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ (جسے مجھ جیسا مشکوک شاعر بے چون و چرا' بے قیل و قال' بے لیت و لعل مانتا ہے۔ گویا ہم دونوں نے کم از کم ان دو ذاتوں کے بارے میں اپنی اپنی دوغلی پالیسی بنا رکھی ہے) ہماری اصل بحث جو غزل کی بحر کے بارے میں تھی اپنے فطری اختتام تک پہنچی۔ قاعدے سے (قاعدہ سے) مجھے یہ خط یہیں ختم کر دینا چاہئے تھا مگر اپنے تازہ خط میں (مورخہ 94 - 2 - 13) تم نے ایک فروعی (ضمنی) بات میرے معزز مہمانوں (غالب و اقبال) کے حوالے سے ایسی لکھ دی ہے کہ مزید دو چار جملوں کا جواز نکل آیا ہے۔ تم نے جانا" بوجھا" (ایجاد بندہ اگرچہ گندہ) میرے خط کی تمام دلائل کو اپنے لاشعور کی لائبریری کے طاق نسیاں میں ڈال کے اب یہ شوشہ چھوڑا ہے کہ غالب و اقبال کی غزلیں تو بحر رجز مطوی مخبون میں ہیں نہ کہ بحر بسیط مثمن سالم میں۔ ہیہات کہ واعظ تنگ نظر نے مجھے ناداں سمجھا۔ (علامہ حضور' تصرف کی معافی)۔ تمہاری اس چال بازی سے مجھے وہ مکے باز (Boxers) یاد آئے جو میچ ہار جانے کے بعد' آخری رائنڈ کے خاتمے کی گھنٹی سننے کے باوجود' چلتے چلتے ایک پوائنٹ اسکور کرنے کے لئے آخری گھونسا مار جاتے ہیں۔ مگر اے میرے راج دلارے' مجھے یہ کہنے دو کہ You have missed the point - غالب اور اقبال غریب خانے پر اس لئے نہیں آئے تھے کہ وہ مجھے رجز اور بسیط کا فرق بتائیں بلکہ انھیں اس لئے مدعو کیا گیا تھا کہ

ان کی بحر رجز میں لکھی گئی غزلوں کے بعض مصرعوں کی تقطیع بحر بسیط میں بھی کی جا سکتی ہے بالکل اسی طرح جس طرح بحر بسیط میں لکھی ہوئی میری غزل کے بعض مصرعوں کی تقطیع بحر رجز میں بھی کی جا سکتی ہے۔

اور میں نے نہایت عیاری سے صرف انہی مصرعوں کا حوالہ دیا تھا جن کی تقطیع دونوں بحروں میں کی جا سکتی ہے۔ اقبال کا وہ مصرعہ ۔ ایسی نماز سے گزر ایسے امام سے گزر' تو تم بالکل ہی کھا گئے جس کی تقطیع میری بحر میں بھی ہو سکتی ہے (ایسی نما۔ مستفعلن ۔ زسے گزر۔ مفاعلن۔ ایسے اما۔ مستفعلن ۔ م سے گزر ۔ مفاعلن۔) مگر دوسرے مصرعے ۔ مصرو حجاز سے گزر' پارس و شام سے گزر' میں یہ اڑنگا لگا دیا کہ "اس مصرعے کا پہلا ٹکڑا تو مستفعلن مفاعلن میں پڑھا جا سکتا ہے لیکن دوسرا ٹکڑا قیامت تک اس وزن میں نہیں پڑھا جا سکتا"۔ تو مژدہ دیتا ہوں کہ قیامت بھی آ گئی ہے اور پڑھا بھی جا سکتا ہے۔ تمہاری حتمیت کا انحصار اس بات پر ہے کہ لفظ "پارس" کا تلفظ صرف "پارس" ہے " پارس" نہیں۔ مگر حقیقت اس کے برعکس ہے۔ دیکھو نوراللغات حصہ دوم نیر پریس لکھنؤ مطبوعہ رجب 1347ھ اب کھولو صفحہ نمبر 7 اور پڑھو یہ عبارت "یہ لفظ فارسی شعرا کے کلام میں بیشتر ۔سکون حرف سوم اور اردو شعرا کے کلام میں بفتح حرف سوم ہے"

یہاں لفظ "بیشتر" پر بھی دھیان ضروری ہے یعنی فارسی شعرا نے بھی اس لفظ کو دونوں طرح باندھا ہو گا۔ تحقیق تمہارا منصب ہے اس لئے تمہاری ڈیوٹی لگا رہا ہوں کہ کام سے لگ جاؤ اور اپنے کتب خانے کی کرم خوردہ اور گرد آلودہ فارسی کتابوں کی ورق گردانی شروع کر دو اور دو سال بعد یا دس سال بعد مجھے خبر دو کہ کس کس نے کہاں کہاں کیسے کیسے باندھا ہے۔ مجھے صرف یہ کہنا ہے کہ علامہ اقبال' مشفق خواجہ نہیں تھے وہ اردو اور فارسی دونوں زبانوں کے شاعر تھے' ناممکن ہے کہ انھیں اس لفظ کے دونوں تلفظ معلوم نہ ہوں۔ مگر اس سے الگ' میں نے اپنے رویے کی مدافعت میں غزل سے جدا کر کے جس طرح اس مصرعے کا استعمال کیا ہے وہ بھی بالکل صحیح ہے اور اس کو یوں بھی پڑھا جا سکتا ہے (پارس وشا۔ مستفعلن۔ م سے گزر۔ مفاعلن۔) اور یہ تو خود تم ہی لکھ چکے ہو کہ مصرعے کا پہلا ٹکڑا اس وزن میں بھی ہے۔

اب مرزا نوشہ کی طرف لوٹو۔ یہاں بھی تم میرا لکھا ہوا غالب کا وہ مصرعہ ہڑپ کر

گئے جس کی تقطیع میری بحر میں بھی ہو سکتی ہے (بوسے کو پو' —— مستفعلن ——
چھتا ہوں میں۔ مفاعلن۔ منہ سے مجھے۔ مستفعلن - بتا کہ یوں۔ مفاعلن) مگر دوسرے
مصرعے کے تعلق سے میری جان کو آ گئے کہ "موج محیط نہیں محیط آب ہے" شارحین
غالب سے قطع نظر کرو اور دیکھو کہ آج اردو کے سیکڑوں ہزاروں شعرا اس مصرعے کو
دونوں طرح سے پڑھتے ہیں اور یوں کرنے سے مصرعے کے کم از کم دو ابعاد
(Dimensions) سامنے آتے ہیں۔ اگر "موج" پانی کے دریا میں ہاتھ پاؤں مارے یا "
دریا کی موج" پانی میں ہاتھ پاؤں مارے تو اس سے شعر کے معنی میں کتنا تغیر آیا؟ بلکہ "
موج محیط" سے ایک انوکھی بات یہ بھی سامنے آتی ہے کہ احاطہ کرنے والی موج۔ اس
سے مصرعے بلکہ شعر کا لطف دوبالا ہو جاتا ہے۔ پھر یہ نہ بھولو کہ مصرعہ میں نے نہایت
چابک دستی سے اپنی مدافعت میں استعمال کیا ہے اور غزل سے الگ کر کے۔ اس بات پر
بھی غور کرو کہ آگرہ کے "مطبع مفید خلائق" سے (جس کے مالک منشی شیونارائن تھے)
دیوان غالب 1863ء میں چھپا تھا (اور اس وقت میرے سامنے رکھا ہوا ہے) اس وقت
میرزا زندہ تھے۔ ان کا انتقال جیسا کہ تم جانتے ہو 15 فروری 1869ء میں ہوا۔ (بلکہ شاید
اسی وجہ سے انہوں نے کوچ کر جانے میں عجلت کی کہ دیوان چھپ چکا تھا اور ایک تم ہو
کہ دیوان چھپوانے کے باوجود میرے سینے پر مونگ دلنے کے لئے بیٹھے ہوئے ہو۔ شرم
کرو۔) اس کتاب میں بھی (یعنی 1863 والا مطبوعہ دیوان) اس مصرعے میں نہ موج کے
نیچے زیر ہے نہ محیط کے نیچے۔ یہ صرف اس لئے لکھا ہے کہ غزل سے الگ کر کے
مصرعے کا وہ جواز بھی نکال لوں جو میرے مسلک کی پیروی کرے۔ مگر ایک لطیفہ بھی سنتے
چلو۔ تاج کمپنی لمیٹڈ' لاہور نے جولائی 1938ء میں جو دیوان شائع کیا (وہ بھی اس وقت
میرے سامنے پڑا ہوا ہے) اس میں موج کے نیچے بھی زیر ہے اور محیط کے نیچے بھی۔ شاید
انہیں اس بات پر غصہ آیا کہ "مطبع مفید خلائق" والوں نے غالب کے مصرعے کے ساتھ
سخت زیادتی کی اور انتقامی کارروائی ضروری ہے۔ یا شاید ان کے ذہن میں یہ ہو کہ دہری
اضافت لگا کر یہ قصہ ہی ہمیشہ کے لئے ختم کر دیا جائے اور ایک ہی وار میں' معنی' مشفق
خواجہ اور ساقی فاروقی' تینوں کو ہلاک (اور ذلیل بھی) کر دیا جائے۔

چونکہ قاسمی صاحب نے اہل لاہور کی خوشنودی کے لئے میرے پچھلے طویل خط کو

پڑھ کر سنا ہی دیا ہے اس لئے مناسب ہے کہ ہم تینوں کی موشگافیاں سامنے آ جائیں میں نے قاسمی صاحب اور تمہاری خواہشوں (بلکہ احکامات) کو مدنظر رکھ کے اپنے خطوں سے گالیاں نکال دی ہیں۔ صرف دکھ یہ ہے کہ کئی فقروں سے روانی (Flow) جاتی رہی۔ مگر اب میں کتنے محاذوں پر لڑوں۔ خدا کرے تم جیسے خون خوار میری گردن پر ہمیشہ بیٹھے رہیں۔

تمہارے اصرار پر تین مہینے کی طویل مدت کے لئے شراب چھوڑ دی ہے شرط یہ ہے کہ ہر مہینے تمہارا کم سے کم ایک خط ضرور آتا رہے۔ جس طرح کی محبت تم مجھ سے کرتے ہو اس کا تقاضا یہ ہے کہ تین تین مہینے تک مجھے بھول نہ جایا کرو کہ میں تمہاری تحریر کے لئے ترستا رہتا ہوں ورنہ پھر شراب شروع کر دوں گا۔

ارے ہاں، تمہارے ایک فقرے کا قرض تو مجھ پر باقی ہی رہ گیا۔ ذرا اپنا دایاں کان قریب لاؤ ——— نہیں نہیں بایاں کان (شکریہ طارق خواجہ) قریب لاؤ تو ایک بات کہوں۔ تمہارا علم عروض کیسی ہے۔ (عربی والا کیسی اردو والی کیسی نہیں) جب تک یگانہ کی "چراغ سخن" ہاتھ میں نہ ہو تم اندھیرے میں ٹانک ٹوئیے مارتے رہو گے۔ میرا علم عروض خلقی ہے۔ میرے پاس عروض کی کوئی کتاب موجود نہیں مگر میری ذات میں آہنگ کے تمام چراغ روشن ہیں۔ اب اجازت دو۔ بقیہ فقرہ بازی اگلے خط میں کروں گا۔

پیار دلار۔ تمہارا

ساقی

مجاز
(ایک حلقہ کہ زنجیر کا حصہ نہ بن سکا)

اس مضمون کے تار و پود میں میرے ذاتی تاثرات اور محسوسات کا بڑا دخل ہے۔ مجھ سے کسی بھاری بھرکم بات کی توقع رکھنا یوں بھی زیادتی ہے۔ اس لئے اگر آپ نے ازراہ کرم اس مضمون کو پڑھنا شروع کر دیا ہے۔ تو اب اس ندامت کے لئے بھی تیار رہئے جو بے چینی سے آپ کی منتظر ہے۔

سوال یہ ہے کہ وہاں سے جہاں اقبال نے ہماری نظم کو چھوڑا تھا مجاز اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے کہاں تک لے گئے۔ اس مرحلے سے اگر ہم ذرا آہستہ روی سے گزریں تو نامناسب نہ ہو گا۔ اس لئے کہ یہی نرمی اور نرم خرامی کم و بیش ان کے کلام کا پہلا تاثر ہے کہ یہ شاعر گوہر درد چھپائے چھپائے پھرا۔

میری حقیر رائے میں مجاز، فیض سے کہیں کم درجے کے شاعر ہیں۔ بات الجھ جائے گی اگر میں یہ واضح نہ کروں کہ جہاں تک جذبے کی روح کو شدت سے محسوس کرنے اور احساس کی آنچ میں سلگا کر اسے برتنے کا سوال ہے مجاز کا قد فیض سے کچھ نکلتا ہوا ہی ہو گا، اس کے باوجود مجاز نے ہمیں جو کچھ دیا وہ صرف اتنا ہے۔

اے غم دل کیا کروں اے وحشت دل کیا کروں

اور جب اس کا کوئی جواب نہ ملا تو انہوں نے اپنے ہاتھوں سے خود کو زخمی کر لیا۔ ان کے ناز اٹھانے والے بہت تھے لیکن تہمت اٹھانے والا کوئی نہ تھا۔ کاش وہ خود ہی اپنی اور اپنی زندگی کی تہمت اٹھا سکتے اور موت کی آواز سن کر ایک وحشت کے سے انداز میں

اس کی طرف نہ دوڑ پڑتے۔ وہ ابھی اپنی آواز کے تعاقب میں تھے اور اس سے پہلے کہ وہ اسے پا لیتے انہوں نے اسے کھو دیا۔ نیز ان کی شاعری ایک ایسے کھلنڈرے لڑکے کی شاعری معلوم ہوتی ہے۔ جسے بزم آرائی تو آتی ہے لیکن جب وہ تنہا ہوتا ہے تو اس کے چہرے پر اتنی گہری اداسی برسنے لگتی ہے کہ اس کی طرف دیکھنے والی آنکھیں سحرزدہ ہو جائیں۔۔

ہم پر ہے ختم شام غریبان لکھنؤ

لیکن یہ سحر زیادہ دیر تک قائم نہیں رہتا کیونکہ ان کے یہاں ایک ہی جذبے اور احساس کی تکرار اس قدر ہے کہ جی بولانے لگتا ہے اور علم اور مشاہدے دونوں کی کمی بری طرح کھٹکنے لگتی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ ایک سے لمحوں اور ایک سی یادوں کو بار بار Recall کرتے تھے اور دوسرے لمحے ان کی گرفت سے باہر تھے اس کی وجہ شاید یہی ہوگی کہ دوسرے لمحوں سے ان کی شناسائی بس واجبی واجبی سی تھی۔ انہوں نے پانچ نظموں کے علاوہ ہماری نظم کو کچھ بھی نہیں دیا اور یہ پانچ نظمیں بھی ایسی کہ ان میں سے چار پر خط تنسیخ کھینچا جا سکتا ہے، حالانکہ ان کے قتل پر میں ایک بار ضرور آنسو بہاؤں گا۔ لیکن کیا کیا جائے ادب میں جذباتی ہونے سے کام نہیں چلتا۔ اب لے دے کر ان کے یہاں ایک نظم رہ جاتی ہے —— آوارہ —— اسے سینے سے لگایئے یا آنکھوں سے۔ یہ نظم اپنی بے شمار خوبیوں اور لطافتوں کے باعث اردو میں ہمیشہ زندہ رہے گی اور اس کا رس پڑھنے والوں کے رگ و پے میں اترتا چلا جائے گا۔ یہ نظم یوں تو ایک ذاتی المیہ ہے لیکن یہ ایک آدمی کی آواز نہیں ہے، یہ ایک دل کی دھڑکن نہیں ہے، یہ سارے برصغیر کی آواز ہے، یہ تمام انسانوں کی آواز ہے —— دکھی آواز۔ قید خانے میں محصور آواز۔ ایک کراہ۔ ایک خوابناک طلسم اور اس طلسم کی شکست۔ یہ کسی ایک ذات کا مسئلہ نہیں تھا۔ یہ کسی ایک ذات کا مسئلہ نہیں ہے۔ ہماری زمین عین ہنگام وصال میں جدائی پر مجبور کی گئی تھی اس لئے آج تک کراہتی ہے۔ یہی کراہ اس کی اصل آواز ہے چنانچہ اس کے اثرات بھی ابدی ہیں۔ اسے پا لینا بڑی بات ہے یہی ادب ہے یہی بڑا ادب ہے۔ جہاں تک اسلوب کا تعلق ہے مجاز کے یہاں Varieties نہیں ملتیں۔ مسدس، قطعے، غزلیہ نظمیں اور مثنوی —— وہ اپنے پیش رووں کے انہیں سانچوں میں حروف

ٹانکتے چلے گئے ہیں۔ اسلوب کا صرف ایک تجربہ ان کے یہاں ملتا ہے۔ تین ہمقافیہ مصرعوں کے بند کا، جس میں وہ پوری طرح کامیاب ہیں ——— "ان کا جشن سالگرہ"، "اندھیری رات کا مسافر"۔ اور "آوارہ" اس کی زندہ مثالیں ہیں۔

ایک بات اور، یہ کوئی کلیہ نہیں لیکن جب خیال اور جذبے کے سوتے خشک ہو جایا کرتے ہیں اس وقت اسلوب اور Pattern کی نئی راہوں کی تلاش ہوتی ہے۔ ہمیں تعجب ہوتا ہے جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ مجاز کی شاعری کے پیچھے کوئی بہت بڑا اور طاقتور جذبہ یا خیال بھی نہیں ہے اور نئے pattern کی تلاش بھی عنقا ہے۔ میرے کہنے کا ہرگز یہ مطلب نہیں ہے کہ لکھنے سے پہلے ایک خاص سانچہ ڈھال کر اس میں حروف سجا دیئے جائیں۔ سچے جذبے کی نکاسی کے لئے ادھر ادھر ہاتھ پاؤں مارنے کی چنداں ضرورت نہیں کہ وہ اپنا سانچہ اپنے ساتھ خود لے کر آتا ہے۔ پھر یہ بھی دیکھتے چلئے کہ عشق اور زندگی کے بارے میں ان کا رویہ کیا ہے اور آیا انہوں نے سوچنے اور سمجھنے کی کوئی راہ ہمارے لئے نکالی بھی ہے یا نہیں۔

صرف دو جملوں میں ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ زندگی کے بارے میں انکا زاویہ نظر بہت محدود اور کمزور ہے اور وہ زاویہ نظر بھی مجاز کا نہیں بلکہ اس کی اساس کسی نہ کسی vision Dictated پر ہے۔ راج سنگھاسن ڈانواڈول۔ پاکستان کا ترانہ۔ آج جھنڈا ہے ہمارے ہاتھ میں۔ ان کے رویہ میں بڑے الجھاوے ہیں اور ان کا کوئی واضح رویہ سمجھ میں نہیں آتا۔

اب رہا عشق کا کٹھن راستہ تو ادھر سے گزرنے کے لئے میر اور نزدیک والوں میں حسرت موہانی سے چھوٹا آدمی نہیں ہونا چاہئے۔ اسباب لٹا راہ میں یاں ہر سفری کا۔ یہاں سے اپنا دامن بے داغ بچا لے جانا بچوں کا کھیل نہیں۔ دیدۂ بینا نہ ہو تو آدمی کھیت ہی رہتا ہے۔ مجھے ایسا عشق کچھ عجیب سا لگتا ہے جس میں محبوب سے یہ فرمائش کی جائے کہ وہ اپنے آنچل سے ایک پرچم بنا لے۔ جو شخص اپنی محبوبہ کا آنچل چھین کر اس سے پرچم بنانا چاہے وہ ایک جاں نثار محب وطن بھلے ہو جائے۔ مگر اسے عشق کرنے کا کوئی حق نہیں۔ مجھے یہ سب کچھ جھوٹ معلوم ہوتا ہے یہ مجاز کی آواز نہیں ہے۔ یہ مجاز کی آواز ہو ہی نہیں سکتی۔ یہ خول مجاز نے کیوں اوڑھ رکھا تھا؟ اس کی دو ہی وجوہات سمجھ میں آتی

ہیں ایک خوف دوسری مصلحت ——— اور یہ دونوں چیزیں کم سے کم ادب کے لئے سم قاتل ہیں کہ یہ شخصیت کے سچے اظہار کی راہ میں ایک آہنی دیوار کی طرح کھڑی رہتی ہیں اور آدمی کا اصل چہرہ زیرِ نقاب رہتا ہے۔ کیونکہ لکھنے والا جب تک اپنی شخصیت اور اس پر مرتب شدہ حالات کے اثرات کا اظہار بھرپور طریقے سے نہیں کرے گا وہ ان لمحوں میں تحلیل ہو جائے گا جو پیش رووں کا اجارہ ہے۔ اور جن سے اس کے اگلے بھی گزر چکے ہیں۔ مجاز نے ہماری نظم میں کیا اضافہ کیا اب اس کا فیصلہ میں آپ پر چھوڑتا ہوں۔

نگاہ قہر آسا اور مصرعہ مخدوم

اگر اس امر کو خود ستائی یا غیر ضروری انانیت پر محمول نہ کیا جائے تو میں یہ کہنا چاہوں گا کہ میں 1857ء کے اوائل تک ترقی پسند شعراء کی تحریک اور ان کے لب و لہجے کے اثرات سے آزاد ہو چکا تھا۔ اتفاق سے یہ وہی سال ہے جب ترقی پسند مصنفین کی تحریک نے اپنی زندگی کے 21 سال پورے کئے اور میں نے بھی اس کے ساتھ بائیسویں برس میں قدم رکھا۔ میری بدقسمتی کہ اردو ادب میں ترقی پسند مصنفین کی انجمن کے قیام کا وہی سال ہے جو میری پیدائش کا سال ہے۔ یعنی 1936ء اس طرح ہم دونوں ایک ہی سال معرض وجود میں آئے۔

گو کہ میں ترقی پسند شعراء کے اثرات سے کلیتا آزاد ہونے میں کامیاب ہو چکا تھا مگر ان کے طریق فکر یا ان کے نظریات سے علیحدگی نہیں اختیار کی تھی کہ یہ دردمند لوگ تھے اور ایک بہتر معاشرے اور بہتر مستقبل کے خواہاں۔ یہی وجہ ہے کہ جتنا ہی ہماری تیسری دنیا اور خاص طور پر ہمارا براعظم ایشیا مفلسی و ناانصافی کے جال میں پھنستا گیا اتنا ہی میں ذاتی طور پر بائیں بازو کے نظریات سے قریب ہوتا گیا۔ اب صورت حال یہ ہے کہ میں ایسے تذبذب' مایوسی یا قنوطیت میں گھرا ہوا ہوں کہ ڈر لگتا ہے کہیں کسی صحت مند رجحان کے فقدان کی بنا پر محض مزاج کا علمبردار بن کر نہ رہ جاؤں۔

چونکہ اس طرح کے تفکرات میں مبتلا ہونے۔ اور اس کے نتیجے میں ترقی پسندوں کے مخصوص رجحانات پر بیدلی سے نظر ڈالنے سے کوئی خاص فائدہ نہیں ہے اس لئے میں عجیب گومگو میں مبتلا ہوں۔ اگر ماضی قریب پر نظر ڈالوں تو ترقی پسند احباب کے گمراہ کن رجحانات مجھے ان سے دوری پر اکساتے ہیں کیونکہ ان تمام حضرات کے طریق کار' یعنی

معروضی کے بجائے غیر حقیقی، شعری اخلاص کی جگہ صحافتی مصالح، تدریس و تنظیم کی جگہ بد نظمی سوالوں کے بجائے محض جوابوں میں غلطاں رہنے یا ابہام، تشکیک کی جگہ قطعیت کے استعمال نے "صداقت کل" کو عصری تذبذب کی قربان گاہ پر بھینٹ چڑھا رکھا ہے۔ اس سلسلے میں ان تمام حضرات نے بہت سے پاکیزہ، محترم یا آفاقی نوعیت کی تفہیم سے بھرپور الفاظ کی بے حرمتی کو بھی اپنا شعار بنا لیا اور یہ کچھ اس طرح ہوا کہ ہر معنی خیز اور بھرپور اصطلاح اور ترکیب کی نوعیت محدود ہو کر رہ گئی۔ مثلاً رات کا تصور صرف برطانوی سامراج سے رہائی اور سحر کے معنی روسی انقلاب بن کر رہ گئے۔ انفرادی طور پر فنکاروں نے شعریات و جمالیات سے قطع نظر کر کے جبری نوعیت کے آدرش اپنائے اس کو آپ خواہ ایک آمرانہ نظریہ کہیں یا نظری آمریت مانیں مگر حقیقت امر یہ ہے کہ شکست ذات یا تسلیم انا کا نتیجہ شاعر اور شعریت کی موت ہی ثابت ہوا۔ لہٰذا یہ ذکر کہ فرسودہ نظریات و تصورات کی کوربیں و کوتاہ نظر تقلید نے گھسے پٹے جملوں، ترکیبوں اور سیاسی نعروں کی وضع کی تراکیب کو ادب کا مقام عالی عطا کرنے میں ہاتھ بٹایا، اب غیر ضروری سا لگتا ہے۔

فن شعر جیسا کہ میں سمجھتا یا برتتا ہوں تکمیل شخصیت کے کماحقہ، اظہار ہی نہیں بلکہ خود زمزمہ ہائے حیات کی رنگ آمیزیوں سے عبارت ہے۔ کہا جا سکتا ہے کہ شاعر ایک مخصوص تاریخی تناظر ہی کی پیداوار ہوتا ہے لیکن معنی اس کے یہ ہرگز نہیں کہ وہ ہمیشہ ایک ہی محور پر مقیم رہے۔ اس کو تو ہمہ وقت ایک طرح کی حالت سفر ہی میں رہنا چاہیے بلکہ اور آگے بڑھ کر نئے امکانات، نئے جہان معنی اور نئے تصورات زمان و مکان سے ہم آہنگ ہونے کی کوشش کرنا چاہیے اور اسی کے ساتھ پھر اس کا منصب یہ بھی ہے کہ "لاشعور" اور "نامعلوم" سے بھی دست و گریباں رہے۔

مگر ایک عجیب مشکل یہ ہے کہ فیض، مخدوم، مجاز، سردار جعفری، اس زمانے کے ندیم، ساحر، کیفی، دامن، نیاز اور مطلبی وغیرہم کے بے آب و گیاہ نہاں خانوں کا جائزہ لیجیے تو صرف چند گنے چنے تصورات یا اصطلاحات ہی ہاتھ لگتے ہیں۔ گویا صلیب، دار، مقتل، سویرے، درانتیاں، کارخانے، جنتا اور عوام وغیرہ ہی ترقی پسندی کی اصل تعلیمات ہیں۔

ہمارے ترقی پسندوں نے اپنی ژرف نگی کو کچھ اس طرح محدود کر دیا کہ پھر ان کے پاس پابلو نرودا۔ پارا بریخت۔ آڈن اور اسپنڈر کی طرح کی نظریاتی وابستگیوں اور فکری

جمات کی طرف رسائی کا کوئی ذریعہ ہی نہیں رہ گیا۔ مذکورہ شعرا اپنی تمام وابستگیوں کے باوجود فنکارانہ کاوشوں میں نہ تو ذوق حسن و زیبائی سے محروم ہوئے اور نہ انہوں نے بنیادی لوازم شعری یعنی شائستگی جمال و شوکت الفاظ کو سنسنی خیزی و جذبات پرستی پر قربان ہونے دیا۔

پھر بھی میں اس تحریک کے دو شاعروں' فیض اور مخدوم کا بہت قائل ہوں۔ فیض تو اپنی نسل کی خوبصورت ترین آواز بن کر ابھرے اور دوسری طرف مخدوم بھی اپنے ہم عصروں یعنی علی سردار جعفری اور احمد ندیم قاسمی سے ذرا بہتر شاعر ثابت ہوئے۔ سردار جعفری اور قاسمی بالترتیب اپنے اپنے ملک کا ہندوستان اور پاکستان میں بہترین ثانوی یعنی Second best نواپیراؤں میں ہیں۔

فیض کی دھوم دھام سے قطع نظر' جس کے بارے میں اپنے برے بھلے طریقے سے میں متعدد بار لکھ چکا ہوں اور اپنے اور فیض کے منبع فکر کا جواز پیش کرتے ہوئے اپنی تلخ نوائی کا اظہار بھی کر چکا ہوں' میں مخدوم کی شخصیت سے بہت متاثر ہوں جن کی ایمانداری' اخلاص فکر اور جرات اظہار نے نہ تو ارباب اقتدار سے کسی طرح کی مفاہمت کی اور نہ تعاون مصلحت سے کام لیا۔ وہ ہمیشہ مصروف جہد اور مائل پیکار رہے اور دوسروں کی طرح میدان چھوڑ کر نہیں بھاگے اور یہ بات اپنی جگہ پر واقعی قابل ستائش ہے۔

مخدوم کی شاعری کا تین چوتھائی حصہ اگر کاٹ کر پھینک دیا جائے تو میں واویلا نہیں کروں گا۔ مگر اس کے بعد ان کے پاس جو کچھ اندوختہ رہ جاتا ہے وہ بھی "بہت کچھ" اور اپنے معاصروں کے مقابلے میں قابل ستائش ہے۔ یہی "بہت کچھ" ان کا سرمایہ افتخار بھی کہا جا سکتا ہے۔ مخدوم کے یہاں ایک طرح کی نغمگی ہے جو میرے خیال میں موسیقیت کے عرفان اور الفاظ کے صحیح استعمال اور ان کی حرمت کے احساس کی غماز ہے۔ مثلاً یہ کہ ان کا مصرعہ "رات کے ماتھے پر آزردہ ستاروں کا ہجوم" محض ایک سیاسی بیانیہ نہیں بلکہ ایک مخصوص ترنم اور آہنگ کا آئینہ دار ہے۔ یہ آہنگ ہم کو تجسیم و معانی کے باب میں کسی طرح کی ژولیدگی فکر کا احساس نہیں دلاتا۔

میں نے یہاں الفاظ کی تفہیم کی طرف جو اشارہ کیا ہے اس کے بارے میں اپنے

موقف کی وضاحت کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔

ذرا مصرعے پر توجہ فرمائیے:-

"رات کے ماتھے پہ آزردہ ستاروں کا ہجوم"

"آزردہ" اور "افسردہ" تقریباً ہم معنی الفاظ ہیں ان کی موسیقیت اور عروض کے ارکان بھی یکساں ہیں۔ پھر بھی مخدوم نے "افسردہ" کے استعمال سے گریز کیا ہے اور اس مصرعے میں بہت ہی شعوری طور پر "آزردہ" بطور ایک نگینے کے سجایا ہے۔ کیونکہ آزردہ میں ایک لفظ "زرد" بھی بڑی مہارت سے کھپا ہوا ہے (میں نے یہاں دیدہ و دانستہ "پوشیدہ ہے" کی ترکیب کے بجائے "کھپا ہوا" استعمال کیا ہے) کیونکہ اس لفظ آزردہ کے استعمال سے "زردی" یا چہرے کی بیرنگی اور اس کے نتیجے میں ایک بہت مغموم گہرائی کا احساس ملتا ہے جو لفظ افسردہ کے استعمال سے پوری شدت کے ساتھ نمایاں نہیں ہو سکتی تھی۔ ایک ہی لفظ کے استعمال سے تین کیفیات کا اظہار مصرعے کی معنی آفرینی کی "شش جہات" بنانے پر قادر ہے۔ اسی کے ساتھ ماحول آفرینی بھی اس ہمہ گیر کیفیت کے ساتھ آئی ہے کہ پوری ایک تصویر اپنی تہ در تہ رنگ آمیزی کے ساتھ ابھرتی ہے (احساس ہم کو اس مصرعے پر سر دھننے سے کانسٹبل کی پر سکون اور خزاں آلودہ سہ پہر کا نہیں بلکہ فان گاخ کی چٹیل نمناکی کا ہوتا ہے) (-) چنانچہ اس مصرعے کو پوری طرح سمجھنے کے لئے تاثراتی مصوری کی نزاکتوں کا ہلکا ادراک بھی ضروری ہے الفاظ کے ترنم میں جو تجنیس صوتی پنہاں ہے وہ شعوری سے زیادہ اتفاقی کہی جا سکتی ہے۔ صرف حرف "ت" کے تین بار استعمال ہی سے موسیقیت اس کمال سے جلوہ فرما ہوئی ہے کہ ہم کو دوارژاک (Dvorak) کے اونچے سروں کے بجائے مالا (Mahler) کی نرم شہد آگینی و وجد آفرینی کا سا تجربہ ہوتا ہے۔ اگر "رات" "ماتھے" یا "ستاروں" کا استعمال ایک دوسرے سے ذرا "قریب" ہوتا یا "ت" پر کسی طرح کا مزید زور پڑتا تو پورے مصرعے کی ترنم انگیزی ساقط ہو جاتی۔ ترتیل صوت یا ہم آہنگی "جوز" (آزردہ) میں (ستاروں) اور ج (ہجوم) سے پیدا ہوئی ہے اور جس ترتیب سے آئی ہے وہ اقلیدس کی لکیروں اور زاویوں کی طرح اتنی چست ہے کہ اگر کوئی خط یا زاویہ ذرا بھی ادھر ادھر ہو جائے تو پورا مرقع Pattern ہی بد نظم ہو کر رہ جائے گا۔ لفظوں اور حرفوں کا اتنے قرینے اور شعور و فن کے ساتھ استعمال

مخدوم کی بے مثال فنکاری اور مہارت پر دال ہے۔ یہاں لفظ "ماتھے" کے استعمال پر بھی غور ضروری ہے۔

اب دیکھئے لفظ "ماتھے" کو اس کی تکنیکی چستی کے تناظر میں۔ اس لفظ میں حرف "الف" کا استعمال صنعت گری کا نمونہ ہے کیونکہ اس سے ایک طرح کے توازن کا احساس ہوتا ہے جبکہ دوسرا کوئی اور حرف اس توازن کا احساس ہی مجروح کر کے رکھ دیتا۔ پھر اب استعارے پر غور فرمایئے۔ ایک طرف تو رات کا بیان ہے اور دوسری طرف اس میں ستاروں کے ہجوم کا بھی ذکر حالانکہ مصرعہ بجائے خود نہ تورات کے متعلق ہے اور نہ اس کا مقصد ستاروں کی جھلملاہٹ سے کسی رومانی تصور کا احساس دلاتا ہے۔ مقصد اصلی تو ایک خاموش گہرائی اور تنہائی کے بیکراں احساس کی غمگینی ہے۔ چنانچہ اس سے غم اور تنہائی کی ایک مکمل تجسیم جلوہ گر ہوتی ہے۔ پورا مصرعہ ہی انتہائی بلیغ ہے۔ شاعر اپنے فن اور منصب سے پوری طرح واقف ہے اور اسے یہ احساس و ادراک بھی ہے کہ بہت زیادہ معنی پرور یا پیغام بدوش ہونا بھی ایک نازک مصرعے کی شکست یا پوری نظم کے تاثر کو مجروح کرنے کا سبب بن سکتا ہے۔

مجھے لفظ "ماتھے" میں ایک طرح کے جھول کا بھی شائبہ ملتا ہے جس پر کسی قدر تاسف کرنا ناجائز بھی نہیں۔ (میں خود یک صوتی یا مفرد لفظ "مانگ" کا انتخاب کرتا جس سے "ت" کی خوبی تو ضرور قربان ہو جاتی مگر چستی اور زیادہ بھرپور ہو جاتی) لیکن یہ بھی شاید میری اپنی ہی خامی ہے کہ میں اپنے شاعروں سے ضرورت سے زیادہ توقعات وابستہ رکھتا ہوں یا یوں کہئے کہ غیر ضروری مطالبے کرتا رہتا ہوں۔

(انگریزی سے ترجمہ - قیصر تمکین)

مضمون کے مفہوم کو سمجھنے سمجھانے کے لئے مجھے مصوری کا سہارا لینا پڑا۔ مترجم

ایک نرم آواز

جس کمرے میں آپ کھڑے ہیں یہ نقار خانہ ہے۔ اس سے باہر نکلنے کی کوشش کیجئے۔ دروازے پر ایک بلا آپ کی منتظر ہے جسے دنیا کہتے ہیں۔ خاموشی سے اپنے آپ کو اس کے حوالے کر دیجئے اور پلٹ کر پیچھے کی طرف دیکھئے۔ یہ ماضی ہے۔یعنی یہ وہ بلا ہے جو آپ کا تعاقب کر رہی ہے۔ اب ان دونوں بلاؤں کے درمیان اپنی تنہائی کا ادراک کیجئے اور اپنے اندر یہ سوال اٹھایئے کہ "ہم نے اس یادوں کے سفر میں کیا کھویا کیا پایا ہے" یہ اطہر نفیس کی شاعری ہے۔ یعنی یہ کسی غیر معمولی آدمی کی شاعری نہیں ہے بلکہ میری آپ کی طرح کے ایک سیدھے سادھے ٹوٹتے پھوٹتے ہوئے آدمی کے دکھ سکھ ہیں جو حسب استطاعت اس ٹوٹ پھوٹ کو اپنی ذات میں زندہ کر رہا ہے اور چھوٹی چھوٹی اجنبی سچائیوں کو اپنی روح میں تلاش کر رہا ہے۔

مگر اطہر نفیس کی شاعری تک پہنچنے کے لئے آپ کو کئی کرتب دکھانے پڑیں گے۔ شہرت زادوں کے نقار خانے سے نکلنا' دنیا کی رزم گاہ میں اپنے بے معنی وجود کے معنی ڈھونڈنا اور مواج ماضی کی لہریں اپنے اندر محسوس کرنا' پھر اپنے اندر یہ سوال اٹھانا۔ یہ ایسے مصائب ہیں جو آپ جیسے "جوش پسند" اور "فیض فہم" قارئین کو ناگوار گزرے ہوں گے۔ مجھے معاف کر دیجئے۔ اصل میں آج عام معافی کا دن ہے۔ تو مجھے بھی اجازت دیجئے کہ حالی سے لے کر آل احمد سرور تک اور مولوی نذیر احمد سے لے کر ڈاکٹر سید عبداللہ اور ابواللیث تک اور نیاز فتح پوری سے لے کر احتشام حسین اور پیر گمنامی سید مجتبیٰ حسین تک ان سب کو معاف کرتا چلوں جو پچھلی ایک صدی سے آپ کو باور کراتے آ رہے ہیں کہ ادب "معاشرہ سدھار" ہوتا ہے اور آپ جیسے نیک بے بصر قاری کی

آنکھوں پر دنیا بھر کی مقصدیت کے چشمے لگا دیئے ہیں اور آپ کی آنکھیں اتنی کمزور ہو گئی ہیں کہ آپ اپنی کوشش سے راستہ تلاش کرنے کے قابل نہیں رہے۔ آپ نے بھلے مانس نقادوں کے ہاتھوں پر بھروسا کر کے اپنے آپ کو بے جہت اندھیرے کے حوالے کر دیا ہے۔ ہجوم کی اداسی تو آپ کی سمجھ میں آتی ہے۔ مگر ایک تنہا ذات کے دکھ آپ کی توجہ اپنی طرف منعطف نہیں کرا پاتے۔ کیوں؟ میں پوچھتا ہوں آخر کیوں؟

اپنی یادوں میں غزل خواں اپنی دھن میں نغمہ ریز
اے ہجوم نازنیناں اک تماشائی بھی ہے

اور اس تماشائی کے دکھ آسانی نہیں ہیں۔ یہ نہ سمجھئے کہ وہ معاشرے سے بے خبر ہے وہ اسی معاشرے میں سانس لے رہا ہے جس نے اسے تنہا کر دیا ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ اس بے نام تماشائی کی سمجھ میں یہ بات آگئی ہے کہ معاشرے کی شکست و ریخت کے اظہار کے لئے ذرائع خارجی نہیں ہونے چاہئیں۔ بلکہ انہیں اپنے اندر ڈوب کر دیکھنا چاہیے۔ اپنی ذات سے کائنات تک پہنچنے کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ آپ CLICHE کے غبار میں گم نہیں ہونے پاتے۔ دوسرا یہ کہ خود اپنی ان کمینگیوں سے آگاہی ہوتی ہے جو آپ کے تحت الشعور میں انڈے بچے دیتی رہتی ہیں اور ادب کو جھوٹ کا پلندہ اور آپ کو ناآسودگی کا سراب بنا دیتی ہیں۔ مجھے رنج یہ ہے کہ آپ کا دل دھڑکنے کے انداز کھو بیٹھتا ہے۔ آپ بہت نامہذب ہو گئے ہیں۔ کبھی آپ کی روح سے ایسے شعروں نے بھی سرگوشی کی؟

خود اپنی وفاؤں میں بھی اغراض کے پر تو
پرچھائیں کی صورت سہی' آتے تو رہے ہیں

یا

عشق کرنا جو سیکھا تو دنیا برتنے کا فن آ گیا
کاروبار جنوں آ گیا ہے تو کار جہاں آئے ہیں

میں نے ابھی آپ کو نامہذب کہا ہے۔ آپ ملول نہ ہوں کہ شاید آپ کو میری بات سے اذیت پہنچی ہو۔ مگر خوشی کی بات یہ ہے کہ آپ پتھر کے بنے ہوئے ہیں اور آپ کو اذیت نہیں پہنچائی جا سکتی۔ اور شکر کا مقام ہے کہ میں اپنی بات پر شرمندہ نہیں ہوں۔

سبب اس کا یہ ہے کہ انیسویں صدی کے اس شعر سے لے کر

ہوا ہر آن میں آن دگر کا عاشق زار
وہ ایسے سادہ کہ سمجھے وفا شعار مجھے

بیسویں صدی کے اس شعر تک

خود اپنی وفاؤں میں بھی اغراض کے پر تو
پرچھائیں کی صورت سہی، آتے تو رہے ہیں

احساس کی بنیادی سچائی کا ایک سفر ہے آپ جس سے آگاہ نہیں ہیں۔ اصل میں آپ کی نشوونما میں تفریح اور تصنع کے عناصر غالب ہیں۔ سنا ہے پچھلے دنوں آپ نے امریکہ کے خلاف بڑا واویلا کیا۔ بڑا اچھا کیا۔ ظلم کے خلاف کہرام مچانا اہل نظر کا شیوہ ہے مگر وہیں امریکہ میں کچھ سوگوار لوگ بھی ہیں۔ آپ نے غلطی یہ کی کہ ان کی کراہوں کی طرف سے بھی پیٹھ موڑ کر کھڑے ہو گئے۔ پڑھنے، لکھنے، سوچنے اور محسوس کرنے سے آپ جیسے جویان تفریح کی بیزاری تسلیم، واقعی یہ بری باتیں ہیں مگر کبھی کبھی جب The Human Condition جیسی کتاب چھپے تو چونکنا ضرور چاہئے۔ امریکہ کی ایک بہت سوگوار روح ہیں۔ آنسہ حنا آرنٹ، یہ ان کی تصنیف ہے۔ اور اتنی ہولناک ہے کہ میرا رواں رواں کانپ اٹھا تھا، آپ کو شاید پڑھنے کی فرصت نہ ہو اس لئے دو چار فقرے اس کے مندرجات کے بارے میں لکھتا چلوں۔ انہوں نے کام کے چار درجے مقرر کئے ہیں۔ جہاں آدمی چار مختلف سطحوں پر زندگی کے مجاہدے میں سرگرم عمل ہے۔

Labour

Making

Activity

اور چوتھا لفظ مجھے یاد نہیں رہا شاید Contemplation ہے یا غالباً کوئی اور لفظ ہو مگر مترادف یہی ہے —— Labour وہ محنت ہے جو زندہ رہنے اور زندگی کو آسانیاں بہم کرنے پر خرچ ہوتی ہے جیسے روٹی بنانا، گیس اور بجلی فراہم کرنا۔ اور Making سے ان کی مراد اس محنت سے ہے جو دست کاری اور کاریگری میں صرف ہو رہی ہے —— Activity وہ محنت ہے جو سیاست دانوں، فوجیوں اور سائنس دانوں کے تصرف میں ہے

اور Contemplation کے زمرے میں وہ محنتیں آتی ہے جو فلسفی، صوفی اور شعرا وغیرہ کی تقدیر ہے اور یہی محنت کی سب سے بڑی سطح ہے جہاں آدمی خدا کے اقرار یا انکار، زندگی کے معنی اور سوسائٹی کے اقدار کی تلاش میں دکھ اٹھایا کرتا ہے۔ مگر وہ کلمی اس بات پر ہیں کہ ہماری نئی سوسائٹی اس چوتھی سطح کی محنت کو بھی فوری طور پر Consume کرنا چاہتی ہے اور ہر چیز گھٹ کر روز مرہ کی ضرورت بنتی جا رہی ہے اور ہمارے اندر کسی گہری سچائی کو جنم نہیں لینے دے رہی۔ آئندہ بننے والی سوسائٹی میں ادب اور شعر "Reduced" ہو کر ہماری تفریح کا سبب بن جائیں گے۔ فلم، ٹیلی ویژن کے ڈرامے، اس سال کی بہترین کتاب، اس مہینے کا بہترین ادب، یہ سب اسی کے کرشمے ہیں۔

مجھے Miss Hannah Arendt کا سہارا دو وجوہات کی بنا پر لینا پڑا۔ پہلی وجہ تو یہ ہے کہ آپ سمجھیں اور دیکھیں کہ آپ کتنے کھوکھلے اور بے معنی ہیں اور شاعری اور تفریح کے بنیادی فرق کو سمجھیں۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ شاعری کے ناتے مجھے عورت کا سہارا لینا پڑتا ہے۔ یعنی یہ کہ اس مکروہ ٹیکنیکل سوسائٹی میں محبت کی اولیت پر ایمان لانا ضروری ہے بغیر اس کے شعر نہیں لکھا جا سکتا۔ اطہر نفیس صاحب ایک ایسے شاعر ہیں جن کا قد مروجہ پیمانوں کے اعتبار سے خواہ کتنا ہی چھوٹا ہو مجھے ساحر، سردار، یوسف ظفر، قیوم نظر اور ایسے ہی بے شمار شاعروں سے زیادہ عزیز ہیں۔ اس لئے کہ وہ ساری عمر جھوٹ بول کر اپنا گزارا نہیں کرتے رہے ہیں بلکہ اپنے آپ کو کریدتے رہے ہیں۔ اور جب کبھی کوئی نئی چنگاری انہیں نظر آئی، انہوں نے اسے اپنے لفظوں میں اسیر کرنے کی کوشش کی ہے۔ میں انکے بارے میں کسی غلط فہمی میں مبتلا نہیں ہوں۔ وہ بڑے شاعر ہر گز نہیں ہیں۔ نہ ان کی شاعری میں یہ امکان ہے کہ وہ سارے عہد کو سمیٹ سکیں تو لگے ہاتھوں مجھے یہ بھی بتاتے چلیں کہ اردو کے کس زندہ شاعر میں یہ امکانات نظر آ رہے ہیں۔ مس حنا ارنٹ نے اصل میں مجھے بہت ڈرا دیا ہے، اب یہی دیکھئے تاکہ پچھلے چار پانچ مہینوں سے میں نے شعر نہیں لکھے شعر کہنے کی مجھے ہمت نہیں پڑ رہی ہے۔ میرے اندر جو آدمی مر رہا ہے اس کے دکھ کس کے حوالے کروں۔ کیا آپ کے؟ آپ جو مستقبل کی سوسائٹی کے افراد ہیں اور شاعری کو گھٹا کر تفریح کی سطح تک ذلیل کرنا چاہتے ہیں۔ مگر اطہر نفیس صاحب شعر کہہ رہے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ وہ آپ سے ابھی ناامید نہیں

ہوئے ہیں اور اپنے انفاس کی تازگی کے لئے شاید انہوں نے اپنی محبوبہ بھی بدل دی ہے۔
آپ کی سمجھ میں یہ بات نہیں آئے گی۔ مگر یہ آدمی کے زندہ ہونے کی نشانی ہے جب
احساس میں زنگ لگ جائے اور اظہار میں باسی یکسانیت آجائے تو اپنے آپ کو الٹتے پلٹتے
رہنا چاہیئے۔ یہی نہیں اس تبدیلی کو اپنے شعور میں محصور کر کے قبول کرنا چاہیے۔ جواز
نہیں ڈھونڈنا چاہیے، جی داری ہو تو کہنا چاہیے:

اپنے جنون خام کا اس کو بھی چل گیا پتا
اس کی طرف نہ جاؤ آج وہ ہے خفا گزر چلو

ہمارا اردو ادب دو قبیلوں میں بٹا ہوا ہے۔ پہلے قبیلے کی سرداری میر تقی میر نے کی
اور بعد میں اس میں ان لوگوں نے پناہ ڈھونڈی جو لٹنا جانتے تھے اور محبت کی زندگی پر
ایمان رکھتے تھے، اس میں چھوٹے بڑے سبھی نام آپ کو نظر آئیں گے مثلاً مومن، شاد،
فانی، حسرت، میرا جی، مجاز اور فراق وغیرہ اور ابتدائی غزلوں کی حد تک حالی بھی۔ دوسرے
گروہ کے امام اسد اللہ خاں غالب تھے۔ اور امام اول تک بات ٹھیک بھی رہی اس لئے کہ
انہیں موسیٰ جیسی جادوگری، اور عصا ملا تھا۔ لیکن دنیاداری اور محبت کو جس چالاکی سے
وہ شانہ بشانہ چلا گئے، ان کے بے تہہ ولیوں کے بس کی بات نہیں تھی، اور اس قبیلے میں
جو لوگ آئے وہ یا تو ہماری آپ کی پشیمانی کا سبب بن گئے یا آگے بنیں گے۔ مثلاً بعد کے
حالی،

نذیر احمد، جوش ملیح آبادی، سردار جعفری وغیرہ۔

طرز احساس کے اعتبار سے اطہر نفیس صاحب پہلے گروہ سے تعلق رکھتے ہیں اور
ممکن ہے ان کی شاعری میں وہ امکانات نہ ہوں جو ناصر کاظمی اور سلیم احمد میں ہیں۔ مگر یہ
کتنی خوش آئندہ بات ہے کہ وہ راستہ بھولے ہوؤں میں سے نہیں ہیں اور اگر ادب میں
سچائی نام کی کوئی چیز ہے تو یاد رکھنا چاہیے کہ:

وہ نظر آج بھی کم معنی و بیگانہ نہیں
اس کو سمجھا بھی کرو اس پہ بھروسا بھی کرو

سردار جعفری

(ایک سپاس نامہ)

جناب والا!

سب سے پہلے تو مجھے کہنے دیجئے کہ عمر کی اس منزل پر پہنچ کر آپ نے وہ کام کیا جو میں کبھی نہ کر پاؤں گا۔ خدا آپ کو ہمیشہ زندہ رکھے۔ اکیسویں صدی آپ کا انتظار کر رہی ہے۔

اس طویل سفر میں آپ نے دکھ بھی اٹھائے ہیں اور سکھ بھی دیکھے ہیں۔ اس عرصے میں وہ مزدور اور کسان، جن کی تقدیر سے آپ کو بحث تھی، غریب تر ہو گئے ہیں۔ جنوبی افریقہ، جنوبی امریکہ، اور مشرق وسطیٰ میں مغربی ممالک کی سنگ دلی بڑھ گئی ہے۔ اشتراکی ملکوں کی چادریں بھی داغ دھبوں سے خالی نہیں ہیں۔ افسوس کہ دنیا کی 75 فی صد آبادی ظلم سہہ رہی ہے۔ آپ نے اگر تمام نہیں تو بیشتر مظالم کے خلاف آواز اٹھائی ہے۔ یہ بڑے جگرے کی بات ہے۔ 45 سال تک ایک آدرش سے وفاداری حوصلہ اور طاقت چاہتی ہے۔ اور یہ ذخیرہ آپ کے پاس وافر ہے۔ اگر آپ دنیا کو بدل نہیں سکے تو اس میں آپ کا قصور کم ہے۔ اپنی تمام خوش گمانیوں کے باوجود، شاعر تن تنہا نہ انقلاب لاتا ہے نہ قوموں کی تقدیر بدلتا ہے نہ یہ اس کا کام ہے۔ شاعر کوئی آسمانی چیز نہیں۔ وہ اسی معاشرے میں سانس لیتا ہے جس میں سیاست داں بھی ہوتے ہیں اور پروفیسر بھی، ڈاکٹر بھی، انجینئر بھی، سائنس داں بھی اور علم کلام کے جاننے والے بھی، مزدور بھی، کسان بھی ـــــ یہ سب مل ملا کر معاشرے کو بدلنے میں کامیاب ہوتے ہیں۔ شاعر اکیلا کچھ نہیں کر سکتا۔ وہ اندر سے لوگوں کی تطہیر ضرور کرتا ہے یعنی وہ معاشرے کے ناسور اور کوڑھ کی نشان دہی

کرتا ہے ـــــــ ظلم سہتے ہوئے آدمی کے زخموں اور داغوں پر اپنی دردگسار نظر کی سرچ لائٹ پھینکتا ہے اور انہیں منظر عام پر لا کر سوسائٹی کی بے حسی اور لاتعلقی کو چیلنج کرتا ہے۔

جناب والا!

آپ نے یہ سارے کام اتنی خوش سلیقگی سے نپٹائے ہیں کہ آپ کی ہنرمندی کی داد نہ دینا آپ کے ساتھ ناانصافی ہو گی۔ میں کھردرا ضرور ہوں مگر منصفی میرے مزاج میں ہے۔ اور آج صرف یہ کہنے آیا ہوں کہ آپ کی شخصیت کا ہمیشہ سے قدردان رہا ہوں اور میرا سیاسی مسلک بھی آپ سے جدا نہیں ہے کہ کمیٹڈ سوشلسٹ ہوں بلکہ یہاں بسنے کے بعد اور بائیں کی طرف سرک گیا ہوں مگر شاعری میں صرف ایک ہی خیال اور ایک ہی جذبے کو متھنے کا قائل نہیں کہ میری کمٹ منٹ صحافت سے نہیں شاعری سے ہے جو پوری ذات کا مکمل اظہار مانگتی ہے۔ یہی نہیں میں احمد فراز ٹائپ کے شاعروں کو یہ تنبیہہ بھی کرتا رہتا ہوں کہ فیض کے الفاظ' سردار کے انداز' ساحر کے لہجے اور مخدوم کے نغمے کی چوری نہ کرو کہ "سحر" "صلیب" "پرچم" اور "مقتل" کے بیشتر امکانات 1936 والوں نے ختم کر دیے ہیں۔ نئے الفاظ اختیار کرو اور نئے استعارے بناؤ ورنہ مارے جاؤ گے۔

جناب والا!

پچھلے 25 برسوں میں ہماری 15 ملاقاتیں ہوئیں اور ہمارے درمیان 4 خطوں کا تبادلہ ہوا۔ میری بیوی کے نام آپ کے 2 کارڈ اس کے علاوہ ہیں۔ ان خطوں اور ملاقاتوں میں آپ کی شاعری سے اگر میں نے اختلاف کیا تو اس کا بھی کوئی سبب ہے جو آپ کو بتا تا رہا ہوں۔ اس پر میں آپ کی اگلی سالگرہ پر مزید روشنی ڈالوں گا۔ آپ سے صرف یہ گزارش ہے کہ مجھے معاف کرتے رہئے کہ حق گوئی اور جنگ بازی میں نے آپ ہی جیسے لوگوں سے سیکھی ہے۔

آج آپ ہی کی ایک نظم کے چند مصرعوں پر یہ خراج محبت ختم کرتا ہوں:

میں ایک گریزاں لمحہ ہوں

ایام کے افسوں خانے میں
میں ایک تڑپتا قطرہ ہوں
مصروف سفر جو رہتا ہے
ماضی کی صراحی کے دل سے
مستقبل کے پیمانے میں
میں سوتا ہوں اور جاگتا ہوں
اور جاگ کے پھر سو جاتا ہوں
صدیوں کا پرانا کھیل ہوں میں
میں مر کے امر ہو جاتا ہوں

دکھ سے اداسی تک

معزز خواتین و حضرات!

"جب ہم زندگی کو المیہ سمجھنے لگتے ہیں تو جینا شروع کر دیتے ہیں۔ مجھے نہیں معلوم کہ ییٹس کی اس بات سے آپ کہاں تک اتفاق کرتے ہیں۔ لیکن جہاں تک ادب کا سوال ہے اس سے اتفاق کئے بغیر ہم ایک سانس بھی نہیں لے سکتے۔ اور سانس لینے کا مطلب ہے لکھنے والے کا اس مٹی اور کائنات سے رشتہ جہاں وہ گزرے ہوئے اور گزرتے ہوئے لمحوں کو لفظوں میں تبدیل کرتا ہے۔ اور لفظ اس وقت ایجاد ہوتے ہیں جب آدمی خدا (؟) کے علاوہ اپنی ذات کا بھی ادراک کرتا ہے۔

بات ختم ہو گئی یعنی بات اب شروع ہو گی۔ چونکہ ہمیں اپنے ادب کا جائزہ لینا ہے اس لئے پس منظر ہمارا ہندوستان ہو گا۔ ہندوستان کیوں؟ صرف پاکستان کیوں نہیں؟ یہ سوالیہ نشان اتنا ویوہیکل نہ رہے اگر ہم اندر سے یہ قبول کر لیں کہ جغرافیائی سطح پر آج اگر ہم پاکستان ہیں (اور پاکستان زندہ باد) تو کل برصغیر تھے اور برصغیر کا مطلب ہے حضرت محمدؐ، گوتم، کرشن، اشوک، اکبر، اورنگ زیب، کالی داس، امیر خسروؔ، نظیرؔ، ٹیگور، فراق، رام لیلا، تعزیے، ہولی، دیوالی، عید، محرم، مسلمانوں اور ہندوؤں کی محبت، ان کا کینہ، سعدی اور حافظ، اجنتا، تاج محل وغیرہ وغیرہ یعنی ہم ہوا میں معلق نہیں ہیں۔ پاکستانی تہذیب اسی ہندوستانی تہذیب سے پھوٹے گی۔ اب اگر آپ کا دل چاہے تو اقبال کو ہٹا کر وارث شاہ، بھٹائی اور خوش حال خاں خٹک کو اس میں ڈال دیجئے۔ مجھے ذاتی طور پر کوئی اعتراض نہ ہو گا۔ ایک صورت اور بھی ہے، لکھنؤ اور دلی کو معطل کئے بغیر بھی ہم وارث شاہ، خٹک اور بھٹائی کے لئے جگہ نکال سکتے ہیں۔ اتنی ہاہاکار مچانے کی ضرورت نہیں ہے۔ کلچر کا

مسئلہ تمام جینے والوں سے تعلق رکھتا ہے اور جس نسل کے زمانے میں یہ مسئلہ اٹھتا ہے جب وہ ختم ہو جاتی ہے تو ہم ایک نئی تہذیب کی وراثت کے پہلے زینے پر ہوتے ہیں۔

اسی لئے ہمارا پس منظر ہندوستان ہے۔ بات میر تقی میر سے بھی شروع کر سکتے ہیں کہ ہمارے پہلے بڑے ادیب ہیں لیکن جیسا کہ آپ جانتے ہوں گے، لکھنے والے کی ذات میں ساری کائنات کا ماضی بھی شامل ہوتا ہے اس لئے ہم ہندوستان کے کسی ایسے آدمی کو چنیں گے جس سے ہمیں میر کے دکھ کو سمجھنے میں آسانی ہو۔

یہ چھٹی صدی قبل مسیح کا ہندوستان ہے اور سدھارتھ کے معنی ہیں وہ آدمی جو کپل وستو کے بھرے پرے محل میں تنہا ہو گیا ہے اور ایک اذیت ناک کرب سے گزر رہا ہے۔ وہ شاہزادہ ہے اور تہی دامن ہے کہ لفظوں نے اس کا ساتھ چھوڑ دیا ہے۔ تو کیا الفاظ ختم ہو گئے ہوں گے۔ نہیں، وہ بے معنی ہو گئے تھے۔ وہ سامنے تھے اور نظر نہ آتے تھے۔ یہ کیا ہے؟ یہ کیوں ہے؟ لفظوں کے پیچھے کیا اسرار ہیں؟ لفظ کب مرجھاتے ہیں؟ کیوں مر جاتے ہیں؟

اب یشودھرا اور راحل کو چھوڑنے کا مطلب ہوا لفظوں کو زندہ کرنے اور آلائشوں سے نجات حاصل کرنے کی ایک کوشش۔ اور جب بدن سے بدی کی چھال اتر گئی تو سدھارتھ مر گیا اور گوتم پیدا ہوا۔ یعنی اس نے اپنے لئے مردہ لفظوں کو دوبارہ زندہ کر لیا تھا۔ تو یوں ہوا کہ لفظ دوبارہ زندہ اس وقت ہوتے ہیں جب آدمی کائنات کو کائنات کے پہلے آدمی کی طرح حیرت سے دیکھے اور اسے اپنی اصل سے بچھڑنے کا دکھ نڈھال کرے۔ اور اسے اپنی تنہائی کو کائنات کی تنہائی سے ہم آہنگ کرنے میں ایک نئے رشتے کا سراغ ملے۔

افسوس کہ ہندوستان کا یہ پہلا دکھی آدمی اب ہم سے بچھڑ جائے گا۔ اب ہم اٹھارویں صدی عیسوی کے ہندوستان میں ہیں۔ اب ہم گوتم کو ظالم کہیں گے کہ اس نے اپنے پیچھے یشودھرا کو بین کرنے کے لئے چھوڑ دیا تھا۔ اصل میں گوتم کے سینے میں فن کار کا نہیں فلسفی کا دل تھا۔ اب ہم فلسفے سے ادب کی طرف ہجرت کریں گے کہ شانتی کے لئے فلسفے سے ادب کہیں زیادہ اہم ہے۔ شاید اس لئے کہ یہ دریا زندگی کے تمام سوتوں کے ایک ہو جانے سے بنتا ہے۔

میر تقی میر سے ہم مراد لیں گے ایک ایسا شاعر جس نے یشودھرا کو چھوڑا نہیں مگر جو یشودھرا سے جدا ہونے پر مجبور کر دیا گیا ہے اور جو اس ہجر سے دکھی ہے اور جب چاند میں اسے وہ نظر آتا ہے جو اس کی نصف ذات کی تکمیل ہے تو وہ سینہ کوبی کرتا ہے اور سسکتا ہے۔ پھر اسے یاد آتا ہے کہ یہ ناٹک جس کا وہ ایک کردار ہے اس سے پہلے بھی کھیلا جا چکا ہے۔ شاید آسمانوں پر (واضح رہے کہ میں مذہبی روایت کا ذکر کر رہا ہوں۔ ہر چند کہ میں ان قصے کہانیوں پر یقین نہیں رکھتا مگر انہیں اپنی تہذیب کا جزو سمجھتا ہوں) جب آدمی خدا سے پہلی بار جدا ہوا تھا۔ آسمان سے زمین کی طرف آدمی کی پہلی ہجرت اور پھر ہجرتوں کا ایک طویل سلسلہ آدمی کا مقدر بن گیا۔ اور جب تک آدمی کو ہر ہجرت کے ساتھ اپنی پہلی ہجرت یاد آتی رہی وہ اپنی نئی ہجرت اور دائمی ہجرت کے مابین کھوئی ہوئی کڑیاں تلاش کرتا رہا اور اس سوچ بچار میں دکھ اٹھاتا رہا۔ ہم اس دکھ کو کالی داس، ملٹن اور میر تقی میر کہتے ہیں (کالی داس اور ملٹن کا نام بے تکلفانہ آگیا ہے حالانکہ شکنتلا اور پیراڈائز لاسٹ کے علاوہ ان فن کاروں سے اور کہیں ملاقات نہیں ہوئی۔ ہاں ان پر تنقیدی مضامین ضرور پڑھے ہیں۔ معذرت خواہ ہوں)

آپ نے سنا ہوگا کہ اسلوب ذات ہے۔ ہم اپنی آسانی کے لئے فن کار کو لفظ کہیں گے کہ ہماری ذات اور الفاظ دونوں لمحوں کا ایک مرکب ہیں۔ اگر آپ آدمی سے اس کے لمحات چھین لیں گے تو وہ نہیں بچے گا۔ یہ کہ وہ سانس تو لیتا رہے گا لیکن ماضی سے اس کا کوئی رشتہ نہیں رہے گا۔ ایسے لوگوں کے لئے لفظ مردہ ہو جاتے ہیں اور انہیں کسی سے بچھڑنے کا کوئی دکھ نہیں ہوتا۔ یہ نظام الدین اولیا سے اگر بچھڑ بھی جائیں تو اپنی اصل سے رجوع نہیں کریں گے یعنی ان میں سے یہ کہنے کا حوصلہ نہیں ہوگا کہ چل خسرو "گھر" آپنے سانجھ بھئی چودیس۔ اس لئے ضروری ہے کہ جب فن کار پر ایسا برا وقت پڑے تو وہ اپنے ہمزاد "لفظ" کی زندگی کے لئے شانتی شانتی پکارے۔ یہ بھی ذہن نشین رہے کہ فن کار آدمی ہے اور آدمی کوئی مجرد چیز نہیں ہے، وہ "میں" کے سفر کی تاریخ ہے۔ ہم

فیض اے ابر چشم تر سے اٹھا
آج دامن وسیع ہے اس کا

کہنے والے کے المیے سے واقف ہیں اور اس آواز کی لرزش میں اس دکھ کو محسوس کر لیتے ہیں جو اسے اپنے محبوب سے جدا ہونے پر ملا۔ مگر اس شعر کی بڑائی یہ ہے کہ یہ کسی عظیم تر جدائی کی کہانی بھی ہے۔ دوسرے لفظوں میں یہ سمجھئے کہ میر کا دکھ ہماری سمجھ میں اس لئے آجاتا ہے کہ وہ اپنی ذات سے کائنات کا سمبندھ ڈھونڈتے ہیں۔ ان کے الفاظ یا انکے ہمزاد زندہ ہیں۔ اور الفاظ اس لئے زندہ ہیں کہ شاعر "شانتی شانتی" پکارنا جانتا ہے۔ اور اپنے دکھ کا اظہار اپنے لفظوں میں کرنے کا گناہ گار ہے۔ یہ بھی کہ اپنے گناہوں (؟) سے چھٹکارا حاصل کرنے کے لئے ظلم کرتا نہیں بلکہ ظلم سہتا ہے۔ اور ظلم سہنے کا مطلب ہے دنیا کی آلائشوں سے بھاگنا اور محبتوں پر کامل ایمان رکھنا۔

معزز خواتین و حضرات!!

میری ہمت کی داد دیجئے کہ میں ہنوز آپ کو معزز کہہ رہا ہوں۔ شاید اس لئے کہ ایک بار پھر ہمارے ادب میں لفظ مردہ ہو چلے۔ ان کے کوئی معنی نہیں رہے۔ اس زوال کی داستان سنئے :-

دور بیٹھا غبار میر اس سے
عشق بن یہ ادب نہیں آتا (میر)

گو میں رہا رہین ستم ہائے روزگار
لیکن ترے خیال سی غافل نہیں رہا (غالب)

کوئی چٹکی سی کلیجے میں لئے جاتا ہے
ہم تری یاد سے غافل نہیں ہونے پاتے (فانی)

جی تو میرا اداس ہے ناصر
شہر کیوں سائیں سائیں کرتا ہے (ناصر)

"ادب" سے "خیال"، "خیال" سے "چٹکی" اور "چٹکی" سے "اداسی" تک پہنچتے پہنچتے بہت کچھ ٹوٹ پھوٹ گیا ہے اور بہت کچھ کھو گیا ہے۔ اب ہم اپنے ہمزاد مردوں کو اپنے کاندھوں پر لئے ہوئے چلے جا رہے ہیں اور مطمئن ہیں کہ ہم اداس ہیں۔ حالانکہ ہم اچھی طرح جانتے ہیں کہ ہم اداس کیوں ہیں۔ ہماری اداسی کا سبب دنیا ہے یعنی یہ کہ افسوس ہم دنیا کی مزید آلائشیں نہیں خرید سکتے۔ اب لوگ "گھر" لکھتے ہیں تو میں اور آپ

سب جان لیتے ہیں کہ فلانا گلبرگ یا ڈیفنس سوسائٹی کے مکان کا ذکر کر رہا ہے۔ جب لفظ مردہ ہو جاتے ہیں تو یہی ہوتا ہے۔ یاد کیجئے کہ جب کچھ نہیں تھا تو کلام تھا اور دعا کیجئے کہ ہم اس زندہ کلام سے اپنے مردہ لفظ کا رشتہ تلاش کر سکیں۔ شانتی شانتی پکار سکیں۔

نظم کا سفر

فیض ۔ میراجی ۔ راشد

نئی نسل کو بھٹکانے اور اردو نظم کی نمو میں رخنہ ڈالنے میں فیض کی شاعری پیش پیش رہی ہے۔ ان کا خوابناک انداز، غنائی لہجہ، تخیل اور ترشے ہوئے الفاظ، انوکھی اور اچھوتی تشبیہوں پر محبوبانہ دسترس اور سب سے بڑھ کر ان کی شخصیت کی نرمی اور مٹھاس ——— یہ تمام چیزیں اپنے قاری پر جادو کیے بغیر نہیں رہتیں۔ ان کا کلام پڑھتے ہوئے بار بار مجھے یہ احساس ہوا ہے کہ میں ایک ایسے طلسمی قصر میں داخل ہو رہا ہوں جہاں کچھ دیر کے لئے سوچنے اور سمجھنے کی ساری صلاحیتیں سلب ہو جاتی ہیں اور باصرہ اور شامہ کے علاوہ باقی تمام حسیات مفلوج ہو جاتی ہیں۔ بس دیکھتے رہیے اور خوشبو نفس در نفس آپ کی رگوں میں اترتی چلی جائے گی۔

ابھی فضا میں اقبال کے "سلسلہ روز و شب" کی گونج باقی تھی اور اختر شیرانی کی سلمٰی دلوں میں کچا کچا درد بکھیر رہی تھی کہ فیض نے لکھنا شروع کیا۔ نئے لکھنے والے ایک دوراہے پر کھڑے تھے۔ یہ عمر ہی ایسی ہوتی ہے۔ دل میں سلمٰی جیسی محبوبہ کے لئے لہو ہلکورے لے رہا ہو گا اور ذہن اقبال کی فکری رو کا ساتھ دینا چاہتا ہو گا۔ فیض، اقبال کے قدم سے قدم ملا کر چلنے لگا،

کنار رحمت حق میں اسے سلاتی ہے
سکوت شب میں فرشتوں کی مرثیہ خوانی

اور اقبال کی معیت میں وہ ان کے استاد داغ تک جا پہنچتے تھے:

ہو چکا عشق اب ہوس ہی سہی
کیا کریں فرض ہے ادائے نماز

دوسری طرف اختر شیرانی کی آواز سے آواز ملانے کی کوشش جاری تھی:

آؤ گی مری گور پہ تم اشک بہانے
نوخیز بہاروں کے حسیں پھول چڑھانے

یا

مگر پھر بھی اے میرے معصوم قاتل
تمہیں پیار کرتی ہیں میری دعائیں

یہی ابتدا کرنے کا Genuine طریقہ بھی ہے۔ نیا لکھنے والا تھوڑی دور تک اپنے دور کی بڑی آوازوں اور پچھلوں کے نقش قدم پر چلتا ہے اور اگر اس میں جان ہے تو رفتہ رفتہ اپنی راہ الگ کر لیتا ہے ورنہ دوسری صورت میں دھیرے دھیرے ادب خود اسے اپنی راہ سے الگ کر دیتا ہے۔ یہ ادب کا کچھ ایسا فطری عمل ہے کہ آدمی دیکھتا ہی رہ جاتا ہے اور اس کی ساری عمر کی محنت ادبی تاریخ کے جوہڑ میں پڑی سڑی رہتی ہے۔

فیض کے یہاں کبھی اقبال کا مصرع "یہ غازی یہ تیرے پراسرار بندے" پیروڈی ہو کر "یہ گلیوں کے آوارہ بے کار کتے" بن جاتا ہے کبھی غالب کے مصرعے گونجتے ہیں:

تو ہے اور اک تغافل پیہم
میں ہوں اور انتظار بے انداز

اور کبھی غالب کے لہجے کی دھمک سنائی دیتی ہے:

ہم پرورش لوح و قلم کرتے رہیں گے
جو دل پہ گزرتی ہے رقم کرتے رہیں گے

(میرا خیال ہے یہ شعر Plagiarism کی سرحدوں کو چھوتا ہوا گزرتا ہے)۔ اور کبھی سودا کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے فیض سودائی نظر آتے ہیں:

ہے فقط مرغ غزل خواں کہ جسے فکر نہیں
معتدل گرمی گفتار کروں یا نہ کروں

ان تمام باتوں کے باوجود یہ امر مسلم ہے کہ فیض نے جہاں کہیں سے بھی کسب نور

کیا ہے اس میں اپنی طرف سے کچھ نہ کچھ اور ایسا شامل کر دیا ہے کہ وہ فیض ہی کا ہو کر رہ گیا ہے۔ ان کا لہجہ اتنا سبک اور الگ ہے کہ اردو کے کسی شاعر کے لہجے سے لگا نہیں کھاتا۔

سو رہی ہے گھنے درختوں پر
چاندنی کی تھکی ہوئی آواز

غالباً پہلا شعر ہے جہاں سے فیض نے اپنی آواز الگ کرنی شروع کر دی تھی۔ یہ لہجے کی نرمی اور مٹھاس فیض نے سالہا سال کی ریاضت کے بعد حاصل کی ہے۔ کچھ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ شعر کہنے سے زیادہ لہجہ بنانے اور آواز منفرد کرنے میں مصروف رہے۔ بعض اوقات تو الفاظ کی تراش خراش اور کاری گری اتنی نمایاں ہوتی ہے کہ اصل جذبہ ماند پڑ جاتا ہے اور ایک خوبصورت عنوان کے ساتھ ایک بجی سجائی نظم صفحہ قرطاس پر ندامت سے سر جھکائے ہوئے سسکتی رہتی ہے ملاحظہ ہو۔ دل کے رخسار پر اس وقت تری یاد نے ہات۔ لاحول و لاقوۃ A good poet should feel as hamed after executing a line like that.

فیض کے کلام کا ایک اور نمایاں جوہر ہے تکرار —— بلکہ کبھی کبھی تو میں یہ سوچنے لگتا ہوں کہ مکھی پر مکھی مارے ہوئے جذبات اور اپنی ہی جگالی کئے ہوئے خیالات کو ان کے یہاں سے نکال دوں تو کیا فیض کا کل کلام دس بارہ صفحات میں نہیں سمٹ آئے گا۔ ایک بات خاص طور سے یاد رکھنے کی ہے کہ فیض کا معاملہ ان سے کہیں چھوٹے شاعر مجاز سے ذرا جدا ہے۔ مجاز کے یہاں تکرار کی وجہ علم اور مشاہدے کی کمی ہے جبکہ فیض کے یہاں تکرار کا باعث صحیح یا غلط آدرش ہے۔

"موضوع سخن" فیض کی اصل آواز تھی۔ لیکن ابھی وہ آہستہ سے کھلتے ہوئے ہونٹوں اور جسم کے دلاویز خطوط کو پوری طرح محسوس بھی نہ کرپائے تھے کہ ترقی پسندی کے اژدھے نے سانس لینی شروع کر دی اور دوسرے لاتعداد شاعروں کی طرح وہ بھی اس بھوکے اژدھے کے کھلے ہوئے سرخ جبڑوں کی طرف کھنچنا شروع ہوئے۔ ساری مخلوق، کنکر پتھر، اوبڑ کھابڑ، سب کی منزل ایک تھی، اژدھے کا پیٹ —— انجام؟ مکمل تباہی! تیری سرکار میں پہنچے تو سبھی ایک ہوئے۔ نیاز حیدر اور کیفی اعظمی بھی وہی کہہ رہے تھے

جو فیض کہہ رہے تھے اور فیض بھی وہی کہہ رہے تھے جو سردار اور مخدوم کہہ رہے تھے اور سردار اور مخدوم بھی وہی کہہ رہے تھے جو پارٹی کہلانا چاہتی تھی۔ اور تو اور "ترا ہاتھ' ہاتھ میں آگیا تو چراغ راہ میں جل گئے" اور "رقص کرنا ہے تو پھر پاؤں کی زنجیر نہ دیکھ" جیسے مصرعے کہنے والی مہذب آواز "مری نگاہ میں ہے ارض ماسکو مجروح" جیسے بے رس اور اخباری مصرعے گنگنانے لگتی تھی۔

ان سب کی اپنی آواز' اپنا احساس اور اپنا جذبہ غائب ہو گیا تھا۔ یہ انسان پرست قوم اور یہ قوم سدھار ٹیم شعر و ادب کو چھوڑ کر اتنا آگے نکل آئی تھی کہ واپسی کا امکان بس اسی صورت میں باقی رہ گیا تھا کہ یہ اژدھا سانس لینے کے لئے دوبارہ منہ کھولے ——— جو صرف اس طرح ممکن تھا کہ کوئی اللہ کا بندہ اس اژدھے کی دیوار نما پیٹھ کے نیچے آگ روشن کرے تاکہ یہ کالی بلا گھبرا کر کروٹ بدلے اور تکلیف سے چنگھاڑنے لگے۔ یہ میں بعد میں بتاؤں گا کہ آگ روشن کرنے کا خوشگوار فریضہ کس نے ادا کیا فی الحال یہ دیکھئے کہ اس دیوار کے نیچے دب کر فیض کا کیا حشر ہوا۔

فیض کو پڑھ کر سب سے پہلے یہ احساس ہوتا ہے کہ اس انبوہ کثیر میں خلط ملط ہو کر بھی انہوں نے شاعری کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑا اور در آمد شدہ خیالات کے ساتھ ساتھ شعریت کی ایک بے قرار لہر بھی ان کے لہجے سے الجھی رہی۔ یہی وجہ ہے کہ حشر کے میدان میں وہ واحد ترقی پسند شاعر ہیں جو ذرا سر اٹھا کر چل سکتے ہیں حالانکہ کج کلاہی انھیں بھی زیب نہیں دیتی۔ ان کے دوسرے ساتھی ادھر ادھر کنی کاٹتے ہوئے بھاگے پھر رہے ہیں اور جائے اماں نہیں۔ حق ہے' وتعز من تشاء و تذل من تشاء۔

ترقی پسندوں میں مل کر سب سے پہلے تو فیض نے اپنی محبوبہ کو رخصت کیا۔ اور بھی غم ہیں زمانے میں محبت کے سوا۔ شاعر کو کیسے کیسے جھوٹ بولنے پڑتے ہیں۔ اگر محبت اپنی فلمی محبت کے علاوہ کوئی اور چیز ہوتی ہے تو یہ بات تو فیض بھی اچھی طرح جانتے ہیں کہ محبت کے سوا دنیا میں اور کوئی غم سرے سے موجود ہی نہیں ہے اور باقی تمام شاخیں اسی چھتنار درخت سے پھوٹتی ہیں۔ نہ ہوتی محبت نہ ہوتا ظہور۔

فیض کے رقیب کی ایک زمانے میں بڑی دھوم تھی۔ یہ نظم مجھے بیسویں مصرعے تک بہت پسند ہے۔ اتنی کہ میں نے فیض صاحب سے فرمائش کر کے بار بار سنی ہے۔ میں

انہیں ہمیشہ ۔ "جز ترے اور کو سمجھاؤں تو سمجھا نہ سکوں" پر روک دیتا ہوں۔ وہ بھلے آدمی ہیں رک جاتے ہیں' یہ ان کی بڑائی ہے۔ میرے خیال میں اگر نظم اس مصرعے پر ختم ہو جاتی تو اپنا بڑا گہرا اثر چھوڑتی۔ باقی 12 مصرعے پیوند ہیں۔ نام نہاد غم دوراں کو غم جاناں کے ساتھ جوڑنے کا پیوند۔ ایک سچ کو دوسرے جھوٹ کے ساتھ جوڑنے کا پیوند۔ اور اس انمل بے جوڑ پیوند کا سلسلہ فیض کی اکثر نظموں میں پھیلا ہوا ہے۔ اک بخیہ ادھیڑا ایک سیا' یوں عمر بسر کب ہوتی ہے؟ فیض صاحب کا ایک مصرع ہے ۔ اس عشق نہ اس عشق پہ نادم ہے مگر دل۔ حالانکہ آواز کی کپکپی بتا رہی ہے کہ ایک عشق پر دل نادم ضرور ہے اور اگر فیض کا دل نادم نہیں تو قاری کو ندامت ضرور ہے۔ اس کے علاوہ فیض کے یہاں ایک چیز اور رہ جاتی ہے۔ صلیب و زنداں سے گزرنے کا عزم اور سحر کا انتظار میں یہ نہیں کہتا کہ یہ مسئلے نظر انداز کر دینے کے قابل ہیں' far from it جن مسئلوں سے شاعر دو چار ہوا ہے اگر وہ اس کے دل پر اپنا اثر نہیں چھوڑیں گے تو اس کا دوراس کے کلام میں کیسے دھڑکے گا۔ لیکن زندگی کے صرف ایک ہی گوشے کی عکاسی اچھے شاعر کا شیوہ نہیں۔ حد بندی فن کار کا دم گھونٹ دیتی ہے۔ اور وہ اپنے ہی کلیشے میں ساری عمر ٹامک ٹوئیاں مارتا رہتا ہے۔ میں شاعری میں Commitment کا شدید قائل ہوں مگر شاعر کی پہلی Commitment شاعری سے ہے نہ کہ Journalism سے

یہاں میں سارتر کے مضمون Commitment کا حوالہ نہیں دینا چاہتا ورنہ بات بہت بڑھ جائے گی کہ میں فیض ہی کے آس پاس رہنا چاہتا ہوں۔

طوق و سلاسل اور دار و رسن کو فیض نے اتنا دہرایا ہے کہ اب وہ شاید خود بھی سمجھنے لگے ہیں کہ ان کی یہی آواز سچی آواز ہے۔ اگر آپ اپنے ہاتھ کی کسی انگلی کا ناخن بار بار اپنے دانتوں سے کاٹتے رہیں تو وہ حرکت آپ کی عادت ثانیہ بن جائے گی۔ عادت جو جبلت کی زر خرید کنیز ہے۔ یہاں تک کہ اگر آپ اس عادت بد کو چھوڑنا چاہیں تو بھی نہیں چھوڑ سکتے۔ اور آپ کو اس عادت سے ایک طرح کی دلچسپی پیدا ہو جاتی ہے۔ اور یہ دلچسپی رفتہ رفتہ محبت میں تبدیل ہو جاتی ہے لیکن ساتھ ساتھ یہ بھی ایک اٹل حقیقت ہے کہ یوں آپ پہلے اپنا ناخن چبا جاتے ہیں اور پھر اپنی انگلی زخمی کرتے رہتے ہیں حالانکہ آپ کو اس کا احساس بھی نہیں ہوتا۔ دار سے فیض کا کچھ ایسا سمبندھ ہو گیا کہ نہ جائے

رفتن نہ پائے ماندن۔ تنگ آکر وہ دار ہی کو کاندھے پر لاد کر اٹھا لائے۔ شاید اس طرح وہ اسے دیکھ دیکھ کر Inspire ہونا چاہتے ہیں:

ڈال کر کوئی گردن میں طوق آ گیا
لاد کر کوئی کاندھے پہ دار آگیا

فیض میں بڑے امکانات تھے اور وہ چلے بھی ٹھیک ہی تھے لیکن ادب کا معاملہ تو بھول بھلیوں کا سا ہے۔ اگر ہاتھ میں چراغ نہیں ہے یا اس چراغ پر گرفت مضبوط نہیں ہے تو نکلنے کی کوئی صورت نہیں۔ فیض نے بھٹک کر ہماری نظم کو بڑا نقصان پہنچایا ہے اور اب اس کی تلافی کا کوئی امکان نہیں رہا۔ پھر بھی، ان تمام چیزوں کے باوجود، فیض واحد زندہ شاعر ہیں جن کی تقریباً تمام نظمیں ان کے مخالفین اور متفقین دونوں پر یکساں اثر کرتی ہیں۔ نقش فریادی کی 7 نظمیں: میرے ندیم مجھ سے پہلی سی محبت مری محبوب نہ مانگ، رقیب سے، تنہائی، بول، موضوع سخن، اور ہم لوگ __ دست صبا کی 5 نظمیں: صبح آزادی، شورش بربط و نے، نوحہ، ایرانی طلبہ کے نام اور شیشوں کا مسیحا کوئی نہیں —— زنداں نامہ کی دو نظمیں: دریچہ اور روشنیوں کا شہر —— دست تہ سنگ کی دو نظمیں: پاس رہو اور منظر، اپنے اسلوب اور احساس دونوں لحاظ سے اظہار اور بیان کی جدید تر راہیں دکھاتی ہیں اور نظم کے نئے اور اچھوتے زاویہ ہائے نظر کے امکانات روشن کرتی ہیں۔ اردو نظم میں فیض کا یہی اضافہ ہے جس کے بغیر اسلوب اور خیال دونوں کا رشتہ ماضی سے کٹ جائے گا۔ (فیض کی غزل چونکہ میرے موضوع کے احاطے سے باہر ہے اس لئے اس پر گفتگو نہیں کی گئی۔)

یہاں تک ہماری نظم بہت ست رفتار رہی ہے۔ یہ لوگ اس کی باگ پکڑ کر اسے گھسیٹنا چاہتے تھے لیکن وہ قربانی کے اڑیل بکرے کی طرح زمین پکڑ کر کھڑی ہو گئی تھی۔ اس پر یہ حقیقت منکشف ہو چلی تھی کہ آگے چکوے چھری پجار ہے ہیں اور کوئی دم جاتا ہے کہ مٹی مٹی میں اور پانی پانی میں مل جائے گا۔ وقت کٹھن تھا مگر متوازی افق پر ایک اور طرح کی نظم طلوع ہو رہی تھی۔ خوابناک آنکھوں والے میرا جی سامنے آئے اور اس شاطر اژدھے کی دیوار نما پیٹھ کے نیچے یوں خاموشی سے بیٹھ گئے جیسے وہ مدت سے سایہ دیوار ہی کی تلاش میں سرگرداں تھے۔ وہ بھوکے آدمی تھے پیٹ کی بھوک ہو کہ پیڑو کی،

اظہار سے وہ کہیں ہچکچاتے نہیں۔ ناممکن تھا کہ وہ اس قیام کو بغیر طعام کے طول دیتے۔
ان کے دماغ میں مختلف جنسی، نیم جنسی، حیوانی، نیم حیوانی، سدھائے ہوئے جذبات اور
اعلیٰ انسانی اقدار کی کھچڑی سی پک رہی تھی۔ انہوں نے وہ ہنڈیا اتار کر اس دیوار سے لگا
دی اور آگ روشن کر دی۔ آگ تیز ہوتی گئی اور اژدھا درد/ سے بلبلانے لگا۔ ادھر راشد
بھی کسی کے پہل کرنے کے انتظار ہی میں تھے۔ انہوں نے بھی بن بجھے چونے کی ایک
بوری اس کے منہ میں انڈیل دی۔ وہ اژدھا باہر سے تو جل ہی رہا تھا اب اندر سے بھی
گلنے لگا۔

میراجی اور راشد ——— فیض سے بہت مختلف ہیں۔ فیض کی تربیت میں غزل کا
بڑا حصہ ہے بلکہ یہ کہنا زیادہ مناسب ہے کہ ان کا خمیر غزل ہی سے اٹھا تھا۔ ان کی نظموں
کے مصرعوں کی کنٹریبوشن، ساخت، جامعیت، انہیں نظم سے زیادہ غزل کے قریب رکھتی
ہے (یاد رہے کہ نظم گو کی دیگر خصوصیات کے علاوہ ایک خصوصیت، مصرع کہنے کا ڈھنگ
بھی ہے) ہمیں بزرگوں سے اسلوب کی جو روایات ملی تھیں ان سے انہوں نے اتنا
انحراف ضرور کیا کہ کہیں صوت اور آہنگ کے تجربے کر لئے اور کہیں سیدھے سادے
قطعے کا سا انداز اختیار کر لیا لیکن ان کی نظمیں اپنے اندر غزل کی سی قطعیت اور کاٹ
بھی رکھتی ہیں جب کہ میراجی اور راشد دونوں اسے بدظنی کی نظر سے دیکھتے ہیں حالانکہ
راشد کی شاعری میں غزل کے رول سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ مگر یہ دونوں شاعر جذبے
اور خیال کو جوں کا توں اس کی عریاں حالت میں بیان کر دینے کے حامیوں میں ہیں۔ اسی
لئے اسلوب ہو کہ خیال یا جذبہ ہر تین صورتوں میں یہ لوگ نظم اور خاص کر جدید نظم
سے قریب تر اور روایت کے باغیوں میں سے ہیں اور فیض سے نسبتاً نئے بھی۔

جہاں تک میں سمجھ سکا ہوں ادب کا کام تزکیہ ہے۔ انسان کے کسی نہ کسی ناملائم
جذبے کا تزکیہ۔ جو صرف اسی صورت میں ممکن ہے کہ لکھنے والا اپنے کسی خیال یا جذبے
کو محسوسات کے دائرے میں لانے کے بعد جمالیاتی سطح پر الفاظ کی شکل دے دے۔ اس
عمل سے یہی نہیں کہ اس کے کسی کھردرے جذبے کا تزکیہ ہو گا بلکہ اس کے پڑھنے اور
سننے والے پر بھی یہی اثر ہونا چاہئے اور اگر اس پر یہ عمل نہیں ہوا تو جان لینا چاہئے کہ
لکھنے والے نے کہیں نہ کہیں اس میں کھوٹ شامل کر دیا ہے۔ اور اس کھوٹ کی موجودگی

اس بات کا بین ثبوت ہے کہ لکھنے والا کسی سچائی کو شعور کے احاطے میں لاتے ہوئے ڈرتا یا جھجکتا رہا ہے یا کلیشے میں لکھ رہا ہے۔ یعنی اگر کسی کا تزکیہ مارٹن لوتھر کنگ کی تقریر I have a dream ——— سے ہو گیا تو ن م راشد کے "میرے بھی ہیں کچھ خواب" سے اس کے اندر کوئی تبدیلی نہیں آئے گی۔ اسی سے یہ بات بھی نکلتی ہے کہ اپنی تمام خوش فہمیوں کے باوجود شاعر تن تنہا نہ قوم کی تقدیر بدلتا ہے نہ انقلاب وغیرہ لاتا ہے۔ صرف فرد کی تطہیر کرتا ہے اور اسی سے معاشرے میں تھوڑے بہت خیر کے جذبات راہ پا جاتے ہیں۔

میرا جی اور راشد نے کرم خوردہ اخلاق کی جھوٹی قدروں والی بے نیو دیواروں کو ڈھانا اور نظم والے حالی کے سائے میں چلی ہوئی پود کے چہرے سے چھلکا اتارنا شروع کیا۔ یہی کام نثر میں عصمت اور منٹو بھی کر رہے تھے۔ ان تمام لوگوں نے اپنے آئینے سورج کے سامنے کر دیئے تھے۔ اور ہاتھوں کی جنبش سے ان کی چکا چوند کر دینے والی روشنیاں خشک ہونٹوں' اندھی آنکھوں اور روشنی کے لئے ترسے ہوئے جسموں پر پھینکنی شروع کیں۔

یہ سچ تھا اس لئے اس کی طاقت بھی بڑی تھی اور جو لوگ اس طاقت کے سامنے زیادہ دیر تک ٹھہرنے کی جسارت اپنے اندر نہیں پاتے تھے یا اس روشنی سے اپنے دلوں کے اندھیرے چھپائے رکھنا چاہتے تھے انہوں نے اپنے ہاتھوں سے اپنے چہرے چھپا لئے اور اپنے جلے ہوئے برقعوں سے اپنی ستر پوشی کرنے لگے۔ میرا جی اور راشد ناکام رہتے اگر وہ زیرک اور چالاک نہ ہوتے۔ وہ ان آئینوں سے X-RAY کا کام لینا بھی جانتے تھے۔ چنانچہ انہوں نے ان کے رخ اپنی شخصیتوں کی طرف پھیر لئے اور یوں ان کی شخصیت کے سارے کوڑھ اور ناسور اور آدمی کی ازلی محرومی روشنی میں آ گئی جس کی طرف ہمارے نظم نگاروں کی توجہ نہ ہونے کے برابر تھی۔

میرا جی نے آدمی کے ان دکھتے ہوئے زخموں اور زنگ خوردہ جنسی جذبوں کی تطہیر کا فرض ادا کیا جنہیں ہمارے دوسرے شاعروں نے دانستہ نظر انداز کر رکھا تھا اور یوں ہماری نظموں میں کہیں کبھی کوئی شخصیت پوری طرح اجاگر نہ ہو پائی تھی۔ یہ جذبے اپنے اندر امکانات کا ایک بیش بہا خزانہ رکھتے تھے اور ضروری تھا کہ اس طرف بھی توجہ کی

جائے کہ یہ بھی بہر حال انسان کی بنیادی جبلتوں، احساسات، معاشیات اور سماجی بندشوں سے معرض وجود میں آتے ہیں:

ہاتھ آلودہ ہے نمدار ہے دھندلی ہے نظر
ہاتھ سے آنکھوں کے آنسو تو نہیں پونچھے تھے

اس پر ناک بھوں چڑھانا اور بات ہے لیکن ایک صورت یہ بھی ہے کہ اسے اخلاق کا مسئلہ بنائے بغیر صرف ادب کا مسئلہ بنا کر دیکھیں کہ آیا یہ نظم آدمی کو استمنا بالید کی تلقین کرتی ہے یا اس کے کسی وحشیانہ اور غیر صحت مند جذبے کا تزکیہ کرتی ہے۔ پھر یورپ اور امریکہ کے جنس دانوں، ماسٹرس اور جانسن اور روبی وغیرہم کی ریسرچ یہ ہے کہ خود لذتی ایک فطری عمل ہے اور ایک صحت مند مرد یا عورت کی نشانی ہے۔ (راقم الحروف نے خود لذتی کے لئے خود وصلی کی ترکیب ایجاد کی ہے تاکہ احساس جرم کی زنجیر کی آواز سنائی نہ دے) اگر میرا جی ان لمحوں سے گزرنے کے بعد، انہیں شعور سے جھٹک کر جسم کے کسی نہاں خانے میں ڈال دیتے اور کہتے یہ کہ ۔ آؤ ببر کی چال' آ جاؤ افریقہ' تو ہم کف افسوس ملنے کے علاوہ اور کیا کر سکتے تھے۔ سچ کہئے آپ کی رگیں ۔ ہاتھ سے آنکھوں کے آنسو تو نہیں پونچھے تھے' سے جھنجھنا رہی ہیں یا ۔ آؤ ببر کی چال' آ جاؤ افریقہ ـــــ سے ـــــ اور اگر پہلا مصرع دل سے سرگوشیاں کر رہا ہے تو اس کی صرف ایک ہی وجہ ہو سکتی ہے اور وہ یہ ہے کہ میرا جی کی آواز سچی ہے۔ نیز وہ اپنے اندر بڑی شاعری کے امکانات بھی رکھتے تھے۔ بہیمانہ جذبات کو شعری قالب میں ڈھال دینا آسان نہیں۔ یہیں شاعر کی چابکدستی کام آتی ہے۔ ورنہ تباہی کے دروازے تو بہر حال سب کے لئے کھلے ہوئے ہیں۔

علامت، شعر کے حسن کے اضافے کے لئے ایک اہم چیز ہے، ہمارے نظم نگاروں میں میرا جی پہلے آدمی ہیں جنہوں نے فرانسیسی علامت نگاروں کی زبان سمجھی اور علامت کو پورے سلیقے سے برتا ـــــ جنسی مسائل اگر جوں کے توں بیان کر دیئے جائیں تو یہ اپنی اعلیٰ اور جمالیاتی قدروں کے ساتھ شعر میں نہیں کھپ سکتے۔ چونکہ میرا جی بیشتر اسی جنسی داشتہ کے گھرد گھومتے رہے ہیں اس لئے علامت کا سہارا اشد ضروری بھی تھا۔ انہیں علامتوں کی زبان آتی تھی بلکہ وہ علامتوں ہی کے شاعر تھے۔ اسی لئے اکثر وہ وقت

پسندی کی طرف بھی نکل گئے ہیں اور جہاں جہاں وہ خود واضح نہیں تھے' ان کی نظمیں بھی گنجلک اور گاہے گاہے بے معنی ہو گئی ہیں۔ "تن آسانی" اور "ترقی پسند ادب" وغیرہ بے جان' غیر واضح اور نادار نظمیں اسی لئے ہیں کہ وہ شاعر کے احساسات' جذبات یا شخصیت کے کسی گوشے کا حصہ نہ بن سکی تھیں۔

وقت گزر رہا ہے' وقت گزر جائے گا۔ اسی لئے میرا جی ہر لمحے کی خوشبو اپنے مشام جاں میں اتار لینا چاہتے تھے۔ خواہ وہ دکھی لمحہ ہو یا خوف زدہ' حسین یا کریہہ' خوابناک یا خوش آئند:

کیا داد جو اک لمحے کی ہو وہ داد نہیں کہلائے گی

لیکن ایک بات خاص طور سے یاد رکھنی چاہئے کہ وہ انہی لمحوں کی داد دیا کرتے تھے جو ان کے تمام جذبات کو یا کسی ایک جذبے کو کسی نئے تجربے سے دوچار کریں۔ اور جہاں کسی دہرائے ہوئے جذبے کا دوبارہ اظہار ملتا ہے' اس کی وجہ پہلے اظہار کی ناپختگی یا تشنگی ہے۔ یوں بھی ہوا ہے کہ میر تقی میر کی طرح دوسری کوشش پہلی کے مقابلے میں زیادہ ناکام رہی ہے۔ یہ غفلت اور چوک جانے کا نتیجہ ہے جو فنی گرفت کی ڈھیل پر دلالت کرتا ہے' اس میں دانستگی کو دخل نہیں۔ جیسا کہ میں نے فیض کے بیان میں کہا تھا کہ وہاں خیال کی رٹ شعوری ہے اور اپنے ایک مضمون میں مجاز کا ذکر کرتے ہوئے لکھا تھا کہ ان کے یہاں مشاہدے اور علم کی کمی کھٹکتی ہے۔

میرا جی سے پہلے تک ذہنوں میں ایک کو بڑا اور تھا اور ہرچند کہ اس کی موجودگی ایک مفروضے سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتی تھی تاہم یہ خیال عام تھا کہ غزل داخلیت اور نظم خارجیت کے بیان کا نام ہے۔ پھر یہ ہوا کہ کسی نہ کسی خیال پر نظم کی اساس ضروری سمجھی گئی۔ یہ الگ بحث ہے کہ اس صورت میں سہرا ان علوم کے سر جاتا ہے جہاں سے یہ خیال اخذ کیا گیا ہے۔ خواہ وہ دینیات ہو یا سیاسیات' معاشیات ہو یا طبیعیات' شعر میں اس کی حیثیت ہمیشہ ثانوی رہے گی۔

اب دیکھئے تو یہ تمام علوم لچک دار ہیں اور حالات' مشاہدات اور تجربات کے ساتھ بدلتے رہتے ہیں۔ تعجب کی بات یہ ہے کہ جس خیال پر نظم کا مدار ہمارے نظم نگاروں نے رکھا تھا وہ تو اپنی شکلیں بدلتا رہا لیکن یہ حضرات شمہ برابر بھی ادھر ادھر نہ ہوئے اور اپنی

نمو پذیر شخصیت' برف کی تہ در تہ سل کے نیچے دبائے رہے اور ذہن کے تمام دریچے بند کر لئے کہ مبادا صبح کی روشنی اور بہار کی تازہ ہوا سے کوئی نیا اکھوانہ پھوٹ جائے۔ حالانکہ ایک اچھے فن کار کا فرض ہے کہ وہ اپنی شخصیت کے بدلتے ہوئے رخوں کو شعور میں لا کر ان کی کڑی نگرانی کرے' مانا وہ کچھ دیر اجنبی لگیں گے لیکن آخر وہ بھی تو اس کی شخصیت کا ایک پرتو ہوں گے' دل میں اتنی گنجائش ضرور ہونی چاہئے کہ وہ انہیں اپنا لے۔ ہر دل عزیز شاعری کو بالائے طاق رکھ کر نئی شعری لسانیات کی طرف بھی توجہ ضروری ہے۔ اور کمنگس کے الفاظ میں

Its no use trying to pretend that most people and ourselves are alike'.

میرا جی پر جو کچھ بیتی' بے کم و کاست ان نظموں میں آگئی۔ اس کے لئے انہیں خیال کے اس کوبڑ کو بھی چیرنا پڑا اور دیکھنے والوں نے دیکھا کہ اس میں سوکھے ہوئے مواد کے علاوہ کچھ نہ تھا جس کی تیزابی ہماری نظم پر اپنی جڑوں کے مہلک ریشے پھیلا رہی تھی۔ بہر حال میرا جی نے سوچنے کا ایک ایسا طریقہ بخشا جس نے شخصیت کے داخلی امکانات روشن تر کر دیئے اور جس سے آنے والے نظم نگار دیر تک بھٹکنے سے بچ گئے۔ مگر میرا جی کی سادیت ان کے لئے بڑی ضرر رساں ثابت ہوئی کیونکہ جب تک لہو کے فوارے نہ چھوٹ رہے ہوں جسم میں خنجر نہ اتر چلے ہوں وہ ادھر متوجہ ہی نہیں ہوتے تھے:-

مری نگاہوں کے دائرے میں
رگوں سے خوں کی ابلتی دھاریں
نکل نکل کر پھسل رہی ہوں
پھسلتی جائیں

(By the way, my good friend, critic and poet foruq hasan should take note.)

خون کا بیان لازماً رومانیت کی نشانی نہیں ہے)۔

اس زاویہ نگاہ کے باعث میرا جی کا احاطہ نظر مسدود اور محدود ہوتا چلا گیا۔ جب ساحل بہنے لگے تو اہل ساحل صرف نظارے کے سزاوار نہیں رہ سکتے کہ ساحل کو بچانے

کی فکر کچھ کم ضروری نہیں۔ میراجی نئی نظم کو خام مواد اور امکانات کا ایک نیا ذخیرہ دے گئے۔ یہ کام بہت اہم سہی لیکن یہی تو سب کچھ نہیں۔ وہ اچھے شاعر نہیں مگر ایک اہم شاعر ہیں۔ بڑے شاعر بھی نہیں حالانکہ اس کے امکانات ان میں ضرور تھے۔ اس کا پہلا سبب بیان کا الجھاوا ہے جو نظم میں طول کلام کے باعث پیدا ہوتا ہے۔ ایک چابک دست نظم نگار اپنی نظم ایک خاص Climax کی طرف لے جاتا ہے اور اگر اپنی منزل تک پہنچنے میں اس کی سانس ٹوٹ گئی تو نظم میں جھول آ جاتا ہے اور بارہا ایسا ہوتا ہے کہ پچھلے سرے کو اگلے سرے سے جوڑنے کے لئے وہ کچھ ایسے خارجی عوامل کا سہارا لیتا ہے جن کا اس نظم کے موضوع سے کوئی تعلق نہیں ہوتا اور وہ جوڑ ہمیشہ اپنی بدنمائی اور بد ہیئتی کا احساس دلاتے رہتے ہیں۔ ایسا کیوں ہوتا ہے؟ اس کا بس ایک جواب ہے' زبان پر کمزور گرفت اور روایت سے سوتیلی آشنائی !! ایسٹ نے پونڈ کی نظموں کا دیباچہ لکھتے ہوئے جو بنیادی بات روایت اور جدیدیت کے بارے میں کی ہے وہ دل کو لگتی ہے۔ "جدیدیت بغیر روایت کے ایک بے معنی لفظ ہے اور اگر کہیں کوئی ایسا ادب موجود ہے جو جدید تو ہے لیکن روایت سے اس کا کوئی علاقہ نہیں' تو میں اسے منسوخ کرتا ہوں۔" اگر لکھنے والے کی جڑیں اپنی روایت کے چاروں طرف پھیلی ہوئی نہیں ہیں تو وہ گھورے پر اگا ہوا ایک ایسا ککرمتا ہے جس کی چھتری ہوا کا ایک جھونکا بھی برداشت نہیں کر سکتی۔ اگر کوئی شخص اردو میں لکھ رہا ہے تو اسے معلوم ہونا چاہئے کہ 1983ء تک خیال اور احساس اور زبان نے کہاں تک سفر کیا ہے۔ لکھنے والے کا پڑھنا بھی ضروری ہے اور پڑھ کر بھول جانا بھی کہ وہ کہیں کلیشے میں نہ گم ہو جائے۔

میراجی روایت سے ناآشنا اتنے تو نہیں ہوں گے جتنے وہ اپنی نظموں میں لگتے ہیں مگر وہ اردو شاعری کی مصنوعی زبان کو توڑنے کی دھن میں پل بنانا بھول گئے۔ اسی لئے ایک خلا کا احساس ہوتا ہے۔ پھر ان کی زبان اردو ہوتے ہوئے بھی گاہے گاہے الگ تھلگ نظر آتی ہے' اس کی وجہ ان کی حد سے بڑھی ہندیت ہے۔ میں ہندی الفاظ کا خود بہت قائل ہوں کہ اردو میں ان کا بڑا دخل اور عمل ہے مگر اردو کا ایک اپنا آہنگ ایک اپنا مزاج ہے جو کئی زبانوں کے میل جول سے پیدا ہوا ہے۔ دکھ 'ہندی ہے ۔

میں اور دکھ تری مژہ ہائے دراز کا

اب کہئے کیا "دکھ" اب بھی ہندی ہے۔ پتا چلا کہ ایک چیز "اردوانا" بھی ہوتی ہے۔ میراجی اس سے کم کم آگاہ تھے۔

میں ان کا ذکر یہیں ختم کرنا چاہتا ہوں اس لئے آیئے اپنی آسانی کے لئے دو جملے میں یہ کہتا چلوں کہ موضوعات اور نئے مواد کی فراہمی میں میراجی، فیض سے بڑے شاعر ہیں۔ لیکن فیض کی نغمگی اور شعریت جو اچھی شاعری اور بڑی شاعری دونوں کے لئے بے حد ضروری ہے، اس سے ان کا دامن تہی نہ سہی اتنا وسیع ہرگز نہیں ہے کہ ان چیزوں کے لئے پوری گنجائش نکال سکے۔ اگر یہ کمی ان کے یہاں نہ ہوتی تو وہ زیادہ قابل قدر نظم نگار ہوتے، اہم تو بہرحال ہیں، بڑا بننے کے لئے ضروری ہے کہ شاعر کی پوری شخصیت اپنی تمام برائیوں، اچھائیوں، نیرنگیوں، محرومیوں اور آسودگیوں کے ساتھ شعر میں ڈھل جائے کیونکہ نہ زندگی جوئے کم آب ہے نہ آدمی کسی جوئے کم آب کا کشتی راں۔ یہ دونوں ہمہ گیر، رنگا رنگ اور بے شمار زوایا کی وسعتیں اور گنجائشیں اپنے اندر رکھتے ہیں۔ کوئی صرف ایک جذبے یا زندگی کے ایک رخ کو کہاں تک بلو سکتا ہے۔

راشد نے بھی ستاروں کی اسی چھاؤں میں سفر کا آغاز کیا، ان دونوں کی ابتدائے مسافرت کا زمانہ لگ بھگ ایک ہی ہے۔ لیکن راشد کی شخصیت اتنی گنجلک اور پیچ دار نہیں ہے کہ بیان کی راہ میں دقتیں پیدا کرتی۔ اس سے کہیں یہ مطلب نہ نکال لیا جائے کہ وہ سطحی آدمی ہیں۔ سطحی اور بے تہ ہونا اور بات ہے اور پیچ دار نہ ہونا دوسری بات۔ اس میں ایک نمایاں فرق ہے جو آپ جیسے ذہین قاری کے لئے تشریح کا محتاج نہیں۔

راشد کی ابتدا بہت فطری ہے۔ اور وہی ہے جو ہر نوجوان کا حصہ ہے۔ شروع جوانی میں عموماً سب پر یکساں گزرتی ہے۔ کبھی اپنی کزن، پڑوسن یا کلاس فیلو سے نیا نیا عشق کرتے ہیں، حرف مطلب زبان پر لانے سے جھجکتے ہیں۔ اور اپنی اسی جھجھک کو محبوبہ کی بے التفاتی، ناشناسی اور بے وفائی پر محمول کرتے ہیں:

سوچتا ہوں کہ غم دل نہ سناؤں اس کو
وہ محبت کی بھلا تاب کہاں لائے گی

راشد پر بھی اپنے ہمعصر بزرگ اختر شیرانی کا گہرا اثر تھا۔ "ماورا" کے تمام سانیٹ "ایک دن لارنس باغ میں" "رخصت" "میں اسے واقف الفت نہ کروں" ——— سے

لے کر "رفعت" تک آ جایئے اختر شیرانی کہیں نہ کہیں جھلکتے ہوئے آپ کو نظر آ جائیں گے۔ مجھے ان کی ایک نظم میں گرے کی 'ELEGY' کا سایہ بھی نظر آیا ہے، "شام ہونے کو ہے اور تاریکیاں چھانے کو ہیں" ـــــــ کہیں کہیں اقبال کی گھن گرج بھی سنائی دی ہے۔ "رہی ہے حضرت یزداں سے دوستی میری" یا "دل اہرمن سے رہا ہے ستیزہ کار مرا" وغیرہ وغیرہ۔ یہی نہیں فطرت کی نیرنگیاں اور رنگینیاں جو کولرج اور ورڈس ورتھ سے نکل کر اقبال اور اختر شیرانی کے ذریعے ہم تک پہنچی تھیں، سب کچھ آپ کو مل جائے گا۔ یہ عبوری دور Cliches سے بھرپور ہے، اور راشد اپنی آواز پانے کے لئے ادھر ادھر تاک جھانک کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ اس کلام کی اتنی اہمیت ضرور ہے کہ یہ سب کچھ فطری ہے اور بس۔ اس کے علاوہ کچھ نہیں۔ کیونکہ راشد سے ملاقات کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ راشد سے ملاقات کی جائے نہ کہ اختر شیرانی اور ورڈس ورتھ سے، میں نے کہیں یہ بھی نہیں کہا کہ یہ حصہ عضو مفلوج ہے، راشد کو سمجھنے اور ان کی جڑوں کا سراغ لگانے کے لئے اس کا مطالعہ ناگزیر ہے اور اہم اتنا کہ بغیر اس کے ان کے ذہنی ارتفاع اور ارتقاء کا علم ناممکن ہے۔

"جرات پرواز" سے وہ اپنی آواز منفرد کرنے میں پوری طرح کامیاب ہوئے۔ یہ نظم ہیئت کے اعتبار سے اردو نظم کی تاریخ میں ایک اہم موڑ کی حیثیت بھی رکھتی ہے۔ ممکن ہے اس سے پہلے بھی بعض لوگوں نے آزاد نظموں کے کچھ تجربے کئے ہوں یا خود راشد نے کچھ اور نظمیں لکھی ہوں لیکن انہیں کامیابی بہرحال پہلی بار اس نظم میں حاصل ہوئی ہے۔ اس نظم سے آزاد نظم کے بہت سے رموز اردو میں پہلی بار آشکار ہوئے اور اس پر راشد کی فنی دسترس کا راز بھی کھلا:

بجھ گئی شمع ضیا پوش جوانی میری
ہو گئی ختم کہانی میری ـــــــ "

یہ خیال مدت سے ذہنوں میں ریشہ دوانیاں کر رہا ہے کہ کس غمناک جذبے کے اظہار کے لئے ضروری ہے کہ آواز بھی منمنی اور لجلجی ہو، یہ کج فہمی ہے جس کی وجہ جھوٹ اور مکر کی وہ ریشمی چادر ہے جو ناپختہ شاعروں نے اوڑھ رکھی ہے۔ اور اگر آپ ان کے مومیائے چہروں کے نیچے تجسس کی قندیلیں روشن کریں اور اس موم کے پگھلنے کا

انتظار کریں تو اندر سے ایک ایسی شخصیت ابھر کر سامنے آجائے گی جو خواہ اور کچھ بھی ہو غم زدہ یا افسردہ ہرگز نہیں ہو گی۔

راشد کے لہجے کا آہنگ طربیہ ہے۔ لیکن افسردگی کی ایک رو زنجیر کی طرح ان کے لہجے سے لپٹی ہوئی ہے جو بادی النظر میں بجھائی نہیں دیتی۔ عورت ہو یا ایشیا' عشق ہو یا دنیا' راشد نے اپنے آپ کو سب کے لئے سلگایا ہے اور ان کا دل ایک ہی رفتار سے سب کے لئے دھڑکا ہے۔

میرا جی نے جو خواب دیکھے تھے مجھے ان کی تعبیریں راشد کے یہاں نظر آتی ہیں' انہوں نے جن امکانات کی طرف مبہم اشارے کئے تھے راشد نے ان میں سے بیشتر کو پورا کیا۔ یہ ایک بہت اہم فریضہ تھا۔ اور راشد سے چھوٹا آدمی اسے پورا کرنے کی صلاحیت بھی نہیں رکھتا تھا۔ یہ تو ہوئی میرا جی کے خوابوں کو پورا کرنے کی بات۔ لیکن راشد نے بھی تو آخر کچھ خواب دیکھے ہوں گے۔ ایسے خواب جو یورپ والوں نے دیکھنے شروع کر دیئے تھے اور جن کا ایشیا میں ذکر تک نہ تھا' جو ایشیا والوں تک ابھی نہیں پہنچے تھے:

آج ہم کو جن تمناؤں کی حرمت کے سبب
دشمنوں کا سامنا مغرب کے میدانوں میں ہے
ان کا مشرق میں نشاں تک بھی نہیں !!

راشد کی دنیا ایک دوراہے پر کھڑی ہے' پرانی قدریں نئی قدروں کے تیز ناخنوں سے لہو لہان ہو رہی ہیں۔ محبتیں اور مروتیں کلوں کے پہیوں کے شور کے نیچے دبتی جا رہی ہیں اور بوجھ سے ان کی آنکھیں باہر ابل پڑی ہیں ایک بار پھر موج ہوا میں زنجیر نظر آنے لگی ہے۔ عورتیں مردوں کے شانہ بشانہ رقص کرنا چاہتی ہیں' ہوٹل اور کلب آباد ہوتے چلے جا رہے ہیں اور گھر کا پرانا تصور صابن کے اڑتے ہوئے بلبلے کی طرح فضا میں تحلیل ہوتا جا رہا ہے۔ راشد بے بس ہیں کیونکہ فن کار بے بس ہے اور اس کا سارا کام ان تمام تجربوں سے دوچار ہو کر آج کے انسان کی اسی بے بسی کو ظاہر کرنا ہے۔ انسان نہیں بدلا ہے بلکہ صرف خارجی عوامل زوال آمادہ ہو گئے ہیں۔ راشد کی پوری کوشش رہی ہے کہ وہ اپنے عصر کے آلام اور مصائب کا جامع اور مکمل اظہار کر دیں۔ اس میں وہ کامیاب ہیں۔ آیئے دیکھیں کہ عشق اور زندگی کے بارے میں ان کے رویے میں ایسی کیا

تبدیلیاں ہوئی ہیں جو اگلوں سے انہیں الگ کرتی ہیں اور ہماری نظم میں فکر کا ایک نیا دروازہ کھولتی ہیں۔

اختر شیرانی چلتے چلتے اپنی محبوبہ راشد کے حوالے کر گئے تھے۔انہوں نے جھجکتے جھجکتے جب اس سے اظہار الفت کیا تو وہ شرمائی نہیں یا شاید شرمائی بھی ہو مگر غازے کی تہوں کے نیچے چھپی ہوئی مشرقی شرم کا اندازہ کرنا مشکل تھا اس لئے کہ راشد کو ورثے میں اردو کی جو محبوبہ ملی تھی اس نے اپنے پر پرزے نکالنے شروع کر دیئے تھے۔ اس نے انتہائی بے باکی سے راشد کی باہوں میں باہیں ڈال دیں' وہ جانتی ہے کہ روح کی عظمت کے لئے جسم ایک زینہ نور ہے اور روح کے یونانی تصور کا گراف نیچے کی طرف سرکتا جا رہا ہے راشد اس سے تفریح گاہوں اور رقص گاہوں میں ملتے ہیں اور پھر اس کے جسم کو ایک ناؤ کی طرح کھیتے ہوئے ساحل تک پہنچا آتے ہیں' اور صبح دم دونوں ایک دوسرے کے لئے اجنبی بن جاتے ہیں۔ زندگی بہت مصروف ہو گئی ہے' جانے والا بہر حال چلا جاتا ہے اور صرف اپنی یادیں چھوڑ جاتا ہے۔ یادیں جو ایک نئے تجربے کا نچوڑ ہوتی ہیں۔ راشد کی محبوبہ آج کی عورت ہے جسے اپنے بعض جذبوں کی تسکین کے لئے کسی مصور' کسی شاعر یا کسی افسانہ نگار کی پناہ لینی پڑتی ہے۔ لیکن محبت اس کے لئے ایک خواب فراموش سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتی اور اسے راحت بہر حال سایہ زر ہی میں ملتی ہے۔ اس لئے ان کی محبوبہ اپنے رول کی ادائیگی میں محبوبہ سے زیادہ داشتہ کے قریب نظر آتی ہے۔ راشد کے یہاں اس نئی عورت کے بے شمار روپ دکھائی دیں گے۔ یہ عورت ایک نئے تجربے اور ایک مختلف احساس کو جنم دے رہی ہے' اور عورت کے ان تمام چھپے ہوئے پہلوؤں کی روشنی میں لا رہی ہے جس سے اردو نظم اب تک نا آشنا تھی۔

میرا جی کی آپ بیتی ایک Abnormal کی آپ بیتی تھی۔ اسی لئے جا بجا ان کے جنسی تجربوں سے سڑے ہوئے آٹے کی بھبک اٹھتی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔ چونکہ راشد کے جنسی تجربے ایک آسودہ اور صحت مند آدمی کے جنسی تجربے ہیں اس لئے وہ زیادہ واضح' روشن اور آئینے کی طرح شفاف ہیں۔

اگر کوئی شخص صرف راشد کی انہی عورتوں سے مل لے جو ان کی بے شمار نظموں میں بکھری پڑی ہیں تو وہ آسانی سے اس مشینی دور کے تمام نقائص' عیوب' جنگ زرگری

اور اس سے پیدا ہونے والے نقصانات' اخلاص اور مروت کی ارزانی وغیرہ ——— ان سب کے بھید پا جائے گا۔

جب تجربے میں یکسانیت آ جائے تو اس کا اظہار بھی ویسا ہی ہو گا اور تکرار خود بخود اپنی جگہ بنا لے گی۔ اس سے بچنے کا آسان طریقہ یہ ہے کہ محبوبہ بدل دی جائے۔ راشد اس سے آگاہ تھے اور ہر چند کہ ان کے بعض تجربے یکساں ہیں مگر ان کے اظہار میں تکرار کا شائبہ تک نہیں۔ ان کی محبوبائیں بدلتی رہتی ہیں یہاں تک کہ انھیں مسز سالا مانکا پر قناعت کرنی پڑی:

خدا حشر میں ہو مددگار میرا
کہ دیکھی ہیں میں نے مسز سالا مانکا کی آنکھیں
وہ باہیں وہ رانیں وہ پستاں ——— !!

آخر آخر میں شاید وہ دیکھنے کے سوا کچھ کر بھی نہیں سکتے تھے۔ نورس کلیاں انہیں طعنے دیتی تھیں۔ یہ ان کی عمر کے ڈھلان کا وقت تھا۔

مسز سالا مانکا جیسی عورتیں انہیں اپنے پستان ضرور دکھا سکتی تھیں لیکن ان پستانوں کو شعر بنانے میں ان کی کوئی مدد نہیں کر سکتی تھیں۔ یہ شاعری نہیں ہے ——— یہ Statement ہے اور اس کے سائے مجھے اکثر ان کے یہاں نظر آتے ہیں۔ میرا خیال ہے ایسی نظموں کی حیثیت اخباروں میں چھپی ہوئی سنسنی خیز خبروں سے زیادہ نہیں۔

میں نے راشد کی محبوباؤں کا ذکر کچھ زیادہ ہی کر دیا ہے۔ مگر ان کی شاعری اور ان کے رویے کو سمجھنے کے لئے یہ بہت ضروری تھا۔ اس لئے بھی کہ زندگی کا کیسا ہی الجھا ہوا مسئلہ ہو راشد اسے عورت کے خردبین سے دیکھنے کے عادی ہیں۔ انکی یہ بڑھی ہوئی جنسی تشنگی اور ہوس کی غلامی کبھی کبھی سخت ناگوار گزرتی ہے۔ سوسائٹی لاکھ مصنوعی سہی' زندگی کی اعلیٰ قدروں پر اعتبار ضروری ہے اور فن کار کو بہتے ہوئے ریلے کے ساتھ نابدان میں اترتے وقت کم سے کم ایک بار ضرور ہچکچانا چاہئے۔ ہچکچاہٹ شاعری میں کشمکش کا پیش خیمہ ہوتی ہے۔ راشد جیسے فن کار کے یہاں' اس کشمکش کا عنقا ہونا' بڑے تعجب کی بات ہے۔

نان جویں کے حصول میں اس آدمی کے لئے دشواریاں ہیں جس کے سینے میں ننھی

سی خودی کی قندیل بھی ٹمٹما رہی ہو۔ غلام ہندوستان میں آقاؤں نے اس پر کچھ ایسے پہرے لگا دیئے تھے کہ اس تک پہنچنے کے لئے اس قندیل کا بجھنا ضروری تھا ورنہ تلاش بسیار کے بعد بھی روٹی نہیں مل سکتی تھی۔ ظاہر ہے ہر حساس دل اس پر کڑھا ہو گا۔ راشد کی نظم "دریچے کے قریب" ان زنجیروں کے خلاف ایک احتجاج ہے ــــــ احتجاج جو راشد کی عالمانہ بصیرت کے باعث عامیانہ نہیں ہوا بلکہ یہ نظم ہمیں بیان اور جذبے کے نئے اور پیچ در پیچ راستوں سے گزار کر ایک ایسے موڑ پر کھڑا کر دیتی ہے جہاں Ideal کی شکست کی آوازیں صاف سنائی دیتی ہیں۔ یہ شکست ہمیشہ سے آدمی کا مقسوم رہی ہے لیکن راشد نے اسے راہ کی دیوار نہیں بننے دیا۔ اور انہیں مسجد کے میناروں کی رفعت سے آدمی کی برسوں کی تمنا کا خیال آتا رہا۔ چونکہ یہ المیہ ان کی ذات کا ایک حصہ ہے اس لئے یہ کسی بھی آدمی کا المیہ ہو سکتا ہے۔ اپنی ذات سے کائنات تک پہنچنے کا ایک فائدہ یہ بھی ہے کہ شاعر اپنے محسوسات کے دائرے میں رہ کر سب کچھ کہتا ہے اور جو بھی ادھر سے گزرتا ہے وہ اس کا اپنا مسئلہ بن جاتا ہے۔

جب ریخت اور شکست کا سلسلہ جاری ہو تو فن کار کا Frustrated ہو جانا یقینی ہے۔ لامحالہ اس کا اظہار بھی ہو گا۔ اطراف و جوانب میں شور بڑھتا جا رہا ہے اور آدمی اپنے آپ میں بند ہوتا' سکڑتا چلا جا رہا ہے۔ کوئی صورت نظر نہیں آتی۔ روشنیاں تاریکیوں کے جال بن رہی ہیں اور تنہائیاں روح کے زخموں کو کرید رہی ہیں۔ زندگی نہ جانے کس خرابے کی طرف لئے جا رہی ہے۔ آخر یہ سب کیا ہے؟ کیوں ہے؟؟

لب بیاباں' بوسے بے جاں' مطلب آساں
حرف بے معنی' تبسم کے حسابی زاویے
شام کو جب اپنی غم گاہوں سے دزدانہ نکل آتے ہیں ہم
کون سی الجھن کو سلجھاتے ہیں ہم ــــــ؟

یہی نہیں ایک انجانا خوف بھی زمین پر سایہ فگن ہے۔ جانے اس تودۂ خاک کی تقدیر میں کیا لکھا ہے۔ کچھ ہونے والا ہے۔ جانے کیا ہو گا۔ سایہ تعاقب میں ہے۔ سائے سے نجات نہیں:

کسی خواب آلودہ سائے کا پیکر

کہاں تک ترے گوش شنوا، تری چشم بینا
ترے قلب دانا
کا ملجیٰ و ماویٰ بنے گا؟؟

اور اس خوف کے تعاقب نے ہر انسان کو ویران تر کر دیا ہے۔ یہ صحرا راشد کے دل میں بھی پھیل رہا ہے اور انہوں نے نہایت سچائی سے اس ویرانی کی آوازیں ہم تک پہنچا دی ہیں:

کیا ہمارے نصیبے میں افتاد ہے؟
کوئی رفعت نہیں؟
کوئی منزل نہیں؟؟

راشد کے یہاں بھی علامتوں کے دلیلوں کی بڑی لانبی قطار ہے، یوں تو علامتوں کی توجیہہ ہر قاری یا سامع اپنے طور پر کرتا ہے لیکن ضروری ہے (can't insist enough I) کہ لکھنے والا انہیں برتتے وقت، اپنے اندر بہت واضح اور صاف ہو۔ ورنہ بات الجھ جائے گی۔ اس لحاظ سے "سباویراں" اردو کی صف اول کی نظموں میں جگہ پانے کی مستحق ہے جس میں یہ دور اپنی پوری ویرانیوں کے ساتھ اجاگر ہوا ہے۔ پہلی بار جب یہ نظم میں نے پڑھی تھی تو مجھے "سبا" .U.N.O کا سمبل لگا تھا، دوبارہ پڑھی تو زندگی یا کائنات کا سمبل معلوم ہوا تھا اور اب مجھے یہ جسم کا سمبل معلوم ہوتا ہے۔ آج کے آدمی کا جسم جو ایک اجڑے ہوئے شہر کے ویران کھنڈر کے علاوہ اور کچھ نہیں۔

سلیماں سر بہ زانو اب کہاں سے قاصد فرخندہ پے آئے؟

راشد تمام ماتموں میں شریک رہے ہیں اور انہوں نے ان تمام دشمنوں کے خلاف آواز اٹھائی ہے جو انسانیت سوز مظالم کے لئے جواز ڈھونڈھتے ہیں اور تہذیبوں کو اپنے ناپاک قدموں تلے روندتے ہوئے آگے بڑھ جاتے ہیں۔ راشد نے اس کے لئے نہ کسی تحریک کا سہارا لیا اور نہ اس کی ضرورت باقی رہ جاتی ہے اور اسی لئے آج میں یہ کہتا ہوں کہ وہ ہمارے سب سے بڑے ترقی پسند شاعر ہیں۔ یاد رہے کہ میں ترقی پسندی کو اس کے اصلی معنوں میں استعمال کر رہا ہوں۔ اس کا سردار جعفری اور سجاد ظہیر والی ترقی پسندی سے کوئی تعلق نہیں۔

راشد کی شاعری ایک ایسے آدمی کی شاعری ہے جو عشق بھی کرتا ہے جس کی شب باشی کے لئے عورت بھی چاہیے' جس کی روح زخمی ہے' جس کا جسم پکارتا ہے' جسے بھوک بھی لگتی ہے' جو غلام بھی رہ چکا ہے۔ جس کی آنکھوں میں خواب بھرے ہوئے ہیں' جو دوسروں کے غموں پر آنسو بہانا بھی جانتا ہے اور اپنے زخم اور کوڑھ دوسروں کو دکھاتا بھی ہے۔ ان کے پاس تجربات' مشاہدات اور موضوعات کا ایک ایسا رنگا رنگ ذخیرہ ہے جو ہمارے کسی نظم نگار کے یہاں نہیں ملے گا۔

آخر آخر میں یہ کہ راشد کی ایرانی اردو مجھے سخت پریشان کرتی ہے۔ "زنبور"؟ "زمستاں"؟ "زنگولے" اور "گلولے" ایسے مہاجر الفاظ ہیں جن کی آبادکاری ہمارے یہاں کبھی نہ ہو گی۔ یہ الفاظ ہمارے ذہنوں میں وہ شبیہیں جگانے میں ناکام رہتے ہیں جو شاعر کا مقصود ہے۔ یہ دوری اس لئے ہے کہ ان کا ہمارے روزمرہ کے استعمال سے کوئی علاقہ نہیں۔ کسی اردو پڑھنے والے کے ذہن میں "زنبور" تا حشر وہ Image نہیں بیدار کر سکتا جو "بھونرے" سے پیدا ہو جاتا ہے' ہماری سماعت اور بینائی' دونوں سالہا سال سے بھونرے کو جانتی پہچانتی چلی آ رہی ہے۔ "زنبور" ان کے لئے کسی عجوبے سے کم نہیں۔

حرفِ ناگفتہ

راشد کے نام تین خط

(1)

لندن

پہلی جنوری 75ء

راشد صاحب'

بزرگ شعراء کی اس کھیپ میں' جس میں آپ کے علاوہ میرا جی اور فیض بھی شامل ہیں' میں آپ کا سب سے زیادہ قائل ہوں۔ جس طرح آپ اور فیض' اقبال اور اختر شیرانی کے احتشام اور اضمحلال سے پہلے متاثر اور پھر نبرد آزما ہوئے' اسی طرح تقسیم کے بعد پروان چڑھنے والے شاعروں کی نظم نگار نسل' فیض اینڈ کمپنی کی ساحرانہ آواز کے ساتھ چلتے چلتے' 1960ء کے دوراہے پر میرا جی کے سائے سائے' آپ کی شاعری کے پیچ دار زینے سے اترنے لگی۔ میرے کہنے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ یہ عمل یکایک ہوا نہ یہ کہ یہ کوئی جارحانہ فعل تھا جس کے پیچھے کسی سوچی سمجھی اسکیم کا دخل تھا بلکہ نام نہاد ترقی پسند شاعری کے جبڑے جگالی کرتے کرتے تھک گئے تھے۔ نئے لوگوں کے لئے ترقی پسندوں کے الفاظ' افکار اور اظہار کی یکسانی ایک قبائے تنگ تھی جس میں جدید شاعری کے رموز اور اسرار کی دھجیاں نہیں لگائی جا سکتی تھیں' پھر پیوند کاری شاعری کا شعار بھی نہیں۔ ادھر پچھلی ربع صدی میں اس کرۂ ارض پر ایسی ناگہانی تبدیلیاں رونما ہوئیں کہ آدمی کی سانس اکھڑ گئی' فاصلوں کا سکڑنا اور دور دراز کے گونگے براعظموں کے مسائل کی

یگانگت، اظہار کے پیچیدہ وسائل مانگتی تھی۔ میرا جی کی طرف پھر آپ کی طرف نئے نظم نگاروں کی ہجرت بلا سبب نہیں تھی۔ اسی ہجرت یا مراجعت سے نئی نسل کے مسائل پیدا ہوئے۔ اگر 1916ء کو یورپ میں جدید شاعری کا نقطہ آغاز مان لیا جائے تو یہ کوئی ساٹھ سال پرانی ہوئی۔ اپنے یہاں ابھی اس کا چالیسواں ہو رہا ہے۔ چالیس سال میں کوئی عظیم روایت نہیں بنتی۔ اس لئے میر، غالب یا اقبال کی تمنا فضول ہے کہ ان کی شاعری کی پشت پناہی کے لئے فارسی میں اظہار اور اسلوب کی صدیوں پرانی عظیم روایات کھڑی تھیں اور جدید شاعر کو، آپ ہی کے الفاظ میں، اظہار اور رسائی کی نئی روایات بنانی پڑیں۔ یہ بذات خود ایک بہت اہم اور بڑی قابل قدر بات ہے اور جدید اردو نظم اپنے پیش رووں میرا جی، راشد اور فیض کی ہمیشہ احسان مند رہے گی۔ اور یہیں سے آپ کے بعد کے آنے والوں کی الجھن بڑھتی ہے۔ اسلوب سے روشناس ہونے کے بعد آدمی خیال اور جذبے سے ہمکنار ہوتا ہے اور جدید شاعری کے ایک ادنیٰ طالب علم کی حیثیت سے مجھے یہ کہتے ہوئے دکھ ہوتا ہے کہ آپ تینوں کی شاعری اس عظمت سے خالی ہے جو، مثال کے طور پر، انگریزی کی جدید شاعری کے پہلے تیس برس میں ییٹس، پونڈ اور الیٹ کے یہاں ملتی ہے۔ اس سے کہیں یہ نہ سمجھ لیجئے کہ ان تینوں کا سارا کلام میری سمجھ میں آگیا ہے۔ مگر انریزی کے تنقید نگاروں کی رہنمائی سے اور اپنی عاجزانہ جستجو سے میں نے ان کی بنیادی علامات کی کلید کا سراغ ضرور لگایا ہے اور اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ جدید دنیا کے پیچ در پیچ مسائل کے اظہار کے لئے ان کی شاعری نے اس استعارے کو جنم دیا ہے جو صرف ذہنی اور جذباتی پیچیدگی سے پیدا ہوتا ہے۔

فیض کے یہاں پیچیدگی تو کیا، خیال اور جذبے دونوں کی نیرنگی کا عجز موجود ہے جس کا ذکر میں اپنے ایک مضمون میں خاصی تفصیل سے کر چکا ہوں۔ میرا جی کے یہاں جذبات کی وہ جدید پیچیدگی موجود ہے جس کے بغیر اظہار ذات ناممکن ہے اور آپ کے یہاں پیچیدہ خیالات کی وہ رفعت تو ہے جو جدید شاعری کو درکار ہے اور "ماورا" سے لا = انسان تک خیال کی ایک پیچواں جہت بھی ہے مگر جذبات کی وہ پیچیدگی نہیں ملتی جو میرا جی کا مقدر تھی۔ آپ کہیں گے اس کا سیدھا جواب تو یہ ہے کہ آپ میرا جی نہیں ہیں۔ مگر میں تو کسی اور ہی المیے کی طرف اشارہ کر رہا ہوں۔ آپ کے یہاں خیالات کی پیچیدگی تو

بڑھتی جاتی ہے مگر جذبات کو سلجھانے کی تمنا آخر اتنی شدید کیوں ہے؟ مجھے ایسا لگتا ہے کہ آپ اپنے خیالات سے مطمئن اور جذبات سے خوفزدہ ہیں۔ اگر ایسا ہے تو یہ کشمکش آپ کی شاعری میں کیوں نہیں آئی؟

آپ کا۔ ساقی

ان تینوں خطوط کو مزید سمجھنے کے لئے ان تینوں خطوط کو دیکھئے جو راشد صاحب نے جواباً لکھے تھے اور "نیا دور" کے راشد نمبر میں موجود ہیں۔ ساقی

(2)

لندن - 20 جنوری 75ء

راشد صاحب۔ آپ کا 15 جنوری والا خط ملا۔ بصیرت حاصل ہوئی۔ فنی، علمی اور ادبی اداروں کی نایابی اور عزلت پسند معاشرے کی لاپروائی کے باب میں جو باتیں آپ نے کی ہیں وہ خیال انگیز بھی ہیں اور عبرت آموز بھی۔ مگر آپ یہ کیوں بھولتے ہیں کہ ہم نرم گام لوگ ہیں اور باد مغرب کی سنسناہٹ سے ڈرتے ہیں۔ اور شاید تیز رفتار مغرب کے پس منظر میں ہماری سست رفتاری کے کچھ نئے معانی بھی بنتے ہوں۔ میں گیارہ اور آپ بائیس سال سے ملک سے باہر ہیں۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ مشرق کے مسائل کے حل کے لئے ہم مغرب کا انداز نظر ڈھونڈ رہے ہیں۔ ہم اپنی اصل سے کٹ کر اپنے اندر سمٹ تو نہیں گئے ہیں۔ ذلت اور شکست کے جس دوزخ سے ہمارا پاکستان گزرا، میں اور آپ، دونوں اس کے تماشائی رہے۔ آخر تماشا بننے کے بھی تو کچھ آداب ہوں گے۔ یہی ذلتیں اور شکستیں تو ادب کی میراث ہیں۔ انہیں ذلتوں اور شکستوں سے تو "ماورا" کا خمیر اٹھا تھا۔ جب تک اپنی مٹی میں اپنے قدم مضبوطی سے جمے ہوئے نہ ہوں یا ادیب ان تجربات سے نہ گزرے جس سے وہ خطۂ زمین گزرا جس کی خوشبو اس کے مشام جاں میں بسی ہوئی ہے تو وہ بڑا ادب پیدا کرنے کا اہل نہیں۔ یعنی وہ لکھے گا تو پھر بھی کہ یہ اس کی سرشت ہے مگر وہ جہاں گیری اس کی دسترس سے باہر ہو گی جو اسے جغرافئے سے آگے نکالے۔ ٹیگور کی آفاقیت سے اگر بنگال کو نکال دیا جائے تو وہ ہوا میں لٹکے نظر آئیں گے۔ کھلا کہ سرحدوں سے وفاداری ہی آدمی کو سرحدوں سے باہر لے جا سکتی ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ سرحد سے کیا مراد ہے اور مٹی کا رشتہ کیا ہوتا ہے۔ کیا آدمی تمام عمر چک لالے

پر لکھے اور ٹنڈو آدم پر ادب پیدا کرے۔ آخر وفاداری کے معنی کیا ہیں۔ میری ناچیز رائے میں جب ای۔ ام۔ فوسٹر صاحب دوستی پر ملک کو قربان کرنے کی بات کرتے ہیں تو وہ ملک سے غداری نہیں کر رہے بلکہ یہ تو اس ادب، فلسفے، فکر اور زمین سے وفاداری ہے جس کے باعث انہیں سوچنے کی یہ جسارت ہوئی (اور کسی نے انہیں قتل بھی نہیں کیا) سرحد اور سرحد میں بڑا فرق ہے۔ ادیب اور شاعر کی سرحدیں عام آدمیوں کی سرحدوں سے مختلف ہوتی ہیں۔ (یاد رکھئے کہ عام آدمی کی مزید تحقیر کے لئے ای ای کمنگس نے "عام" اور "آدمی" کو ملا کر Most - People لکھا ہے) ادیب اور شاعر جب عام آدمیوں کی سرحدوں کو اپنی سرحدیں سمجھنے لگتا ہے تو "شکوہ" اور "جواب شکوہ" لکھتا ہے ——" مسدس" اور "شاہ نامہ اسلام" لکھتا ہے۔

بیدار ادیب اور شاعر اپنے گرد اپنے ادب اپنے ماضی اور اپنے کلچر کا حصار بناتے ہیں۔ اور اسی حصار سے اپنی طاقت اخذ کرتے ہیں۔ اسی طاقت سے حصار سے پرے دیکھنے کی تمنا پیدا ہوتی ہے۔ اور یہی تمنا انہیں عام آدمیوں سے ممتاز کرتی ہے۔ وہ چاہے قبرص میں رہیں چاہے برازیل میں، جب تک وہ اپنے حصار میں ہیں انہیں بیرونی حملوں سے کوئی خطرہ نہیں۔ خطرہ صرف اس وقت پیدا ہوتا ہے جب آدمی کسی احساس کمتری کا شکار ہو جائے۔ اور حصار پر اعتبار نہ رہے۔ یہی بے اعتباری انیس ناگی اور افتخار جالب جیسے لوگوں کو پیدا کرتی ہے جو اپنے اپنے ٹنڈو آدم میں بیٹھے لندن، پیرس اور نیویارک سے خیال اور اسلوب کی بھیک مانگتے ہیں اور یہ بھول جاتے ہیں کہ دوسرے سورج اس وقت تک روشنی نہیں پہنچاتے جب تک اپنے چاند سے گہری آگاہی نہ ہو۔ آپ کیا کہتے ہیں؟

جب آپ بین الاقوامی ادب کی بات کرتے ہیں تو کیا آپ کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ حصار ٹوٹ کر ایک ہو جائیں اور اپنی مقامی حیثیت کھو دیں یا یہ کہ ہر حصار اپنی جامعیت باقی رکھے اور دوسرے حصار تک پہنچنے کی کوشش کرے۔ فاصلوں کے سمٹنے کے معنی یہ تو نہیں کہ آدمی عہد کے مزاج کو سمجھنے کی کوشش میں اپنے ادب اور اپنی زبان کا مزاج بھول جائے۔ کسی ادیب یا شاعر کا دائرہ تاثر و رسوخ اس کی زبان کے دائرہ تاثر و رسوخ کے باہر نہیں ہوتا۔

میں جب جدید شاعری کی بات کرتا ہوں تو میری مراد اردو جدید شاعری، فرانسیسی

جدید شاعری اور انگریزی جدید شاعری ہوتی ہے یعنی کسی زبان کی جدید شاعری صرف اسی زبان کی قدیم شاعری کے پس منظر میں سمجھی جا سکتی ہے۔ اور اسی لئے الیٹ کی یہ بات کہ زندہ فن کاروں کی اہمیت صرف اس ادب کے مردہ فنکاروں کے رشتے سے ہے' بہت دور رس مطالب رکھتی ہے۔ شاعری کا حریر دو رنگ جدید اور قدیم سے ضرور بنتا ہے' اس کی معراج یہ ہے کہ وہ حریر ہو۔ مجھے افسوس ہے کہ میں نے اپنے پچھلے خط میں اپنی کوتاہ قلمی کے باعث' جدید و قدیم کی بحث کو الجھا دیا۔ آپ کا طعنہ بے جا نہیں۔ بات چونکہ جدید شاعری کی ہو رہی تھی اس لئے میں نے "رموز و اسرار" والی بات لکھی تھی۔ ویسے جدید شاعری کے رموز و اسرار وہی ہیں جو قدیم شاعری کے رموز و اسرار ہوں گے۔ اور ان معنوں میں یہ کلیشے کہ ہر سچا اور اچھا لکھنے والا اپنے زمانے میں جدید ہوتا ہے' غلط نہیں ہے۔

اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ ہر گزرتا ہوا لمحہ شاعر کی ذات پر منکشف ہوتا رہے۔ یہ انکشاف گزرے ہوئے لمحوں کی رہنمائی کے بغیر نہ ہو اور شاعر کی ہنرمندی یہ ہو کہ اس کے عہد کا اسلوب جس طرح اس کی ذات پر منعکس ہو رہا ہے اس کے الفاظ میں ممکن سچائی یا پوری سچائی کے ساتھ آ جائے۔ اس لئے ناصر کاظمی کا انکشاف فراق گورکھپوری کے انکشاف سے مختلف ہو گا یا سلویا پلاتھ کی بغاوت ڈبلو۔ اچ۔ آڈن کی بغاوت سے علیحدہ ہو گی کہ ہر تغیر شاعر کے محسوسات کے ذخیرہ میں شامل ہوتا جاتا ہے۔ مگر پچھلے پچاس سال کے عرصے میں جدیدیت کے معنوں میں بھی تبدیلی آئی کہ اس تغیر میں رفتار کا ہولناک عنصر بھی شامل ہو گیا۔ اور آج سے پہلے جس نرم روی سے کائنات کی دریافت ہو رہی تھی اس میں بجلی کی سی تیزی آ گئی۔ اور نئے علوم اور ترسیل کے نئے وسائل کے باعث' کسی گزرتے ہوئے لمحے میں' کئی چیزیں ایک دم سے شاعر کی ذات پر اثر انداز ہونے لگیں۔ اس پیچ دار لمحے کی گرفت کے لئے ظاہر ہے شاعر کی شخصیت کا پیچ دار ہونا بھی ضروری امر ہے۔ میں جب پیچیدگی کی بات کرتا ہوں تو اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ہر نظم بھول بھلیاں بن جائے۔ نہیں صاحب نہیں۔ میں تو صرف یہ کہنا چاہتا ہوں کہ جب کسی شاعر کا مجموعہ آپ کے ہاتھ میں ہو تو آپ کو پتا چلے کہ اس شاعر کی ملاقات بنتے بگڑتے' ٹوٹتے پھوٹتے' جلتے بجھتے' بے تہہ اور تہہ دار تمام لمحوں سے ہوئی ہے۔ اور

اگر ایسا ہو گا تو اس کے یہاں کسی خیال کی چمک، کسی احساس کا نرالا پن، کسی لفظ کی تازگی، کسی اسلوب کا بانکپن ضرور نظر آئے گا کہ ن۔م۔ راشد کا عہد غالب کا عہد نہیں ہے اور نہ ن۔م۔ راشد غالب ہیں۔ نئے شاعروں کے نام چلی کے مشہور یا دوسرے مشہور شاعر پارانے کہ یہ قد اور عمر دونوں میں نرودا سے چھوٹے ہیں، ایک بڑی بانکی نظم لکھی تھی اور ختم کچھ اس طرح کی تھی "جو چاہے لکھو، جس طرح چاہے لکھو، صرف ایک شرط ہے کہ خالی صفحے میں اضافہ ضرور ہو۔" اضافہ میں Improve کے معنوں میں لکھ رہا ہوں۔ ہمارے یہاں سیکڑوں نظمیں لکھی جا رہی ہیں مگر صفحے خالی کیوں ہیں۔ شاید یہ شرط بہت کڑی ہے۔ میرا ذہن کام نہیں کر رہا۔ وسکی چڑھ رہی ہے۔ شب بخیر۔

آپ کا۔ ساقی

(3)

لندن

15 مئی 1975ء

راشد صاحب! اب کے آپکے خط کے جواب میں عمداً تاخیر ہو گئی یعنی وہ نظمیں عناں گیر تھیں جو میں نے پچھلی صحبت میں آپ کو اور عبداللہ حسین کو سنائی تھیں اور کاہلی الگ تھی، اس لئے معاف کر دیجئے۔

میں خطوں کے اس سلسلے کو سوال جواب کی کتاب نہیں بنانا چاہتا اور ہر چند کہ ہمارے ادب کے حلال خوروں کی تنقید کے مذبحوں میں "جھٹکے" کی رسم عام ہے، مسئلہ بات کو آگے بڑھانا ہے بات کو ختم کرنا نہیں۔ آپ کے ادراک اور میری جہالت کے توسط سے اگر ادب اور ادب کے رشتے سے زندگی کے بارے میں دو نسلوں کے متوازی تعصبات سامنے آجائیں تو شاید بات آگے بڑھے۔ اور جیسا کہ کتابوں میں لکھا ہے ادب کا موضوع آدمی ہے یعنی "آدمی" کا "انسان" کی طرف سفر۔ اور آدمی کوئی جوہری توانائی نہیں جسے کسی تجربہ گاہ میں دریافت کر لیا جائے بلکہ ایک متحرک سیمابی جرثومہ ہے۔ اس لئے وہ بڑی سچائی جو آپ نے دریافت کر لی ہے اور وہ چھوٹی سچائی جو میں دریافت کرنے کی کوشش کر رہا ہوں، دونوں کے ایک معنی بنتے ہیں اور ادب میں دونوں کی گنجائش موجود ہے۔

میں نے کب کہا کہ "اجتماعی اور اخلاقی" سرحدوں کو وسعت نہیں دینی چاہئے بلکہ میں تو ایک قدم اور آگے جانے کو تیار ہوں کہ سرحدوں کو وسعت نہ دینے کے فیصلے کی طاقت بھی ادیب کی سرشت کے دائرے سے باہر ہے۔

"حصار" پر اور "سرحد" پر آپ کے گرجنے برسنے کا لطف آیا۔ میرا منشا شاعر کے لئے زنداں بنانا نہیں تھا بلکہ اس المئے کی طرف اشارہ تھا کہ اپنے کلچر اپنی زبان اور اپنی مٹی سے جس والہانہ وابستگی کی ضرورت ہے لوگوں میں عنقا نظر آتی ہے۔ مجھے آج تک کوئی ایسا انگریز شاعر نہیں ملا جس نے اپنی تاریخ اور اپنے ادب کا مطالعہ کئے بغیر، فرانسیسی تاریخ اور ادب پڑھ کر، انگریزی میں لکھنا شروع کر دیا ہو۔ "بھیک" کے سلسلے میں "فیض جاری" والی بات آپ جیسا روشن طبع آدمی ہی لکھ سکتا تھا، بہت دل کو لگی۔ آپ کے غور و فکر کا میں ہمیشہ سے قائل ہوں مگر اس باب میں آپ نے اس حقیر فقیر کے دو کلیدی الفاظ "گہری آشنائی" شاید نظرانداز کر دیئے۔ فیض کے الفاظ میں:

اک بار سوئے دامن یوسف تو دیکھئے

ایک ضمنی بات اور، یہ آپ کیسے کہہ سکتے ہیں کہ یہودیوں اور مسلمانوں نے "سرحدوں کا کوئی احترام روا نہیں رکھا۔" وطن کی تلاش میں ملک ملک کی ہجرت اور بات ہے مگر "یروشلم یروشلم" اور "میرے مولا بلا لو مدینے مجھے" والی کراہیں تو آپ نے بھی سنی ہوں گی۔ اور جب تک آدمی کراہتا رہے گا سرحدوں کا احترام باقی رہے گا کہ یہ سرحدیں اسے ورثے میں ملی ہیں۔ ماضی سے قطع تعلق ہوا میں معلق ہونے کے مصداق ہے۔ پھر تو حیوان اور انسان کے درمیان بھی کوئی حد فاصل نہ رہے گی کہ یادوں کا یہ ذخیرہ ہی تو انسان کو حیوان سے افضل کرتا ہے۔

16 مئی 1975ء- آج صبح سے ہی جی ڈہا جا رہا ہے۔ بیوی نے کافی نہیں بنائی۔ کار اسٹارٹ نہیں ہوئی۔ پھر دفتر میں پتا چلا کہ میری سیکرٹری حاملہ ہے۔ رنج اس کا نہیں کہ وہ جا رہی ہے بلکہ دکھ یہ ہے کہ جب وہ حاملہ ہو رہی تھی تو میں کہاں تھا۔ ایسے ناگہانی دن میں فانی کا ایک شعر الگ پریشان کرتا رہا:

اپنے دیوانے پہ اتمام کرم کر یا رب
در و دیوار دیئے اب انہیں ویرانی دے

عجب پراگندگی اور برہم طبعی ہے۔ غزل پر بات کرنے کا اس سے بہتر اور کون سا دن ہو گا۔

سوال یہ ہے کہ غزل کیوں؟ جواب یہ ہے کہ اس کا اعجاز اس کے ایجاز میں ہے۔ جیسا کہ آپ جانتے ہیں۔ میں نے غزل لکھنی بہت بعد میں شروع کی اور ڈاکٹر عبادت بریلوی اور ڈاکٹر ابواللیث صدیقی جیسے بے فیض نقادوں کی تحریروں کے باعث شک و شبہ میں مبتلا رہا کہ ہو نہ ہو جو صنف سخن ایسے ایسے اہل خبر کو پسند آئے اس میں ضرور کوئی نہ کوئی نقص ہو گا۔ یہ بعد میں پتا چلا کہ غزل کی ایک پرت عوام اور پروفیسروں کے لئے ہوتی ہے۔ اور باقی تمام پرتیں خواص کے لئے مخصوص ہیں۔ میں اپنی ذہنی جلا کے لئے حالی، فراق، عسکری اور سلیم احمد کا ممنون ہوں۔ کلیم الدین احمد والی بات آج تک سمجھ میں نہیں آئی۔ کیا ان کا مطلب یہ تھا کہ غزل تو خیر مبارکباد کی مستحق ہے کہ "نیم وحشی" ہے مگر نظم ایک مکمل وحشی صنف سخن ہے اس لئے ان دونوں پر لعنت اور سب کو نثر لکھنی چاہئے اور نثر میں بھی تنقید سے شغف کرنا چاہئے۔ اس لئے کہ نثر آدمی نے اس وقت لکھنی شروع کی جب وہ مہذب ہونا شروع ہوا اور شاعری اس کے دور جہالت کی یادگار ہے جب وہ اپنے بال اور ناخن بڑھائے، ننگ دھڑنگ، پتّے کے جنگلوں میں شکار کے لئے مارا مارا پھرتا تھا۔

میں نظم اور غزل کی اس Out of date بحث میں آپ کا اور اپنا وقت ضائع نہیں کرنا چاہتا مگر سچائی کے اس لمحے میں ایک اعتراف اور کرتا چلوں کہ اس سلسلے میں آپکا رویہ قطعی ناواضح ہے اور آپ کی رائے کو اپنی رائے سے بھی زیادہ غیر معتبر سمجھتا ہوں۔ صرف اس لئے نہیں کہ بری بری غزلیں لکھ کر پہلے آپ نے کتاب میں شامل کیں بلکہ اس لئے بھی کہ پھر نکال کیوں دیں۔ مجھے آپ کی محنت کے اکارت جانے کا افسوس نہیں ہے مگر یہ Love - hate والا رشتہ سمجھ میں نہیں آیا۔ پھر یہ کہ اپنی نظموں میں فارسی غزل کے رول سے آپ انکار نہیں کر سکتے۔ اس سارے عمل میں مجھے آپ کی خفگی کم اور خوف زیادہ نظر آیا۔

جدید شعرا کے ظہور سے پہلے بے شمار غزل گو اپنی غزلوں پر عنوانات چسپاں کر کے نام نہاد نظم نگاروں میں شامل ہو جاتے تھے۔ میں عبرت حاصل کرنے کے لئے جوش ملیح

آبادی کے کئی دیوانوں میں غوطہ لگا چکا ہوں۔ جوش صاحب کی پوری شاعری پر تبصرہ نہیں کر رہا۔ میں ان کی کئی نظموں کا بڑا معترف ہوں۔ مگر خوف کا یہ عالم ہے کہ ان کا کلام دیکھتے ہی گھگی بندھ جاتی ہے۔ آگے کہیں ان پر کھل کر بات ہو گی۔ آپ ہی پہل کیجئے نا۔

سچی بات تو یہ ہے کہ شاعری نظم غزل نہیں ہوتی شاعری ہوتی ہے۔ اور جو اصناف اپنے عہد کو سمیٹنے کی استطاعت نہیں رکھتیں وہ آپ غائب ہوتی جاتی ہیں۔ مثنوی' قصیدہ' ہجو اور سہرا ایسی صنفیں انگریزی کے سانیٹ کی طرح مرمرا گئیں یا ہچکیاں لے رہی ہیں۔ غزل زندہ رہی تو اس کے معنی یہ ہوئے کہ اس میں جدید حساسیت کو قبول کرنے کے بے شمار امکانات ہوں گے۔ آج انہیں امکانات کی پردہ دری کے سلسلے میں اردو کے دو اولیں جدید غزل گویوں پر گفتگو مقصود ہے۔

سب سے پہلے تو مجھے یہ کہنے کی اجازت دیجئے کہ نظم و نثر کی تمام اصناف میں غزل وہ واحد صنف ہے جس سے مجھے اپنی شناخت کا سراغ ملتا ہے۔ مراد یہ ہے کہ ناول' افسانے' تنقید اور نظم کی طرح اس کے سرے مغرب میں نہیں ملیں گے۔ یہ عید' شلوار' چغتائی اور لسی کی طرح ہماری اپنی ہے۔ اپنی ہے اور کھری ہے۔ اور جس طرح تمام موشگافیوں کے باوجود جاپان میں ہائیکو زندہ ہے۔ ہمارے یہاں غزل زندہ رہے گی۔ یعنی پاکولے کی دریافت لسی کی موت نہیں ہے۔

یوں تو جو سچائی اپنے عہد کے زنداں سے آگے نکل جائے جدید ہوتی ہے۔ ان معنوں میں حضرت عیسیٰؑ' کارل مارکس یا ہومر' بلیک' نطشے یا میر' غالب اور اقبال سب جدید تھے۔ مگر جس جدید غزل کا ذکر میں کرنا چاہتا ہوں' میرے نزدیک اس کی ابتدا یگانہ اور فراق سے ہوتی ہے۔ یعنی جدید نظم کے پیش رووں میرا جی' راشد اور فیض سے پانچ سات سال پہلے۔

جدیدیت میرے نزدیک تین مختلف عناصر کا وہ نامیاتی عمل ہے جس سے کسی مصرعے کا خمیر اٹھتا ہے۔ میرا مطلب زمانے کے ادراک' ذات کے اظہار اور زبان کی دریافت سے ہے۔ چونکہ ہمارے یہاں نظم کی کوئی ایسی بڑی روایت نہیں تھی' اس لئے جدید نظم نگاروں کا کام نسبتاً مشکل اور نسبتاً آسان تھا۔ آسان اس لئے کہ ایک تو انہیں اپنے یہاں کسی عظیم روایت کی زنجیریں نہیں توڑنی پڑیں۔ (یہاں خوش قسمتی یا بدقسمتی کی

بات نہیں ہو رہی ہے) دوسرے مغربی زبانوں میں اسلوب کی روایت موجود تھی۔ اور مشکل اس لئے کہ انہیں اپنی زبان میں موسیقی، آواز اور لہجے کی ایک بالکل نئی روایت کی بنا ڈالنی تھی۔ یہی نہیں اپنے پڑھنے والوں اور سننے والوں کی ایک نئی کھیپ بھی پیدا کرنی تھی۔ غرض کہ ان کی مصیبت دہری تھی، اظہار بھی اور رسائی بھی۔ مگر جدید غزل کا معاملہ جدا ہے کہ یہاں اظہار کی تخلیقی تبدیلی ضرور رونما ہوئی مگر رسائی مسئلہ نہیں بنی شاید اس لئے کہ فارسی کی بڑی اور اردو کی کڑی کلاسیکی روایت وہ عظیم مقناطیسی قوت ہے جو جدید سے جدید غزل لکھنے والے کو اپنی طرف کھینچتی رہتی ہے۔ (ایک بار پھر، یہاں خوش قسمتی یا بد قسمتی کی بات نہیں ہو رہی ہے) یعنی ہماری جدید نظم تو عہد کا پس منظر ڈھونڈتی ہے مگر ہماری جدید غزل عہد کے علاوہ روایت کا پس منظر بھی مانگتی ہے۔ اس لئے فراق اور یگانہ کو سمجھنے سمجھانے کے آداب، میرا جی اور راشد کو جاننے پہچاننے کے آداب سے جدا ہوں گے کہ اسپ تازی کے مزاج سے آگاہی اور رولس رائس کی کلوں سے آشنائی دو مختلف چیزیں ہیں حالانکہ دونوں سواری کے کام آتے ہیں۔

زمانہ

زبان ذات

آیئے زبان، ذات اور زمانے کے اس مثلث کی رہنمائی میں اس جدید غزل کی تلاش کی جائے جس کی ابتدا میرزا یاس یگانہ چنگیزی اور پنڈت رگھوپتی سہائے فراق سے ہوئی۔ اور جیسا کہ تمام ہم عصروں کا مقدر ہے ان کی مشترک قدریں بھی دو ہیں یعنی زبان اور زمانہ۔ میں سمجھتا ہوں فراق کے لہجے کی خواب کاری میر کے لہجے کا فروغ ہے۔

لے سانس بھی آہستہ کہ نازک ہے بہت کام (میر)
پچھلے کو بھی وہ آنکھ کہیں جاگ رہی ہے (فراق)

اور یگانہ کی آواز کی بیداری میں غالب کی آواز کا ارتقا نظر آتا ہے۔

الٹے پھر آئے در کعبہ اگر وا نہ ہوا (غالب)
خودی کا نشہ چڑھا آپ میں رہا نہ گیا (یگانہ)

پتا چلا کہ اپنے زمانے میں سانس لینے کے لئے دونوں شاعروں نے روایت سے رخصت نہیں مانگی، اجازت چاہی اور اس اجازت کے بعد اس تثلیث کے تیسرے عنصر "

ذات" کی شمولیت ہو گی جس کے باعث یہ دونوں شاعر اپنے اپنے طور پر زبان کی دریافت کریں گے کہ شاعر کے لہجے کا دوسرا نام شاعر کی ذات ہے۔ اسی ذات کی کارفرمائی یگانہ کے یہاں شعلگی اور فراق کے یہاں ٹھنڈی آگ بنی:

الٹی تھی مت زمانہ مردہ پرست کی
میں ایک ہوشیار کہ زندہ ہی گڑ گیا (یگانہ)

تو مخاطب بھی ہے قریب بھی ہے
تجھ کو دیکھوں کہ تجھ سے بات کروں (فراق)

عہد کے احساس کا ردعمل بھی دونوں کے یہاں مختلف ہے۔

صد رفیق و صد ہمدم پر شکستہ و دل تنگ
دادرا نمی زیبد بال و پر بہ من تنہا (یگانہ)

زمین جاگ رہی ہے کہ انقلاب ہے کل
وہ رات ہے کہ کوئی ذرہ محو خواب نہیں (فراق)

ایک کے یہاں شکست سے الجھن بڑھتی جاتی ہے مگر دوسرے کے یہاں آنے والے اچھے دن سے مایوسی نہیں ہے۔

پہاڑ کاٹنے والے زمیں سے ہار گئے
اسی زمین میں دریا سمائے ہیں کیا کیا (یگانہ)

دیکھ رفتار انقلاب فراق
کتنی آہستہ اور کتنی تیز (فراق)

حسن و عشق کے بارے میں بھی اگلوں کے مقابلے میں ان کا زاویہ نظر بدلا اور کیسا ہے

کسی کے ہو رہو' اچھی نہیں یہ آزادی
کسی کی زلف سے لازم ہے سلسلہ دل کا (یگانہ)

مقصد یہ ہے کہ ہم کسی ایک کے نہیں۔ اور لہجہ بتا رہا ہے کہ ہم اس بات پر شرمندہ بھی نہیں کہ آدمی کسی ایک کا ہوئے بغیر بھی عشق کر سکتا ہے۔ یہ میر کے رویے سے عشق بن یہ ادب نہیں آتا۔ یا غالب کے رویے سے وفاداری بہ شرط استواری اصل ایماں ہے' سے یکسر الگ ہے۔ اور دیکھئے:

وہ ہم سے نہیں ملتے ہم ان سے نہیں ملتے
اک ناز دل آویز ادھر بھی ہے ادھر بھی (یگانہ)

یعنی عشق وشق اپنی جگہ۔ ٹھیک ہے مگر پہلے یہ سمجھ لیجئے کہ ہم دونوں دو مختلف شخصیتیں ہیں اور اگر رسم و راہ بڑھے گی تو دونوں کا غرور پاش پاش ہو گا۔ اور دونوں بدلیں گے۔ (یہی رویہ سلیم احمد نے فراق کے یہاں بھی دریافت کیا ہے) اور آگے چلئے:

مجال تھی تمہیں دیکھے کوئی نظر بھر کے
یہ کیا ہے آج، پڑے ہو ملے دلے کیونکر (یگانہ)

دیکھا صاحب۔ ہم ہی گرفتار نہیں ہوئے ہم نے آپ کو بھی بدل ڈالا۔ فراق کے یہاں اس کا اظہار یوں ہوا:

ذرا وصال کے بعد آئینہ تو دیکھ اے دوست
ترے شباب کی دوشیزگی نکھر آئی

(عوام نے "شباب" کو "جمال" سے بدل کر شعر بہتر کر دیا ہے اسی لئے عوام کی اصلاح سے ڈرتے رہنا چاہئے اور شعر کہتے وقت لفظ کے سلسلے میں کسی طرح کی غفلت نہیں برتنی چاہئے۔)

فراق کے عشق کے سلسلے میں سلیم احمد کا تخلیقی مطالعہ بہت دلچسپ اور بہت اہم ہے یعنی "عشق ان کے یہاں بہت کچھ ہونے کے باوجود بہت کچھ نہیں ہے۔" یا "عشق اپنے آپ کو جھٹلائے بغیر ایک سے زیادہ مرتبہ کیا جا سکتا ہے۔" اور یہ کہ "محبوبہ معمولی عورت بھی ہو سکتی ہے اور اسے بیوی بنا کر بھی چاہا جا سکتا ہے۔" اس نئے زاویے کی نیرنگیاں دیکھئے:

ہزار شکر کہ مایوس کر دیا تو نے
یہ اور بات کہ تجھ سے بھی کچھ امیدیں تھیں (فراق)

یا

ایک مدت سے تری یاد بھی آئی نہ ہمیں
اور ہم بھول گئے ہوں تجھے ایسا بھی نہیں (فراق)

یا

رفتہ رفتہ عشق مانوس جہاں ہونے لگا
خود کو تیرے ہجر میں تنہا سمجھ بیٹھے تھے ہم (فراق)

یہ خط خاصا طویل ہو گیا ہے یا شاید مجھے طویل لگنے لگا ہے۔ مگر ختم کرنے سے پہلے ایک بات اور کہتا چلوں۔ پتا نہیں ہمارے غزل گویوں پر کیا لعنت ہے 'یگانہ ہوں کہ فراق' ان کے ایک اچھے شعر سے ملاقات کرنے کے لئے پچاسوں لغو شعروں کی بھیڑ میں گھسنا پڑتا ہے۔ طبیعت جھک ہو جاتی ہے۔ مجھے اپنے شاعروں کے تنقیدی ذہن سے سخت شکایت ہے۔ بڑے بڑے شعرا اپنی کتابوں میں بھر کے مجھ جیسے خوش گمانوں کو خوب خوب ذلیل کرتے ہیں۔ ہو سکے تو اپنی ذلت کی کہانی بھی لکھیے گا کہ ان غزل گویوں نے آخر آپ کو بھی تو زک پہنچائی ہو گی؟

فقط
آپ کا۔ ساقی

حسن کوزہ گر

"میرے دوستو زندگی کے معنی کھانا، پینا، چلنا، پھرنا، سو رہنا اور منہ سے بولے جانا نہیں۔ زندگی کے معنی یہ ہیں کہ صفات خاص کے ساتھ نام کو شہرت عام ہو اور اسے بقائے دوام ہو۔ اب انصاف کرو کیا یہ تھوڑے افسوس کا موقع ہے کہ ہمارے بزرگ خوبیاں بہم پہنچائیں، انہیں بقائے دوام کے سامان ہاتھ آئیں اور اس پر نام کی زندگی سے محروم رہیں۔ بزرگ بھی وہ بزرگ کہ جن کی کوششوں سے ہماری ملکی اور کتابی زبان کا لفظ لفظ اور حرف حرف گرانبار احسان ہو۔ ان کے کاموں کا اس گمنامی کے ساتھ صفحہ ہستی سے مٹنا بڑے حیف کی بات ہے۔ جس مرنے پر ان کے اہل و عیال روئے وہ مرنا نہ تھا۔ مرنا حقیقت میں ان باتوں کا مٹنا ہے جس سے ان کے کمال مرجائیں گے۔ اور یہ مرنا حقیقت میں سخت غمناک حادثہ ہے۔"

محمد حسین آزاد

(آب حیات کے دیباچے سے)

وہ 9 اکتوبر 1975ء کا ایک منحوس دن تھا۔ میں دفتر میں نہیں ملا تو راشد صاحب نے گھر پر فون کیا اور میری بیوی کو بتایا کہ شیلا (ان کی بیوی) کے اکلوتے بھائی کار کے ایک حادثے میں ہلاک ہو گئے ہیں اور وہ اٹلی چلی گئی ہیں۔ یہ بھی کہ وہ چلٹنہم سے بینسٹڈ جا رہے ہیں تاکہ اپنی ساس کو لے کر، جنازے میں شریک ہونے کے لئے، 11 اکتوبر کو اٹلی پہنچ جائیں۔ پھر یہ پیغام دیا کہ میں انہیں 10 اکتوبر کی شام کو فون کروں اور پہلے ان کی ساس مسز انجلینی کو بیٹے کی موت کا پرسا دوں پھر ان سے بات کروں کہ وہ بینسٹڈ ہی میں رہیں گے۔

دس کی شام کو جب میں گھر پہنچا تو میں نے اپنی بیوی سے کہا کہ وہ مسز انجلینی کو فون کریں اور پرسا دیں کہ مجھے پرسا دینا نہیں آتا۔ پھر میں راشد صاحب سے بات کروں گا۔ مسز انجلینی نے ٹیلیفون اٹھایا تو میری بیوی نے کہا کہ کیا قیامت ہے کہ شوہر کی موت کو ابھی 5 مہینے بھی نہیں ہوئے تھے اور جوان بیٹا یوں ڈھ گیا۔ میں مارننگ روم میں بیٹھا کافی پی رہا تھا اور اخبار پڑھ رہا تھا او رٹیلیفون پر کان تھے کہ بیوی کی چیخ سنکر ایک دم سے ٹیلیفون کی طرف لپکا۔ میری بیوی کی آنکھوں میں حیرت اور بے یقینی تھی۔ میں نے رسیور اپنے ہاتھ میں لے لیا اور فرش پر بیٹھ گیا اور مسز انجلینی سے پوچھا کہ کیا ہوا۔ وہ ستر سالہ خاتون ڈھک ڈھک کر رونے لگیں اور مجھے ہچکیوں میں بتایا کہ راشد صاحب کا انتقال ہو گیا۔ میرا دل بیٹھ گیا۔ بیوی کی چیخ سے میرے ذہن میں حادثہ' دل کا دورہ اور ہسپتال ابھرے تھے۔ اس لمحے تک موت کا لفظ میرے ذہن میں نہیں جاگا تھا۔ ایک لمحے کو میرے اعصاب سو گئے۔ پھر میں نے اپنے آپ کو سمیٹا اور تفصیل طلب ہوا۔ پتا چلا کہ وہ بینسٹڈ سات بجے شام کو پہنچے اور پیدل چل کر کوئی بیس منٹ میں مسز انجلینی کے یہاں پہنچے' انکا مکان خاصی بلندی پر واقع ہے۔ راستے ہی میں انہیں دل کی تکلیف محسوس ہوئی ہو گی کہ خاصے پژمردہ تھے۔ مسز انجلینی سے کہا کہ کیسے دکھ کی بات ہے کہ ان کا بیٹا کار کے حادثے سے جانبر نہ ہو سکا۔ پھر صوفے پر بیٹھ گئے۔ مسز انجلینی نے کہا کہ وسکی کا ایک گلاس مناسب رہے گا۔ کہنے لگے نہیں ابھی دل پر دباؤ کم کرنے والی دو گولیاں کھائی ہیں۔ پھر مسز انجلینی نے پوچھا سفر کیسا رہا۔ انہوں نے کوئی جواب نہ دیا کہ وہ سوال اور جواب کی منزل سے آگے نکل گئے تھے۔ اتنی پر سکون موت کم لوگوں کا نصیبہ ہے۔ جیسے کوئی بات ہی نہیں ہوئی۔۔

مجھے موت آئے گی' مر جاؤں گا میں

اسی دن پتا چلا کہ درد کی تقسیم مقصود ہو تو پرسا دینا کوئی ایسا مشکل کام نہیں۔ میں آدھ گھنٹے تک مسز انجلینی سے بات کرتا رہا۔ انہوں نے بتایا کہ شیلا نے تار پا کر فون کیا تھا اور وہ 12 اکتوبر کی شام کو پہنچیں گی۔ اور یہ کہ برسلز سے راشد صاحب کے بیٹے شہریار لندن پہنچ گئے ہیں۔ اور شیلا اور شہریار مل کر کفن دفن کا دن طے کریں گے۔ یہ بھی معلوم ہوا کہ پوسٹ مارٹم کے بعد راشد صاحب کی لاش ہسپتال میں رکھی ہوئی ہے۔

ان سے گفتگو ختم کر کے میں نے بی بی سی کی انٹرنیشنل نیوز سروس میں یہ خبر دے دی۔ پھر ایک ایک کر کے راشد صاحب کے تمام ملنے والوں کو فون کر دیا۔ اور عبداللہ حسین اور علی باقر سے کہہ دیا کہ جن لوگوں تک یہ خبریں نہیں پہنچی ہیں، پہنچا دیں۔ 11 اکتوبر کو میں گھر ہی پر تھا۔ راشد پرستوں کے فون آتے رہے۔ عبداللہ حسین میرے یہاں شام کو آ گئے۔ وہ سخت غیر جذباتی آدمی ہیں مگر اس دن جذباتی ہو رہے تھے۔ ہم صبح کے تین بجے تک راشد صاحب کی باتیں کرتے رہے اور شراب پیتے رہے۔ دوسرے دن اتوار تھا۔ عبداللہ اور ان کی بیوی فرحت میرے یہاں دوپہر کے کھانے پر آئے ہوئے تھے کہ دو بجے ٹیلیفون کی گھنٹی بجی۔ یہ شیلا تھیں۔ رو رہی تھیں۔ کہنے لگیں ابھی پہنچی ہوں۔ یہ کیا ہو گیا۔ میں ان کے دہرے غم کے بارے میں ٹوٹے پھوٹے لفظوں میں جانے کیا کچھ کہتا رہا۔ جب طوفان تھما تو میں نے پوچھا راشد صاحب کب اور کہاں دفن ہوں گے، کہنے لگیں ان کی خواہش تھی کہ انہیں نذر خاک نہیں نذر آتش کیا جائے، تم کیا کہتے ہو۔ ظاہر ہے میں، شہریار سے مشورہ کئے بغیر کچھ نہیں کروں گی اور شہریار ایک گھنٹے تک پہنچیں گے۔ عبداللہ حسین میرے پاس بیٹھے ہوئے تھے اور ہماری گفتگو سن رہے تھے۔ ہم دونوں کو ایک دھچکا سا لگا کہ ہم اس کے لئے تیار نہیں تھے۔ میں نے کہا اگر مرحوم کی خواہش یہی تھی تو اس خواہش کو پورا کیا جائے گا۔ ظاہر ہے میں کیا کر سکتا ہوں۔ آپ اور شہریار وارث ہیں۔ آپ دونوں طے کیجئے اور مجھے فون کر دیجئے۔ میں انتظار کروں گا۔ یہ گفتگو ختم ہوئی تو عبداللہ اور میں کمرے میں آ گئے۔ میں اس دھچکے کے بعد سنبھل رہا تھا۔ مگر عبداللہ کے نیم آزاد ذہن میں خوابیدہ پاکستانی مسلمان ہڑ بڑا کر اٹھ بیٹھا تھا۔ کہنے لگے شیلا کے کہنے سے کیا ہوتا ہے جب تک شہریار راضی نہیں ہو جاتے کوئی بات حتمی نہیں ہے کہ قانونی طور پر بیوی اور بیٹے دونوں کی رضا مندی ضروری ہے اور اگر دونوں میں کوئی اختلاف پیدا ہو جائے تو لاش کو اس مذہب کے رسوم کے تحت دفنایا یا جلایا جائے گا جس مذہب میں مرنے والا پیدا ہوا تھا۔ اور یہ کہ شہریار ظاہر ہے جلانے پر اعتراض کریں گے۔ میں نے کہا کمال کیا راشد صاحب نے بھی مرتے مرتے ڈراما کر گئے۔ عجب آزاد ذہن تھا ان کا کہ زندگی اور موت کا گراف ایک خط مستقیم کے طور پر بنا گئے جس طرح سارتر کے فلسفے کا منطقی نتیجہ وہ خط تھا جو انہوں نے ہوچی منہ کے نام لکھا تھا (جس

میں جنگ آزادی میں شریک ہونے کی خواہش کا اظہار کیا تھا) اسی طرح راشد کی زندگی اور شاعری کا نقطہ عروج یہ Cremation ہے۔ جب ایک آدمی ساری عمر زنجیریں ہی توڑتا رہا تو یہ زنجیر بھی کیوں بچے۔ ہم چاروں بہت دیر تک دنیا جہان کی باتیں کرتے رہے۔ پھر فرحت اور عبداللہ چلے گئے۔ رات کے 9 بجے شہریار کا ٹیلیفون آیا کہ چھ مہینے پہلے جب راشد صاحب ان سے ملنے بلجیئم گئے تھے تو انہوں نے ان سے بھی مرنے کے بعد سپرد آتش ہونے کی خواہش کا اظہار کیا تھا۔ اور انہوں نے اور شیلا نے طے کیا ہے کہ مرحوم کی خواہش کو پورا کیا جائے۔ میں نے کہا بہت سے لوگوں کے جذبات کو ٹھیس پہنچنے کا اندیشہ ہے۔ کہنے لگے ہم دونوں نے بہت سوچ بچار کے بعد یہ فیصلہ کیا ہے۔ اور ہمیں کسی کی پروا نہیں ہے۔ آپ ابا کے تمام جاننے والوں کو اطلاع دے دیں۔ جس کا دل چاہے آئے جس کا دل چاہے نہ آئے۔ یہ رسم 14 اکتوبر کو ساؤتھ لندن کریمیٹوریم میں ادا ہو گی۔ اور نماز جنازہ اس لئے نہیں ہو گی کہ لاش کو سپرد آتش کیا جا رہا ہے۔ پھر انہوں نے خواہش ظاہر کی کہ میں 15 اکتوبر کی شام کو اپنے یہاں ایک نشست کا انتظام کروں جس میں راشد صاحب کے دوست احباب راشد صاحب کا تذکرہ کریں۔ اور انہیں یاد کیا جائے۔ وہ چونکہ 16 اکتوبر کی صبح کو واپس جا رہے ہیں۔ اس لئے 15 اکتوبر کے علاوہ کسی اور دن نہیں آپائیں گے۔

میں نے اسی وقت فون کر کے آصف جیلانی کو اطلاع دی کہ وہ "جنگ" میں یہ خبر دے دیں اور پاکستان میں بھی ٹرانسمٹ کرا دیں۔ پھر میں نے تمام لوگوں کو صورت حال سے آگاہ کیا۔ میاں ممتاز دولتانہ کو گھر پر فون کیا۔ میاں صاحب موجود تھے۔ میں نے راشد صاحب کی خواہش سے مطلع کیا کہنے لگے "اچھا"؟ میں نے کہا پتا لکھ لیجئے۔ کہنے لگے سیکرٹری نہیں ہے۔ بہرحال، لکھا دیجئے۔" میں نے کریمیٹوریم کا پتا لکھا دیا اور فون بند کر دیا۔

دوسرے دن دفتر میں اور گھر پر لوگوں کے فون آتے رہے۔ سب کو صدمہ تھا۔ مگر موت کے صدمے پر مذہب کا صدمہ غالب تھا۔ میں سب سے یہی کہتا رہا کہ میں راشد صاحب کا ایک ادنیٰ دوست ہوں۔ ان کی لاش کی وراثت پر میرا کوئی حق نہیں ہے۔ میں کچھ بھی نہیں کر سکتا۔ آپ حضرات اس نمبر پر شیلا اور شہریار کو فون کریں۔ جہاں تک

میرا تعلق ہے مجھے اپنے محترم دوست کی آخری خواہش کا پورا احترام ہے۔ مگر سچی بات یہ ہے کہ مجھے سخت وحشت تھی کہ کریمیٹوریم میں کوئی ہنگامہ نہ کھڑا ہو جائے۔ میں نے شیلا کو فون کیا۔ پتا چلا کہ سحاب قزلباش اور کرنل اسحٰق ان سے ملے تھے۔ وہ ٹس سے مس نہ ہوئیں۔

دوسرے دن 4 بج کر 10 منٹ پر راشد صاحب کی میت کو سپرد آتش ہونا تھا۔ 3 بج کر 50 منٹ پر میں اپنی بیوی کے ہمراہ کریمیٹوریم پہنچ گیا۔ ابھی میت نہیں پہنچی تھی۔ عبداللہ حسین اور عاقل ہوشیار پوری ہم سے پہلے پہنچ گئے تھے۔ مسز انجلینی کے ہمسائے کیتھ راپکن بھی آ چکے تھے۔ 4 بجے ایک لمبی' سیاہ' میت گاڑی میں میت کے ہمراہ شیلا' مسز الیسیا انجلینی اور شیلا کی ایک دوست اینجلا بھی پہنچ گئیں۔ پھر علی باقر' راشد صاحب کے ایک پرانے دوست محمد افضل اور وقار لطیف آ گئے۔ شیلا نے کریمیٹوریم کا ہال 15 منٹ کے لئے بک کرایا تھا۔ وقت گزر رہا تھا مگر راشد صاحب کے بیٹے شہریار اب تک نہیں پہنچے تھے۔ شیلا میرے شانے پر سر رکھے رو رہی تھیں۔ یکایک کہنے لگیں ہم مزید انتظار نہیں کر سکتے۔ میں نے کہا میں نگہبان افسر سے بات کرتا ہوں۔ میں اس افسر کو ایک کونے میں لے گیا اور تاخیر کی معافی چاہی اور صورت حال سے آگاہ کیا۔ اور مزید 15 منٹ کی مہلت طلب کی۔ 15 منٹ گزر گئے مگر شہریار نہیں پہنچے تو میں نے کہا حضرات اور خواتین ہال میں چلئے۔ مجھے اس خوش خصال افسر نے مختصرا بتایا کہ اس طرح کی رسم مرگ کے کیا اصول ہیں۔ یعنی یہ کہ سب لوگ خاموشی سے ہال میں داخل ہو کر' سر جھکا کر دعا میں مشغول ہو جاتے ہیں۔ سامنے "کوفن" میں میت رکھی رہتی ہے اور پس منظر میں آرگن بجتا رہتا ہے۔ جب یہ سوگوار دھن ختم ہوتی ہے تو کوفن کے چاروں طرف پردہ کھنچ جاتا ہے۔ اور کوفن کے نیچے کا تختہ فرش سرک جاتا ہے اور لاش نیچے' تہہ خانے میں' بجلی کی بھٹی میں جلنے کے لئے چلی جاتی ہے اور لوگ ہال سے باہر آ جاتے ہیں۔ اس سارے عمل میں مشکل سے دس منٹ لگتے ہیں۔ میں نے موت کے آداب و ضوابط سے سب کو آگاہ کر دیا تھا۔ جب آرگن ہوا اور پردہ کھنچا اور فرش کا دروازہ کھلا تو راشد صاحب آگ کے شعلوں میں نہانے کے لئے چلے گئے۔ انہی کے الفاظ ہیں:

آگ آزادی کا' دلشادی کا نام

آگ پیدائش کا افزائش کا نام
آگ وہ تقدیس، ڈھل جاتے ہیں جس سے سب گناہ
آگ انسانوں کی پہلی سانس کے مانند اک ایسا کرم
عمر کا اک طول بھی جس کا نہیں کافی جواب!

ہم چار پاکستانی، دو ہندوستانی اور پانچ یورپی خاموشی سے اٹھکر باہر چلے آئے۔ دروازہ بند ہو گیا۔ باہر لان میں چند سرخ گلابوں کا ایک معمولی سا گلدستہ اپنے حجم اور اپنی تنہائی پر شرمندہ تھا۔ پاس ہی ایک کارڈ پر لکھا ہوا تھا۔ "بہت ہی پیارے نذر راشد کے لئے۔ اس کی چہیتی بیوی کی طرف سے۔"

شیلا نے خواہش ظاہر کی تھی کہ کوئی پھول نہ لائے۔ یہ خبر اخباروں میں چھپ چکی تھی۔ ہم اس گلدستے کے پاس پان سات منٹ تک کھڑے رہے۔ یہ سب کچھ اتنی تیزی سے ہوا تھا کہ ہم سب ایک طرح سے سہمے ہوئے تھے اور خاموشی سے ایک دوسرے کی طرف دیکھ رہے تھے۔ پھر شیلا نے کہا اگر ہم مناسب سمجھیں تو ان کی ماں کے ہاں چلیں اور چائے کی ایک ایک پیالی پی کر رخصت ہوں۔ علی باقر، وقار لطیف اور کیتھ را پکن مصروف تھے اور اپنے اپنے دفتروں کو چلے گئے۔ باقی لوگ ساتھ چلنے لگے۔ ابھی ہم گیٹ ہی پر تھے کہ شہریار اپنے ایک دوست کے ہمراہ پہنچ گئے۔ انہیں معلوم ہوا کہ آخری رسم ختم ہو چکی ہے۔ انہوں نے کچھ زیادہ پشیمانی کا اظہار نہیں کیا اور کہا تو یہ کہا کہ چلئے یہ بھی ہونا تھا۔ کوئی بات نہیں۔ میں اپنی کار میں اکیلا تھا۔ شہریار اگلی کار میں بیٹھی شیلا کو بتا رہے تھے کہ وہ کس طرح راستہ بھٹک گئے اور ادھر ادھر مارے مارے پھرتے رہے۔ میں نیچے اترا اور میں نے کہا چلئے اس لان میں گلدستے کے پاس کھڑے ہو کر اپنے ابا کے لئے کچھ دعا کر لیجئے۔ وہ میرے ساتھ ہو لئے اور پھولوں کے پاس کھڑے ہو کر دعا کرتے رہے۔ پھر ہم سب تین کاروں اور ایک وین میں بھر کر مسز انجلینی کے یہاں پہنچے۔ ان کا مکان کمال بلندی پر ہے۔ مجھے اپنی کار کی رفتار گرتی ہوئی محسوس ہوئی تھی۔ دل کے مریض کے لئے یہ راستہ یقیناً مہلک ہے۔

شیلا اور مسز انجلینی اپنے مہمانوں کی خاطر تواضع کرتی رہیں۔ گھر میں ماتم کی فضا کم اور پارٹی کا ہنگامہ زیادہ نظر آیا۔ غموں کی پردہ پوشی تھی اور "آداب" اور "رکھ رکھاؤ" کا

دور دورہ تھا۔ ہم سب راشد صاحب کی باتیں کرتے رہے۔ میں نے راشد صاحب کی ایک نظم پڑھی۔ عبداللہ نے ترجمہ کیا۔ شہریار، فیض اور راشد مرحوم کی ماسکو والی ملاقات کا تذکرہ کرتے رہے۔ میں نے شیلا اور شہریار سے مخاطب ہو کر پوچھا۔ "میں اپنی اور اپنے جیسے دوسرے لوگوں کی تسلی کے لئے، سب کے سامنے ایک بات پوچھنا چاہتا ہوں، یہ تو مجھے معلوم ہے کہ راشد صاحب نے تحریراً اپنی موت کے بارے میں کوئی وصیت نہیں چھوڑی ہے، مگر ہم سب کو آپ دونوں تفصیلاً" بتائیں کہ کب اور کن حالات میں راشد صاحب نے اپنی اس خواہش کا اظہار کیا تھا۔ جہاں تک میرا تعلق ہے مجھ سے انہوں نے کبھی سنجیدگی سے اپنی موت کے بارے میں تبادلہ خیال نہیں کیا۔ اس کے کئی اسباب تھے، اول تو یہی کہ وہ زندگی کے اتنی سختی سے قائل تھے کہ موت کا ذکر کم کرتے تھے۔ دوسرے یہ کہ میں جان بوجھ کر یہ موضوع درمیان میں نہیں لاتا تھا کہ کہیں انہیں صدمہ نہ پہنچے اور اگر لاتا بھی تھا تو یوں کہ راشد صاحب اگر میں پہلے مرجاؤں تو میری ساری اردو کی کتابیں اور اردو کے کاغذات اپنے یہاں لے جایئے گا، اور جب تک آپ زندہ رہیں یاد کرتے رہیئے گا۔ اس پر وہ کہتے کہ ساقی میں مرنے ورنے کی فکر نہیں کرتا۔ مجھے اس کی بھی پروا نہیں کہ میری لاش ہسپتال میں چیر پھاڑ کے کام آئے گی یا جلا دی جائے گی یا غرق دریا ہو جائے گی۔ ایک بات میں جانتا ہوں۔ میں چلتے پھرتے مرنا چاہتا ہوں۔ میں بستر میں ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مرنا نہیں چاہتا اور اگر کبھی ایسا ہوا کہ میں چلنے جلنے سے معذور ہو گیا ہوں تو گولیاں کھا کر اپنی زندگی ختم کرلوں گا۔ ان کی طبیعت میں اتنا اضطرار تھا کہ اس موضوع پر وہ زیادہ دیر تک ٹکتے ہی نہیں تھے۔ اسی لئے میں معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ وہ کیا حالات تھے جن میں انہوں نے نہایت سنجیدگی سے آپ دونوں سے اپنی اس خواہش کا اظہار کیا۔"

میں اپنی گفتگو ختم کر کے، جو ایک طرح کی چھوٹی سی تقریر کی شکل اختیار کر گئی تھی، شیلا کی طرف دیکھنے لگا تو شیلا نے بتایا کہ دو بار انہوں نے اپنی اس خواہش کا اظہار کیا تھا۔ پہلی بار جب شیلا کے والد مسٹرا نجلینی کا انتقال ہوا۔ راشد صاحب بھی میت کے ساتھ اسی سائتھ لندن کریمیٹوریم میں گئے تھے۔ اور جب لاش تہ خانے کی بھٹی میں جلنے کے لئے نیچے اتر گئی اور سب لوگ ہال سے باہر نکل کر لان کے پاس کھڑے ہو کر باتیں کرنے

لگے تو یکا یک پتا چلا کہ راشد صاحب لاپتا ہیں۔ کوئی دس منٹ کے بعد آئے۔ معلوم ہوا کہ تختہ سرکنے اور لاش کے یکایک غائب ہونے کا کچھ ایسا اثر حضرت پر ہوا کہ سراغ لگانے اور چھان بین کرنے کے لئے عمارت کے عقب میں چلے گئے اور سنتری سے کہہ سن' سیڑھیاں اتر' تہہ خانے میں پہنچ گئے اور اپنی آنکھوں سے لاش کو جلتا ہوا دیکھا۔ اور راستے بھر اپنے اس تجربے کا ذکر کرتے رہے اور کہتے رہے۔ "میں بھی ایسی ہی "صاف موت" چاہتا ہوں۔ میں مرنے کے بعد Cremate ہونا چاہتا ہوں۔ مجھے یہ طریقہ بہت اچھا لگا۔" اس واقعے سے ان کے تجسس اور ہر بات کی تہہ تک پہنچنے کی تمنا پر بھی گہری روشنی پڑتی ہے۔ پھر شیلا نے بتایا کہ دوسری بار اپنی اس خواہش کا ذکر انہوں نے مرنے سے دو مہینے پہلے کیا تھا۔ جب کھانے کی میز پر وہ دونوں وصیت پر گفتگو کر رہے تھے۔ انہوں نے کہا "مجھے یہ طریقہ بہت پسند ہے اور میں مرنے کے بعد Cremate ہونا چاہتا ہوں۔" پھر شہریار راشد نے بتایا کہ جب چھ سات مہینے پہلے راشد صاحب ان سے ملنے برسلز گئے تھے تو ایک رات کھانے کے بعد کہنے لگے کہ مرنے کے بعد میں Cremate ہونا چاہتا ہوں اور وہ اپنی اس خواہش کے اظہار میں سنجیدہ تھے۔

کوئی 9 بجے یہ مجلس برہم ہوئی۔ چلتے چلتے شہریار نے کہا کہ وہ اگلے دن میرے یہاں آنے سے قاصر ہیں کہ انہیں واپس بلجیئم پہنچنا ہے۔ مجھے سخت حیرت ہوئی کہ ان کے کہنے سے تو میں نے یہ محفل رکھی ہے اور اب یہی نہیں آ رہے مگر میں نے اصرار نہیں کیا۔ عبداللہ حسین اپنی وین میں اور میں اپنی بیوی کے ساتھ اپنی کار میں اور بقیہ حضرات شہر یار صاحب کی کار میں لد کر لندن چلے گئے۔ شہریار کی کار تو کسی اور راستے سے چلی گئی مگر ہم اور عبداللہ آگے پیچھے ہائیڈپارک تک ساتھ آئے۔ ہائیڈپارک کارنر پر عبداللہ نے سگنل دیا تو میں نے کار روک لی اور اتر کر ان کی وین تک پہنچا اور ہم دونوں دیر تک اس عظیم شاعر کی موت کی آخری رسومات کی کسمپرسی اور بے حالی' شیلا کی بد سلیقگی اور شہریار کی اجنبیت پر کڑھتے رہے۔ جی چاہتا تھا کہ ہمارے ساتھ لندن کے ایک کروڑ لوگ گریہ کریں کہ جس دھج سے کوئی مقتل میں گیا وہ شان سلامت رہتی ہے۔ مگر ہم دونوں راشد صاحب کی طرح اپنی اپنی آگ میں جلتے ہوئے اپنے اپنے گھروں کو چلے گئے کہ اگلے دن ہمیں پھر یکجا ہونا تھا۔

دوسرے دن میرے یہاں راشد صاحب کے چند سوگوار جمع ہو گئے۔ یعنی عبداللہ حسین، سجاد ظہیر کی بیٹی نجمہ ظہیر باقر، ڈاکٹر علی باقر، اکبر حیدر آبادی، وقار لطیف اور حبیب حیدر آبادی، جلائے جانے اور دفن کرنے پر دیر تک گرما گرم بحث ہوتی رہی۔ پھر علی باقر نے راشد صاحب پر اپنا مضمون پڑھا اور میں نے راشد صاحب پر سلیم احمد کے مقالے کے کچھ صفحے پڑھے اور ان کی کچھ نظمیں سنائیں اور یوں ہم نے اپنے اپنے طور پر اس رات راشد صاحب کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے رخصت کیا۔ ایک مہینہ پہلے اسی کمرے میں بیٹھے بیٹھے راشد صاحب نے صبح کر دی تھی۔ وہ منع کرنے کے باوجود رات بھر وہسکی پیتے رہے تھے اور ضیا محی الدین اور عبداللہ حسین سے چھیڑ چھاڑ کرتے رہے تھے۔ اس خیال سے بڑا قلق ہوا کہ اب وہ یہاں کبھی نہیں آئیں گے۔ افسوس کہ میرے ان کے تعلقات تشنہ رہ گئے۔ میں نے خوش آمدید تو کہا۔ خدا حافظ نہ کہہ پایا۔ اور "خدا حافظ" کہے بغیر کوئی رشتہ مکمل نہیں ہوتا۔ جس طرح تعلقات شروع کرنے کے کچھ دستور ہیں اسی طرح تعلقات ختم کرنے کے بھی کچھ آداب ہوتے ہیں۔ ان کی اچانک موت کے باعث یہ بے ادبی عجب سرزد ہوئی۔ یہ ملال ہمیشہ رہے گا۔

راشد صاحب سے میری پہلی ملاقات حلقہ ارباب ذوق، کراچی کے ایک جلسے میں ہوئی تھی۔ یہ غالباً 1960ء کی بات ہے۔ میں نے اپنی نظم "مردہ خانہ" اور انہوں نے اپنی نظم "مسز سالامانکا" پڑھی تھی۔ راشد صاحب کا وہ دور تو ختم ہو چکا تھا جب ان کی ہر نظم ایک واقعہ (Event) ہوا کرتی تھی۔ مگر مجھ جیسے نو مشقے اب بھی ان کی ہر نئی نظم کے منتظر رہا کرتے تھے۔ جلسے کے اختتام پر ضیا جالندھری یا حمید نسیم نے ہم دونوں کا تعارف کرایا۔ ان کی باقاعدہ اور میری بے قاعدہ زندگی میں سوائے شعر کے کوئی قدر مشترک نہیں تھی۔ اس لئے ہمارے تعلقات بہت واجبی واجبی سے رہے۔ ان کے اس قیام کراچی کے دوران ہم مشکل سے دس بار ملے ہوں گے۔ میں اس زمانے میں کوئی کام وام نہیں کرتا تھا اور سمجھتا تھا کہ شاعری Full time job ہے۔ رگوں میں جوانی کا لہو ہلکورے لیتا تھا اور فصد شعر کھلی رہتی تھی۔ ایک دن صدر کی انگریزی کتابوں اور رسالوں کی اک دکان میں کسی کتاب کی ورق گردانی کر رہا تھا کہ آواز آئی "ہلو ساقیا۔" راشد صاحب تھے۔ انہوں نے دس بارہ کتابیں خریدیں اور مجھ سے کہا کہ اگر کافی پینی ہو تو ان کے دفتر چلوں۔ میں نے

کہا "چلئے مجھے یوں بھی آپ سے ملنا تھا کہ "نیا دور" کے "جدید شاعری نمبر" کے لئے ایک مضمون لکھ رہا ہوں اور آپ کی کچھ غیر مطبوعہ نظمیں دیکھنا چاہتا ہوں۔" کہنے لگے "گڈ" اور ہم باہر نکل آئے۔ ان کی لمبی سیاہ گاڑی کھڑی تھی جس میں ان کا شوفر اور پرائیویٹ سیکرٹری پہلے ہی سے بیٹھے ہوئے تھے۔ انہوں نے اپنی اینگلو انڈین سیکرٹری سے تعارف کرایا۔ میں راستے بھر یہ طے نہ کر پایا کہ کس کا سیاہ رنگ زیادہ چمکدار ہے' گاڑی کا سیکرٹری کا۔ مگر حق یہ ہے کہ اس سہاگن نے کافی بہت اچھی بنائی۔ دو تین گھنٹے تک باتیں ہوتی رہیں۔ راشد صاحب کی تجویز تھی کہ میں "شاعری" نام کا ایک ماہانہ رسالہ نکالوں جس میں صرف شعر پر بحث ہو۔ وقت میرا' پیسے ان کے رسالہ ٹائپ میں نکلے اور 48 صفحے سے زیادہ کا نہ ہو۔ قیمت ایک روپیہ ہو اور 250 سے زیادہ چھاپا نہ جائے۔ یہ ہو اور یہ نہ ہو' یوں ہو اور یوں نہ ہو۔ غرض ہر بات طے ہو گئی۔ مگر رسالہ نہ نکلا (دوسرے دن کافی ہاؤس میں جب میں نے ضیا جالندھری اور ان کی خوبصورت بیوی شفقت کے سامنے اس رسالے کا ذکر کیا تو ضیا جالندھری نے خبردار کیا کہ راشد تو ایک آدھ سال میں چلے جائیں گے پھر کیا ہو گا اور یہ بھی کہ وہ راشد کے اور میرے دونوں کے مزاج سے واقف ہیں۔ چھوٹی بڑی اناؤں کا ٹکراؤ ہو گا۔ خواہ مخواہ کی بدمزگی ہو گی اور دوسرے شمارے کی نوبت نہیں آئے گی۔ وغیرہ وغیرہ۔ میں ڈر گیا۔)

اسی عرصے میں ضیا محی الدین بھی آ گئے۔ وہ لندن سے آئے ہوئے تھے۔ فون کر کے راشد صاحب سے ملنے چلے آئے تھے۔ راشد صاحب نے ان سے کہا کہ میں کراچی کا ہونہار شاعر ہوں اور مجھے حکم دیا کہ میں اپنی نظم "مردہ خانہ" ضیا محی الدین کو سناؤں۔ ضیا محی الدین کا ایک انگوٹھا کار کے دروازے میں آ کر زخمی ہو گیا تھا۔ ان کے پٹی بندھی ہوئی تھی۔ اس کے باوجود وہ خوف زدہ ہونے کی ایکٹنگ کرتے رہے۔ اور راشد صاحب محظوظ ہوتے رہے۔ کسی نئے شاعر کے کلام میں بزرگ شعرا اتنی دلچسپی کہاں لیتے ہیں۔ ان کی یہ ادا مجھے بہت اچھی لگی۔ انہوں نے کہا کہ کسی دن میں ان کے گھر آؤں اور ان کی غیر مطبوعہ نظمیں دیکھوں۔ دو ہفتے بعد میں فون کر کے ان کے یہاں پہنچا اور انہوں نے اپنی کئی غیر مطبوعہ نظمیں دکھائیں۔ بعض نظموں کے بارے میں تاکید کی کہ میں اپنے مضمون میں ان کا حوالہ نہ دوں۔ میں نے وعدہ کرنے کو تو کر لیا۔ مگر مضمون لکھنے بیٹھا تو وعدہ شکنی

کرنی پڑی۔ میری سمجھ میں نہ آیا کہ جو چیز احاطہ شعور میں ہے اس سے نظر پوشی کیسے کروں۔ مضمون چھپا تو وہ نیویارک میں تھے۔ بعد میں بتایا کہ خفا ہو گئے تھے۔ منیر نیازی اور انیس ناگی سے بھی کچھ زیادہ خوش نہیں تھے۔ اسی زمانے میں "محفل" نیویارک میں جدید شاعری پر مضمون لکھتے ہوئے ہم تینوں کی خاصی تباہی مچائی۔ ان کا یہ فقرہ دیکھئے اور اس کی کاٹ بھی۔ مضمون انگریزی میں ہے۔

"Poets like Munir Niazi. Saqi Farooqi and anis nagi are largely victims of self love, and the Scenes of violence and fear which they portray can only lead lto a sordid view of life, born out of neurotic minds."

تین مختلف الخیال شعرا کو ایک ساتھ نتھی کر دینا راشد صاحب کا انتقام تھا۔ 1964ء میں لندن میں ملاقات ہوئی تو سارے گلے جاتے رہے۔ میری طرف سے ان کے دل میں ایک اور بات سے میل آگیا تھا۔ اپنے قیام کراچی کے دوران انہوں نے دو تین بار کہا تھا کہ میں ان کے بیٹے شہریار کو اردو پڑھا دیا کروں۔ میں ٹال مٹول کرتا رہا۔ ایک طرف تو میری درمیانہ طبقے کی مفلوک الحال ذہنیت ٹیوشن کے اکل حلال کے نام سے زخمی ہوتی تھی دوسری طرف جمیل جالبی اور جمیل الدین عالی سے فون پر یہ کہنے میں ہتک نہیں محسوس ہوتی تھی کہ "سو روپے چاہئیں' آ رہا ہوں۔" شکر ہے ذہن اس غلامی سے آزاد ہو گیا ہے۔ اب میں اپنے لان کی گھاس بھی خود کاٹتا ہوں اور سامنے فٹ پاتھ پر جھاڑو بھی دیتا ہوں۔ یہی نہیں اس سے ایک عجب طرح کی لذت بھی اخذ کرتا ہوں۔ خیر 1964ء میں میرے ایک عزیز دوست اظہار کاظمی نے دفتر میں فون کیا کہ راشد صاحب نیویارک سے آئے ہوئے ہیں۔ موقع اچھا ہے کیوں نہ تین شاعروں کا ایک مشاعرہ بی' بی' سی سے نشر کیا جائے۔ فیض صاحب اس زمانے میں لندن ہی میں ڈیرہ ڈالے ہوئے تھے۔ میں اپنی ایک پرتگالی شاعرہ دوست کے ہمراہ پہنچ گیا۔ یہ پہلا موقع تھا کہ میں نے فیض اور راشد کو یکجا دیکھا' اور افسوس کہ یہ آخری موقع بھی تھا۔ دونوں لئے دیئے رہے۔ فیض صاحب تو اپنی فطری کم گوئی اور ہمہ وقت وہسکی کے سبب سے گفتگو میں بخیلی کرتے رہے مگر راشد صاحب چہکتے رہے۔ وہ اپنی تقریر کی لذت سے ناآشنا نہیں تھے۔ میں نے یونہی سا ایک

سوال پوچھا کہ انگریزی میں کیوں نہ لکھا جائے۔ فیض صاحب نے تو یہ کہہ کر بات ختم کر دی کہ "لکھو۔ کسی زبان میں لکھو۔ میاں ساری بات تو لکھنے کی ہے۔" مگر راشد صاحب کی تاویلات اور دلائل کا دروازہ کھل گیا کہنے لگے۔ "کوئی غیر ملکی، کسی دوسری زبان میں لکھنے کا اہل اسی وقت ہو سکتا ہے جب اسی اجنبی زبان کے الفاظ کے تمام سایوں سے مکمل آشنائی ہو۔ یہ تو ہوئی نثر کی بات، نظم کا جہاں تک تعلق ہے شاعر کا اس زبان میں پیدا ہونا ضروری ہے ورنہ وہ بہت ادنیٰ درجے کی شاعری کرے گا۔" پھر مشاعرہ ریکارڈ ہوا۔ پہلے میں نے ایک نظم پڑھی، پھر راشد صاحب نے پھر فیض صاحب نے۔ دوسرا دور شروع ہوا تو میں نے ایک غزل پڑھی، پھر فیض صاحب نے ایک غزل پڑھی اور غالباً راشد صاحب کی نظم پر رکارڈنگ ختم ہوئی۔ میں مشاعرے کے اختتام سے پہلے چلا گیا، مجھے کہیں جانا تھا۔

اس کے بعد نیویارک اور تہران سے راشد صاحب وقتاً" فوقتاً" لندن آتے رہے اور ہماری ملاقاتیں ہوتی رہیں۔ وہ عموماً آنے سے پہلے ایک خط لکھ دیا کرتے کہ فلاں تاریخ کو پہنچ رہا ہوں۔ فلاں ہوٹل میں ٹھہروں گا۔ سب جاننے والوں کو مطلع کر دو اور کسی اچھے تھیٹر کا ٹکٹ بک کرا دو۔ اس کے علاوہ ہر عید اور کرسمس پر ان کے کارڈ باقاعدگی سے ملتے رہے۔ عید کارڈ میرے نام اور کرسمس کارڈ میری بیوی کے لئے۔

ایک بار آپریشن کراتے ایسی افراتفری میں پہنچے کہ کسی کو اطلاع دینے کی مہلت نہ ملی۔ جب آپریشن ہو چکا اور طبیعت سنبھلی تو بی' بی' سی والوں کو فون کیا کہ ہارلے اسٹریٹ کی ایک پرائیویٹ کلینک میں آرام کر رہے ہیں۔ بی' بی' سی کے ایک صاحب کے ذریعے (جو شاعروں ادیبوں میں اٹھتے بیٹھتے رہتے ہیں) سحاب قزلباش، فہمیدہ ریاض اور میں، اطلاع پاتے ہی ملنے کے لئے پہنچ گئے۔ ہمیں دیکھ کے باغ باغ ہو گئے۔ پوچھا گیا طبیعت کیسی ہے، کہنے لگے "اس نیلی چھتری والے کا کرم ہے۔" کسی نے چھیڑا "نیلی چھتری والا کون؟" ہنس پڑے۔ "نہیں بھائی نہیں۔ اس کا کرم ہے۔" یہ واحد واقعہ ہے کہ انہوں نے خدا کا اتنی خاطر جمعی سے اقرار کیا۔ شاید زندگی کی طرف دوبارہ واپسی پر وہ اپنا کفارہ ادا کر رہے تھے۔ اگر ایسا تھا تو اس کفارے کی میعاد بہت مختصر تھی۔ پھر زندگی کی ہماہمی میں نہ انہیں خدا کی ضرورت پڑی نہ انہوں نے خدا کو یاد کیا۔ یوں بھی کسی منطقی دماغ میں

خدا کے لئے گنجائش کم ہوتی ہے۔

میں دو تین دن بعد پھر حاضر ہوا۔ شیلا بھی تہران سے پہنچ گئی تھیں۔ وہ راشد صاحب کی دلداری کر رہی تھیں۔ ہمارا تعارف ہوا۔ دیکھا کہ فہمیدہ ریاض ایک دن پہلے آ کر اپنی کتاب دے گئی ہیں۔ پوچھا "پڑھی؟ کیسی ہے"؟ کہنے لگے۔ "چھوٹی سی لڑکی، چھوٹا سا درد"۔ ان کی ہر رائے میں ایک طرح کی قطعیت ہوا کرتی تھی۔ مگر اپنی ہر رائے کو پتھر کی لکیر نہیں سمجھتے تھے۔ دوسروں کی باتیں غور سے سنتے، اگر کوئی دلیل اور منطق سے قائل کر دیتا تو اپنی رائے میں تبدیلی کر لیتے۔ ایسا تازہ اور کشادہ ذہن میں نے نہیں دیکھا۔ میں چونکہ چھوٹا آدمی ہوں اس لئے جب یہ بھانپ لیتا ہوں کہ کسی محفل میں دانا میں ہوں تو کوشش کرتا ہوں کہ میں ہی رہوں اور دوسروں کو موقع نہ دوں مگر راشد صاحب کی بڑائی یہ تھی کہ مجھ سے زیادہ جاہل اور ہٹ دھرم لوگوں کو برابری کا درجہ دیتے اور بات کرتے اور سنتے چلے جاتے ہیں بیچ بیچ میں ہولے ہولے ٹوکتا بھی کہ کس بمن سے ------ الجھے ہوئے ہیں مگر ان کے رویہ میں شمہ برابر فرق نہ آتا۔

وہ جب ہسپتال سے ضیا محی الدین کے خالی مکان میں دو ہفتے کے لئے منتقل ہو گئے تو ہم لوگوں کو چائے پر بلایا۔ اس وقت عبداللہ حسین برمنگھم سے لندن آ گئے تھے۔ وہ راشد صاحب سے ملنے کے بہت مشتاق تھے۔ میں نے فون پر کہا کہ عبداللہ کو لے کر آ رہا ہوں۔ کہنے لگے ضرور۔ عبداللہ سے مل کر بہت خوش ہوئے۔ اس وقت ان کے سارے ناول کی تعریف کی مگر بعد میں یہ تعریف ناول کے کچھ حصوں تک رہ گئی تھی۔ یہ آخری دنوں کی بات ہے، ایک معمولی بات پر عبداللہ حسین سے خفا ہو گئے تو مجھے فون کر کے کہنے لگے۔ "وہ ایک Phoney Intellectual ہے۔" میں نے واویلا کیا کہ آپ تو عصمت چغتائی کی طرح باتیں کرنے لگے جو "اداس نسلیں" کو "آگ کا دریا" کا بھونڈا چربا کہتی ہیں۔ پھر یاد دہانی کرائی کہ ساری رات ہم شراب پیتے رہے تھے۔ اور صبح ہونے تک شراب اور شب بیداری نے تھکا دیا تھا۔ ایسے میں غلط فقرے منہ سے نکل ہی جاتے ہیں۔ پھر یہ کہ عبداللہ کو فوراً ہی اپنی غلطی کا احساس ہو گیا تھا اور اس نے صدق دل سے آپ سے معافی مانگ لی تھی اور آپ نے معاف بھی کر دیا تھا۔ مگر ان کا دل اس وقت تک صاف نہ ہوا جب تک عبداللہ اور میں ان سے ملنے دوبارہ چلٹنہم نہ پہنچے۔ ان کی

شخصیت میں خود سری کے علاوہ مغلوب الغضبی کے عناصر بھی بدرجہ اتم موجود تھے۔ جس سے خفا ہو جاتے اس سے مہینوں بلکہ برسوں خفا رہتے اور طرح طرح سے اپنا انتقام لیتے رہتے۔ کچھ واقعات کا ذکر آگے آئے گا۔

تین چار سال پہلے جب وہ اپنی بیٹی تمرین کے داخلے کے سلسلے میں یہاں آئے تو میں نے کھانے پر بلایا۔ بہت سے لوگ جمع تھے اور وہ اپنی نظمیں سنا رہے تھے کہ ایوب اولیاء پہنچے' انہوں نے آتے ہی بتایا کہ اردو کے مشہور شاعر اور راشد صاحب کے ہم زلف مختار صدیقی کا انتقال ہو گیا۔ ایک دم خاموش ہو گئے' کہنے لگے "سخت افسوس کی بات ہے۔ اب اس بیمار عورت کا کیا ہو گا (یہ مختار صدیقی کی بیوہ کا ذکر تھا) خدا کرے کوئی انتظام ہو جائے۔" وہ سارے دن طرح طرح سے مختار صدیقی مرحوم اور اپنی بیوہ سالی کا ذکر کرتے رہے۔ اور اداس ہوتے رہے۔ وہ باہر سے سخت گیر اندر سے بہت ریشم تھے۔ ساری فوں فاں صرف اوپر اوپر تھی اندر اندر کراہتے رہتے۔ مگر کسی کو خبر نہ ہونے دیتے۔ اس میں انہیں اپنی ہتک محسوس ہوتی تھی۔

جب پنشن لے کر لندن آ گئے تو ہمارے تعلقات کا نیا دور شروع ہوا۔ ہماری کوشش ہوتی کہ ہم ایک دوسرے کے ساتھ زیادہ سے زیادہ وقت گزاریں۔ میری خوش قسمتی کہ اردو کا اتنا بڑا دانا و بینا میرا پڑوسی ہو گیا تھا اور ان کی مجبوری کہ میرے علاوہ علم شعر جدید کا ایسا پیاسا اور کوئی نہ تھا۔ مجھے یقین ہے کہ ہم پاکستان میں ہوتے تو تمام قرابتوں کے باوجود اتنا وقت ایک دوسرے کے ساتھ نہ گزارتے کہ وہاں ہم مشربوں اور ہم مسلکوں کی کمی نہیں۔ خود غرضی کی بات اور ہے ورنہ حق یہ ہے کہ اگر راشد صاحب ریٹائر ہو کر پاکستان چلے گئے ہوتے تو ابھی اور زندہ رہتے۔ اظہار اور رسائی کی لذت سے اور فیض یاب ہوتے۔ وہاں کے کالجوں اور یونی ورسٹیوں کے تازہ ذہنوں اور نئے شاعروں اور ادیبوں سے براہ راست جنبانی ہوتی تو ان کا خون بڑھتا اور جینے کی آگ اور تیز ہوتی۔

وہ چلٹنم میں اپنا مکان لینے سے پہلے جب لندن کے ایک خوبصورت محلے چلسی میں ایک کرائے کے فلیٹ میں رہ رہے تھے تو ذہنا" سخت بٹے ہوئے تھے۔ اندر معرکہ لاہور و لندن جاری تھا۔ ایک طرف مجھ سے کہتے کہ میں اپنے علاقے کے تمام ایجنٹوں سے "مکان برائے فروخت" کی لسٹیں بھجوانی شروع کر دوں۔ دوسری طرف فون آتا کہ ارادہ کر

لیا ہے کہ لاہور چلا جاؤں۔ وہاں اپنے چھوٹے بھائی راجہ ماجد کے ساتھ رہوں گا۔ شیلا کو پاکستان پسند نہیں ہے۔ یہ یہیں رہیں گی۔ وہاں میں لکھوں گا پڑھوں گا اور بقیہ ایام گزار دوں گا۔

اسی دوران میں ہماری دعوت کی۔ ہم میاں بیوی پہنچے تو گھر کی فضا سخت برہم تھی۔ بھرے بیٹھے تھے ہمارے سامنے شیلا پر برس پڑے۔ دونوں نے ایک دوسرے کے لتے لینے شروع کئے۔ یہ منظر ہمارے سامنے کئی بار دہرایا گیا چلسی ہی میں نہیں چلتنم میں بھی۔ بعض اوقات ان کے تعصبات دیکھ کر Who is afraid of Virginia Woolf کے میاں بیوی یاد آ جاتے تھے۔ جب دو مختلف شخصیتیں ایک دوسرے سے نامطمئن ہوں، تنہائی میں ایک دوسرے کے اعصاب پر سوار ہونے لگیں اور کسی ہمدردانہ سمجھوتے سے قاصر رہیں تو اپنی بدترین صورتوں میں، بھری بزم میں ایک دوسرے کی بے عزتی کر کے اپنا انتقام لینے لگتی ہیں یعنی تنہائی میں ایک دوسرے کی ہتک سے تسکین نہیں ہوتی بلکہ تماشائیوں کی ضرورت محسوس ہونے لگتی ہے ایک دوسرے سے بے اطمینانی بہت دنوں سے تھی مگر راشد صاحب کے آپریشن کے بعد، جب ڈاکٹر کے مشورے پر دونوں الگ الگ بستر پر سونے لگے تو اور بھی ایک دوسرے کے دل سے دور ہو گئے۔ ڈاکٹر نے ایک عارضی نسخہ بتایا تھا۔ مگر دونوں کو ایسا لطف آیا کہ صورت مستقل ہو گئی۔ یہی نہیں بستر تو الگ ہوئے ہی تھے، کمرے بھی الگ ہو گئے۔ یہ رستگاری کی ایک ناکام کوشش تھی کہ تمام تر ذہنی بعد کے باوجود جنسی ہم آہنگی ایسی کہ آخری عمر میں بھی ہفتے میں دو بار شیلا کے کمرے میں مہمانی کرتے مگر یہ قیام آدھے گھنٹے یا ایک گھنٹے سے زیادہ نہ ہوتا۔ وہ اٹھ کر اپنے کمرے میں چلے جاتے۔ وہ وصال جسے ایک دوسرے کی ذات کے انکشاف کا مژدہ ہونا چاہئے تھا صرف جنسی سمجھوتا بن کر رہ گیا تھا۔

شیلا اور راشد کی شخصیتوں کی تعمیر میں جو عوامل شامل رہے ان کی نشاندہی کرنے سے پہلے میں چند کلمات اس نیک بی بی کے سلسلے میں لکھنا چاہتا ہوں جو راشد صاحب کے پانچ بچوں کی ماں تھیں اور راشد صاحب کی پہلی بیوی تھیں۔ مرحومہ کو میں نے صرف ایک بار دیکھا تھا۔ اس لئے ان کے سلسلے میں ذریعہ معلومات یا تو راشد صاحب خود ہیں یا انکے وہ رویے اور اعمال جو اس طویل مدت کا احاطہ کرتے ہیں۔ میرے مشاہدے کی

حیثیت ثانوی ہے اور اسے اسی نظر سے دیکھنے کی ضرورت ہے۔ ممکن ہے بعض اسباب غلط نتائج بر آمد کرنے کا پیش خیمہ بنیں۔ مجھے اپنی بے بضاعتی کا احساس ہے۔ میں اس تکلیف دہ موضوع سے جلد سے جلد گزر جانا چاہتا ہوں۔

ان کی پہلی شادی' ہمارے ہاں کی بیشتر شادیوں کی طرح' ان کی مرضی کی شادی نہیں تھی'۔ اس میں والدین (یا والد) کی پسند کا دخل زیادہ تھا۔ مرحومہ ایثار اور سگھڑپن کا نمونہ تھیں اور ایسی صابر و شاکر کہ ان کی موجودگی نے راشد صاحب کو گھر گرہستی کے تمام افکار سے نچنت کر دیا تھا۔ بچوں کی پرورش کی تمام تر ذمہ داری انہی کے سر تھی اس لئے بچوں کو ہمیشہ اپنی ماں سے قربت کا احساس زیادہ رہا۔ راشد صاحب اپنے بچوں سے بہت محبت کرتے تھے مگر اپنی شخصیت کی ساخت کے باعث اس کا اظہار کم کم کرتے تھے۔ میرا اپنا خیال یہ ہے کہ بچوں کو اپنے باپ کے یہاں والہانہ پن اور گرمی شوق کی شدید کمی کا احساس ہمیشہ رہا۔ اور ممکن ہے' ان کی بیوی بھی اس آگ پر جلتی رہی ہوں۔ راشد صاحب مجلسی آدمی تھے مگر ان کی بیوی کی تعلیم و تربیت جس ماحول میں ہوئی تھی اس میں شوہر کی پرستش' بچوں کی دیکھ بھال' ایثار اور امور خانہ داری کی خبر گیری پر سارا زور ہوتا ہے (اور کیوں نہ ہو) اس لئے ان سے یہ توقع رکھنا کہ انہیں مجلسی رفاقت بھی دیں گی' ایک طرح کی زیادتی تھی۔ بہر حال راشد صاحب بعض ذہنی اور جذباتی تشنگیوں کی سیرابی مختلف عورتوں میں تلاش کرتے رہے۔ ان تمام لڑکیوں میں ایک چینی لڑکی اور ایک امریکی لڑکی ہیلن کی جنسی اور ذہنی رفاقت کے ہمیشہ احسان مند رہے۔ خاص کر ہیلن نے جو سکھ انہیں دیے وہ ان کی یادداشت کا بہت قیمتی سرمایہ تھے۔ وہ Hetrosexual تھے اور ہیلن نے انتہائے شوق میں ان پر محبت کے سارے دروازے وا کر دیئے تھے۔

اب میں شیلا کے بارے میں چند ایسی باتیں لکھنا چاہتا ہوں جو شاید شیلا کو پسند نہ آئیں گی مگر راشد صاحب میری جس راست گوئی سے اپنی حق گوئی کا بار بار موازنہ کرتے تھے اس کا تقاضا ہے کہ میں اپنی بے باکی پر حرف نہ آنے دوں۔ تکلیف پہنچانا میرا شیوہ نہیں مگر سچائی سفاک ہوتی ہے۔

جب نیویارک میں ان دونوں کی ملاقات ہوئی تو شیلا 33 اور راشد صاحب 53 سال کے تھے۔ راشد صاحب یو' ان' او میں اسسٹنٹ ڈائریکٹر اور شیلا یو' ان' او کے اسکول میں

استانی تھیں۔ راشد صاحب کی سب سے چھوٹی بیٹی تمرین شیلا کی شاگرد تھیں اور وہی ان دونوں کی ملاقات کا وسیلہ ہوئیں۔ راشد صاحب کے قول کے مطابق انہوں نے رعب ڈالنے اور رجھانے کے لئے شیلا کو یو' ان' او کے ایک ایسے جلسے میں مدعو کیا جس میں وہ تقریر کر رہے تھے۔ اور یہیں سے ان کی پینگیں بڑھنی شروع ہوئیں۔ شیلا کہتی ہیں وہ پان سات مہینے عجب طوفانی کورٹ شپ میں گزرے۔ میرا خیال ہے کہ دونوں رفاقت کو ترسے ہوئے تھے۔ شیلا جو ایک شدید عشق کی ناکامی کے بعد خاصی ٹوٹی ہوئی تھیں' ایک پختہ عمر کی استانی کی ویران زندگی سے اکتا گئی ہوں گی۔ راشد صاحب جو اپنی بیوی کی زندگی ہی میں بیوی سے ناآسودہ تھے یا ہو گئے تھے' انہیں عورت چاہئے تھی (شیلا نے اپنے ایک خط میں مجھے یہ بھی لکھا ہے کہ پہلی بیوی کے انتقال کا ایسا صدمہ ان پر ہوا کہ مہینوں وہ اپنے کمرے میں بند رہے) پھر کسی نورس کلی کا طعنہ برداشت کرنے کی سکت ان میں پہلے ہی نہیں تھی۔ اور پچاس سال کی سرحد پھلانگ کر عمر کے سلسلے میں کچھ زیادہ ہی ذکی الحس ہو گئے تھے۔ پھر یہ نہ بھولئے کہ وہ یورپ (جس کی برتری سے وہ ہمیشہ برسرپیکار رہے) کے مقابلے میں سخت احساس کمتری کا شکار تھے۔ شیلا کو ان کے عہدے اور دماغ نے اور انہیں شیلا کی جوانی اور سفید رنگ نے شکست دی ہو گی۔ دونوں ذہنی پختگی کی اس منزل میں تھے کہ عاشقانہ سرمستی ان کے اختیار میں نہیں تھی۔ یہ اپنی شخصیتوں کے چقماق کے ٹکراؤ کی روشنی کو محبت کا نور سمجھے۔ ظاہر ہے وقت کے ساتھ ساتھ انا اور تمکنت کی جنگ کے سائے سائے رفاقت اور ہمسری کے پودے بھی پروان چڑھتے رہے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ یہ ایک دوسرے کے "جیون ساتھی" کم اور ایک دوسرے کی "مجلسی ضرورت" زیادہ بنتے گئے۔ راشد صاحب کی فراست' تازہ ذہنی اور جذباتی شخصیت ایسی تھی کہ سطحی اور بے تہ لوگوں ایسی کامیاب ازدواجی زندگی گزارنا ان کے بس کی بات نہ تھی۔ ایک طرف پہلی بیوی کی منفعلانہ شخصیت تھی جو ان کی بے قدری کا شکار ہوئی' دوسری طرف شیلا کی کٹر' بند اور نیم جاہلانہ ذہنیت جس سے راشد صاحب آخری وقت تک برسرپیکار رہے۔ راشد صاحب گرو تھے اور چاہتے تھے کہ ان کے علم اور خیال کے خزانے سے شیلا بھی گاہے گاہے سیراب ہوتی رہیں مگر شیلا ایک کنزرویٹو استانی کی طرح اپنے دل اور ذہن کے سارے دروازے بند کئے بیٹھی رہیں اور اس بات پر کڑھتی رہیں کہ راشد صاحب

پریکٹیکل آدمی نہیں تھے یعنی نہ انہیں کیل ٹھونکی آتی تھی نہ جھاڑو دینی۔ شعرا اپنی بیویوں یا عورتوں سے یہ توقع نہیں رکھتے کہ وہ بیٹھ کر ان کی شاعری کی خوبیوں کو سراہیں گی یا سمجھیں گی مگر انہیں اپنی شاعرانہ شخصیت اور اپنے لاابالی پن کو سراہے جانے کی توقع ضرور ہوتی ہے۔ چلئے بیوی میں اس کا فقدان بھی سہی مگر شوہر کے سامنے بیٹھ کر یہ کہنے میں شیلا کی کس حس کو تسکین پہنچتی تھی کہ "مجھے شاعری سے کبھی کوئی دلچسپی رہی نہ ہو گی" یہ بھلا رویہ کیا ہوا؟ راشد صاحب مشرق کے سلسلے میں شیلا کی بے تعلقی اور کٹھ حجتی دیکھ کر بار بار فیض کی بیوی اور غلام عباس کی بیوی کی مثالیں دیا کرتے تھے۔ پھر راشد صاحب خاصے دریا دل اور خراج واقع ہوئے تھے' بڑے بڑے ہوٹل' عمدہ شرابیں' ٹھاٹھ دار کھانے' مگر شیلا کا ہاتھ کھلا ہوا نہیں ہے۔ کئی بار راشد صاحب نے مجھ سے کہا "میں تمہارے پاس ٹرین سے آنا چاہتا ہوں مگر شیلا بار بار بس پر اصرار کرتی ہیں۔" ظاہر ہے بس کا کرایہ آدھا تھا مگر بس کے سفر سے راشد صاحب بور ہوتے تھے کہ وقت دگنا لگتا تھا مگر شیلا کی سمجھ میں اتنی سی بات بھی نہیں آئی جبکہ پیسے بھی راشد صاحب ہی کے تھے۔

یہ دونوں ایک طرح کے Love - Hate کے ازدواجی کھیے میں اسیر ہو گئے تھے اور اس گرفتاری کے بعد انہیں ایک دوسرے کی عادت سی پڑ گئی تھی۔ شیلا کہتی ہیں کہ راشد صاحب کے انتقال سے چار پانچ ہفتے پہلے دونوں کے درمیان ایک عجب طرح کی خوشبو دار محبت نے جنم لیا تھا۔ شیلا کی راست گوئی میں مجھے شک نہیں۔ افسوس کہ راشد صاحب کی بے وقت موت کے باعث میں اس مضمون میں اس خوشبو کو مقید کرنے سے قاصر ہوں تاہم اتنا ضرور کہوں گا کہ اس مضمون سے یہ تاثر نہ لیا جائے کہ ان میں ہمہ وقت ٹھنی رہتی تھی۔ ظاہر ہے وہ ایک دوسرے کی دردگساری بھی کرتے تھے اور ایک دوسرے سے حسب استطاعت محبت کرنے کی بھی کوشش کرتے رہتے تھے۔ مگر شخصیتوں کی پختہ کاری ایسی کہ سپردگی کی شہریاری کم اور تمکنت کی ستیزہ کاری زیادہ رہی۔

راشد صاحب کی شخصیت اتنی رنگا رنگ اور ہمہ گیر تھی کہ ان کی زندگی کے تمام پہلوؤں کا ایک مضمون میں احاطہ کرنا مشکل ہے۔ اور میری کوشش کی حیثیت ایک اشاریہ سے زیادہ نہیں۔ تاہم چند واقعات اور مکالمات کا تذکرہ ضروری ہے۔ میں گاہے گاہے ان سے ان کی برائیوں اور اچھائیوں کی تفصیل طلب کرتا رہتا تھا۔ ان کی بڑائی یہ تھی کہ

نہایت بے باکی سے اپنے رازہائے سربستہ سے پردے اٹھاتے جاتے تھے۔ ایک بار اردو کے ایک شاعر کا حوالہ دے کر کہنے لگے "نہ میں نے رنڈی بازی کی نہ کسی طوائف کے قتل کے مقدمے میں ماخوذ ہوا۔ اس کے باوجود میں علامہ بننا نہیں چاہتا۔ میں غالب کی زندہ، متحرک اور مکمل شخصیت کی طرح سامنے آنا چاہتا ہوں۔" وہ آدمی تھے اور آدمی ہی رہنا چاہتے تھے۔ وہ خاکی تھے، نہ نوری تھے، نہ ناری تھے۔ اور ہرچند ساری عمر وہ شاعروں کے شاعر رہے۔ اور عوام کے شاعر نہ بن سکے پر انہیں گفتگو عوام ہی سے رہی۔ ایک دفعہ کہنے لگے۔ "اپنی ریڈیو کی زندگی میں، اپنے چند ماتحتوں پر میں نے سختی ضرور برتی اور اس پر کڑھا بھی ہوں۔ مگر بنیادی طور پر ظلم اور ناانصافی کا سخت مخالف ہوں۔ میں سب کچھ برداشت کر سکتا ہوں ناانصافی نہیں۔ جو شاعر ناانصافی کے خلاف آواز نہ اٹھا سکے اسے شاعری کرنے کا حق نہیں۔"

ایک دلچسپ واقعہ یاد آیا۔ راشد صاحب نے فون کیا کہ میں پاکستان کے سفیر میاں ممتاز دولتانہ تک یہ خبر پہنچا دوں کہ وہ مستقلاً" انگلستان میں آکر آباد ہو گئے ہیں۔ میں نے عرض کیا کہ زندگی میں کسی سفیر یا وزیر کی یہ جرات نہیں ہوئی کہ مجھ سے ملاقات کرے۔ میاں صاحب اس سے مستثنیٰ نہیں۔ مگر حکم عدولی ممکن نہ تھی۔ چنانچہ میں نے میاں صاحب کو فون کیا اور بتایا کہ راشد صاحب آ گئے ہیں اور یہیں بسنے کا ارادہ ہے۔ ساری عمر ملک سے باہر رہے اب ملک کی خدمت کرنا چاہتے ہیں۔ انہیں پیسوں ویسوں کی ضرورت نہیں۔ صرف مصروفیت چاہئے۔ انکے علم اور تجربے کا کوئی مصرف نکل آئے تو بات چلے۔ ظاہر ہے میاں صاحب ان سے واقف تھے کہنے لگے "میں انہیں جانتا ہوں۔ ان سے مل کر بڑی خوشی ہو گی، کسی دن انہیں دفتر لے آیئے۔" بات آئی گئی ہو گئی مگر دو دن بعد میاں صاحب نے فون کیا اور ملاقات کا وقت دیا۔ میں نے دفتر سے چھٹی لی۔ راشد صاحب کو ساتھ لیا اور ایمبیسی پہنچ گیا۔ میاں صاحب بڑے تپاک سے ملے۔ ہمیں چائے پلائی اور چالیس پینتالیس منٹ تک یہ صحبت جاری رہی۔ راشد صاحب کا انداز عجب تھا۔ وہ بیچ میں بیٹھے ہوئے تھے۔ ایک طرف میاں صاحب ایک طرف میں۔ راشد صاحب نے نہ میاں صاحب کی طرف دیکھا نہ میری طرف اور دیوار کی طرف رخ کئے چالیس منٹ تک اپنے بارے میں بولتے رہے۔ میں بیچ بیچ میں کبھی کبھار موضوع بدلنے

کی کوشش کرتا رہا۔ مگر ان کی انا ترنگ پر تھی اور مجھے اس کا لطف بھی آ رہا تھا۔ راشد صاحب اس راز سے واقف تھے کہ وہ پاکستان کے تمام سفیروں اور وزیروں سے زیادہ ذہین' عالم اور روشن طبع ہیں۔ اور اس خاص صحبت میں اسی کا اظہار مقصود تھا۔ ورنہ انہیں اپنی آواز سننے کا ایسا شوق نہیں تھا کہ دوسروں کو بولنے کا موقع ہی نہ دیں۔ کچھ دنوں بعد ان کے ایک اور سفیر دوست سے ملاقات ہوئی۔ ہم ساری رات شراب پیتے رہے 'گندی گندی باتیں کرتے رہے' عالمانہ موشگافیاں بھی رہیں مگر اس صحبت میں راشد صاحب کی گفتگو میں مٹکنے کا نام تک نہ تھا۔ راشد صاحب کم اور دوسرے زیادہ بولتے رہے۔ یہاں انہیں یہ بتانے کی ضرورت نہیں تھی کہ وہ کون ہیں۔ سب ان کے مقام سے واقف تھے اور بزم آشنا میں وہ گلاب کی طرح کھل اٹھتے اور ایک مطمئن مسکراہٹ چہرے پر بکھر جاتی۔

اب میں ایک ایسے مسئلے کی طرف اشارہ کرنا چاہتا ہوں جس کے ذکر سے خود مجھے تکلیف ہوتی ہے۔ راشد صاحب کیا کیا نہ کڑھے ہوں گے۔ میرا خیال ہے ان کا اپنے بچوں کے ساتھ کوئی گہرا جذباتی رشتہ کبھی نہیں رہا مگر اپنے تمام بچوں سے شدید محبت کرتے تھے اور ان کے مستقبل کی فکر میں ہمہ وقت جلتے رہتے تھے۔ (میں نے سنا ہے انہوں نے مرنے سے پہلے اپنے بیٹے شہریار کو ڈیڑھ لاکھ روپے اور اپنی ہر بیٹی کو 75 ہزار روپے بھجوا دیئے تھے سوائے ایک بیٹی کے جنہیں وہ اپنا لاہور والا مکان دینا چاہتے تھے۔ شیلا کہتی ہیں کہ کاغذات کی منتقلی عنقریب مکمل ہو جائے گی' اس کے علاوہ ان کی لائف انشورنس سے پہلی بیوی کے تمام بچوں کو 30' 30 یا 40' 40 ہزار روپے مل جائیں گے۔)

اپنے تمام بچوں کا ذکر نہایت شفقت اور محبت سے کرتے۔ خطوں میں تاخیر ہوتی تو رنجیدہ رہتے' ہمہ وقت ان کی خیریت کی فکر لگی رہتی۔ کسی کا خط ملتا تو چہرے پر دھوپ نکل آتی۔ مگر اپنی ایک بیٹی کے مستقبل کی فکر سے اکثر مضمحل رہتے۔ کہتے کہ اس لڑکی کو شاید کبھی معلوم نہ ہو گا کہ میں اس سے کتنی محبت کرتا ہوں۔ وہ مجھ سے خفا ہے۔ میرا اپنا خیال یہ ہے کہ ان کی یہ صاحبزادی ان سے خفا کم اور روٹھی ہوئی زیادہ تھی۔ خفا وہ شیلا سے ہیں۔ اصل میں شیلا کا اپنی سوتیلی بیٹیوں کے ساتھ کوئی قریبی رشتہ کبھی نہیں رہا۔ راشد اور شیلا کی شادی کے وقت جہاں رشتہ داروں نے مخالفت کی ہو گی وہیں بیٹیوں نے

بھی (میں سب سے چھوٹی بیٹی کا ذکر نہیں کر رہا کہ وہ بچی تھیں اور شیلا کی شاگرد تھیں) ایک طرح کا متحدہ محاذ بنایا ہو گا۔ دوسری طرف شیلا تھیں جنہوں نے بجا طور پر راشد صاحب پر جتا دیا تھا کہ وہ شادی کے بعد ان کی جوان لڑکیوں کے ساتھ نہیں رہیں گی اور راشد صاحب نے صدق دل سے وعدہ بھی کر لیا تھا کہ وہ شخصیتوں کے بعد سے آگاہ تھے۔ قصور کسی کا نہیں تھا اور اگر تھا تو سب کا تھا اور سب سے زیادہ حالات کا تھا جن سے کسی کو رستگاری نہیں تھی۔ ایسے میں غلط فہمیوں کا پیدا ہونا ناگزیر ہے۔ اپنی ایک بیٹی کے ایک خط کے ذکر سے وہ اکثر مرجھا جاتے۔ کاش یہ غلط فہمی ان کی زندگی ہی میں دور ہو گئی ہوتی۔

اس سلسلے میں ایک واقعہ یاد آیا۔ راشد صاحب اور شیلا شادی کرنے لندن پہنچے۔ وہ ہوٹل میں ٹھہرے' یہ اپنے والدین کے ساتھ۔ شادی سے ایک دن پہلے وہ شیلا سے ملنے گئے۔ باتوں باتوں میں تمزین (سب سے چھوٹی بیٹی) کی گڑیاؤں کا ذکر آیا۔ کہنے لگے تمزین بڑی ہو گئی ہے اب اسے گڈے گڑیا کے کھیل کی ضرورت نہیں۔ نیویارک جا کر میں ساری گڑیائیں پھینک دینا چاہتا ہوں۔ شیلا نے کہا تمزین کو سخت صدمہ پہنچے گا۔ ضرورت اس کی ہے کہ دھیرے دھیرے اس کا ذہن دوسری چیزوں کی طرف بتایا جائے۔ کہنے لگے نہیں میں نے فیصلہ کر لیا ہے کہ ساری گڑیائیں پھینک دی جائیں۔ شیلا نے کہا میں ایسا نہیں کرنے دوں گی۔ ایک دم کھڑے ہو گئے اور کہنے لگے کہ میں اپنے بچوں کے سلسلے میں کسی قسم کی دخل اندازی پسند نہیں کروں گا' بچے میرے ہیں اور ان کی دیکھ بھال کی ذمہ داری میری اور صرف میری ہے مگر میں محسوس کر رہا ہوں کہ تم اپنے مزاج کے باعث دخل اندازی سے باز نہیں آؤ گی۔ اس لئے اس لمحے میں نے ایک اور فیصلہ بھی کر لیا ہے اور وہ قطعی ہے۔ میں شادی نہیں کروں گا۔ یہ کہہ کر وہ دروازہ کھول کر اسٹیشن چلے گئے۔ ظاہر ہے شیلا سخت حواس باختہ ہوئی ہوں گی۔ پیچھے پیچھے اسٹیشن پہنچیں۔ وہ جلال کے عالم میں پلیٹ فارم پر ٹرین کے انتظار میں ٹہل رہے تھے۔ شیلا کہتی ہیں معافی مانگنے میں اور منانے میں دو گھنٹے لگ گئے۔ تب جا کر وہ رام ہوئے۔ شیلا کو اس وقت تک دھڑکا لگا رہا جب تک وہ اپنے Best man عباس احمد عباسی کے ساتھ دوسرے دن رجسٹری آفس میں پہنچ نہیں گئے۔ "شوہر راشد" اور "باپ راشد" میں آخری وقت تک

یہ جنگ جاری رہی مگر "شاعر راشد" کی کشادہ قلبی ان دونوں کی امین رہی۔

آیئے ان کی شخصیت کے چند دوسرے پہلوؤں کو دریافت کیا جائے اور انہی کے توسط سے چند شاعروں، ادیبوں کے بعض رویوں کو بھی۔ فیض صاحب کی شاعری پر وہ اتنا کچھ لکھ چکے ہیں کہ مزید اضافہ ناممکن ہے، اس لئے میں ان کی اور فیض کی دو ملاقاتوں کا ذکر کروں گا اور بس۔ ایک بار وہ نیویارک سے لاہور پہنچے۔ ریڈیو اسٹیشن سے نکلے تو ایک پیٹرول پمپ پر فیض صاحب اور ان کی بیوی سے اچانک ملاقات ہو گئی۔ فیض صاحب نہایت گرم جوشی سے بغل گیر ہوئے۔ فوراً اپنی بیوی سے کہا کہ راشد صاحب کو کھانے پر بلائیں۔ ایلس فیض اور راشد نے اپنی اپنی ڈائریاں دیکھیں اور تاریخ نوٹ کرلی۔ وقت نوٹ کر لیا۔ راشد صاحب مغرب میں رہے ہوئے، وقت کے سخت پابند، ٹھیک وقت پر پہنچ گئے۔ رات کا وقت تھا۔ راشد صاحب نے گھنٹی بجائی تو کوئی جواب نہیں۔ راشد صاحب سخت پریشان۔ دو تین بار گھنٹی بجائی تو اوپر کھڑکی سے فیض صاحب کا سایہ نمودار ہوا۔ پوچھا "کون؟" انہوں نے کہا "راشد" جواب ملا "ارے یار تو کہاں —— اچھا —— آ رہا ہوں۔" یہ بہت جزبز اور شرمندہ۔ فیض صاحب نیچے اترے، دروازہ کھولا اور کہنے لگے "میں سمجھا تھا تو مصروف آدمی ہے یار۔ نہیں آئے گا۔" یہ کیا جواب دیتے انہوں نے کہا "بھئی تم نے کھانے پر بلایا اور میں نے وعدہ کرلیا، آتا کیسے نہیں، یہ منطق سمجھ میں نہیں آئی۔" خیر راشد صاحب کے کہنے کے مطابق فیض نے ڈھونڈ ڈھانڈ کے بستر کے نیچے سے وہسکی کی ایک شیشی (جو ہوائی جہازوں پر مسافروں کو دی جاتی ہے اور جس میں مشکل سے دو پیگ ہوتے ہیں) نکالی اور یہ کہتے ہوئے پیش کی کہ "آدھی تو پی آدھی میں پیوں گا۔" راشد صاحب شیشی کا حجم دیکھ کر اتنے شرمندہ ہوئے کہ پینے سے انکار کیا۔ فیض صاحب نے غٹا غٹ وہسکی ختم کی اور شاید دونوں موسم اور حالات حاضرہ پر کچھ دیر تک تبادلہ خیال کرتے رہے۔ راشد صاحب کی طبیعت اتنی منغض تھی کہ زیادہ دیر نہیں بیٹھے اور کوئی بہانہ کر کے اٹھ کر چلے گئے۔ راشد صاحب نے یہ واقعہ کئی بار سنایا، انہیں رنج یہ تھا کہ فیض صاحب نے معافی تک نہیں مانگی۔

کئی سال بعد وہ پھر لاہور آئے تو فیض صاحب نے پھر کھانے پر بلایا۔ وہ پہنچے تو فیض صاحب منتظر ملے۔ مصافحے کے بعد فیض صاحب نے کہا "یار فلانے چودھری صاحب کی

طرف چلنا ہے، اچھی شراب ملے گی۔" راشد صاحب نے کہا "میں انہیں نہیں جانتا۔ نہ مجھے انہوں نے بلایا ہے۔" فیض صاحب کہنے لگے "ارے فکر نہ کر یار تجھے وہ خوب جانتے ہیں۔" غرض بادل نخواستہ یہ ساتھ ہو لئے۔ شراب کے لئے دور چلے پھر فیض صاحب کہنے لگے "یار فلانے صاحب کی طرف چلتے ہیں۔" یہ عجیب مشکل میں تھے۔ کرتے تو کیا کرتے پھر ساتھ ہو لئے۔ پھر شرابیں چلیں۔ فیض صاحب کہنے لگے۔ "یار فلانے شیخ صاحب کے یہاں چل کر کھانا کھاتے ہیں۔ ان کے یہاں کباب بڑے لذیذ ملتے ہیں۔" اب راشد صاحب سے نہ رہا گیا انہوں نے کہا "فیض! دعوت تم نے میری اپنے یہاں دی تھی اور ہو یہ رہا ہے کہ تم زید بکر عمر کے یہاں مجھے گھسیٹے پھر رہے ہو، ان لوگوں کو میں جانتا تک نہیں، اس طرح کی جارحانہ مفت نوشی اور مفت خوری میرے مسلک کے خلاف ہے۔ اس لئے مجھے اجازت دو۔" میرا خیال ہے راشد صاحب کے صبر و ضبط پر قیامت گزر گئی ہو گی۔ وہ سخت اصولوں کے آدمی تھے اور انہیں فیض صاحب کے رویے سے یقیناً بڑی کوفت ہوئی ہو گی۔ انہیں اس بات کا بھی صدمہ تھا کہ فیض صاحب پر شراب نے اس طرح قبضہ کر لیا ہے کہ Self Respect کا زخمی پرندہ ان کے اندر پھڑ پھڑاتا رہتا ہے اور انہیں خبر تک نہیں ہونے پاتی۔ انہیں اس بات کا رنج ہمیشہ رہا کہ ہماری ساری قوم Easy Going ہے اور اسی باعث ابھر نہیں پا رہی۔ وہ ڈسپلن کے سخت قائل تھے اور دوسروں میں اس کی کمی انہیں اکثر اداس رکھتی۔ میرا ذاتی خیال ہے کہ ڈسپلن ہی کی تلاش میں وہ خاکسار پارٹی کی طرف گئے ہوں گے۔ خاکسار پارٹی میں اپنی شمولیت سے وہ اکثر شرمندہ نظر آئے مگر علامہ مشرقی کے بہت قائل تھے اور گفتگو میں پطرس بخاری اور علامہ مشرقی کا حوالہ بار بار دیتے تھے۔

ن۔م۔ راشد اور احمد ندیم قاسمی کے مابین ایک طرح کی Cold war ہمیشہ رہی۔ راشد صاحب نے قاسمی صاحب کے سلسلے میں ادھر ادھر کئی بار لکھا۔ میں بھی احمد ندیم قاسمی کی شاعری کا قائل نہیں ہوں۔ ان کی نوے فیصد شاعری مجھے پسند نہیں۔ اس کا اظہار میں نے اپنے دو مضامین میں اور قاسمی صاحب کے نام ایک خط میں بھی کر دیا ہے۔ قاسمی صاحب میری رائے سے واقف ہیں مگر ان کی بڑائی یہ ہے کہ مجھے بخش رکھا ہے۔ یہی نہیں میری تعریف کر کے مجھے شرمندہ کرتے رہتے ہیں۔ سچی بات یہ ہے کہ قاسمی

صاحب جیسا کشادہ دل' دردمند اور انسان دوست مجھے سارے ہندوستان پاکستان میں کوئی نظر نہیں آتا۔ وہ صحیح معنوں میں ایک عظیم آدمی ہیں' عظیم شاعر وہ ہرگز نہیں۔ اس لئے ان کی شاعری سے جب راشد صاحب انکار کرتے تھے تو مجھے تکلیف نہیں ہوتی تھی مگر ڈیڑھ سال میں پچاسوں دفعہ قاسمی صاحب پر میرا ان کا اختلاف ہوا۔ وہ کہتے تھے کہ قاسمی کی انسان دوستی اور دردمندی اور درد گساری سب ڈھونگ ہے۔ میں کہتا تھا کہ قاسمی صاحب کے جتنے ملاقاتی مجھے ملے سب نے یک زبان ہو کر قاسمی صاحب کی محبت اور شرافت کے گن گائے ہیں (سوائے صفدر میر کے جنہیں منٹو کی طرح قاسمی صاحب میں فراڈ نظر آیا۔) یہ میں مان نہیں سکتا کہ یہ شخص فراڈ ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔ ان کے انتقال سے 15' 20 دن پہلے مشہور روسی شاعر یوتوشینکو چیلمسفورڈ آئے تو راشد صاحب نے فون کیا کہ میں آ جاؤں' انہوں نے ٹکٹ خرید لیا ہے۔ عبداللہ حسین میرے یہاں آئے ہوئے تھے انہوں نے بھی راشد صاحب سے بات کی اور یوتوشینکو کو دیکھنے کی خواہش ظاہر کی۔ راشد صاحب نے ہم دونوں کو بلا لیا۔ یہ ہماری راشد صاحب سے آخری ملاقات تھی۔ اسی دن صبح کو میرے نام قاسمی صاحب کا خط آیا۔ یہ "افکار" کے قاسمی نمبر کے بعد کا زمانہ تھا اور ظاہر ہے قاسمی صاحب نے اس نمبر میں راشد صاحب کا خط پڑھ لیا ہو گا۔ قاسمی صاحب کو کسی نے ایک غلط اطلاع یہ دی تھی کہ میں راشد صاحب پر کتاب لکھ رہا ہوں۔ اپنے خط میں اسی اطلاع کے حوالے سے قاسمی صاحب نے مجھے لکھا۔ "سنا ہے آپ راشد صاحب پر کوئی کتاب لکھ رہے ہیں؟ اگر آپ ایسا کر رہے ہیں تو بہت اچھی بات ہے۔" میں یہ خط اپنے ساتھ چیلمسفورڈ لیتا گیا۔ ہم دونوں نے یہ اصول بنا رکھا تھا کہ ادیبوں' شاعروں اور مدیروں کے سارے خطوط ایک دوسرے کو دکھائیں۔ یہی نہیں راشد صاحب اگر کسی کو خط لکھتے یا کوئی مضمون لکھتے یا کوئی نظم کہتے تو اس کی ایک کاپی ڈاک سے مجھے ضرور بھیج دیتے' ان کا یہ کرم آخری وقت تک جاری رہا۔ ان کی تمام نقلوں میں "ضیا جالندھری کے نام" والے خط کی نقل راشد صاحب کی دلچسپ ترین تحریروں میں سے ایک ہے۔ اس کا ذکر کہیں آگے آئے گا۔ عبداللہ اور میں جب ان کے ڈرائنگ روم میں بیٹھ کر گپ ہانکنے لگے تو میں نے جیب سے خط نکال کر انکے حوالے کیا۔ خط ختم کر کے کہنے لگے۔ "کہاں ہے بھئی وہ کتاب؟" میں ہنس پڑا۔ "راشد صاحب فکر نہ کیجئے۔ کتاب

کا مضمون ذہن میں ہے اور میں ہی نہیں سیکڑوں لوگ آپ پر کتابیں لکھیں گے مگر قاسمی کے بارے میں آپ کا اب کیا خیال ہے میں تو سمجھتا ہوں وہ آدمی کھرا سونا ہے۔" اس کے باوجود انھوں نے اپنے اس لمبے خط کا ذکر نہیں کیا جو انھوں نے قاسمی صاحب کی تعریف میں "افکار۔" کو بھیج دیا تھا (اور جس کی نقل مجھے نہیں بھیجی تھی۔ یہ ان کا واحد خط ہے جس کی نقل مجھے ان کے کاغذات میں ملی جو انھوں نے میرے لئے تیار کی تھی مگر مجھے نہیں بھیجی۔) اور کہا تو اتنا کہا۔ "اس ایک فقرے سے میں اپنی رائے کیوں تبدیل کروں۔" عبداللہ حسین نے کہا۔ "راشد صاحب ممکن ہے ساقی درست ہی ہو اور وہ آدمی (یعنی قاسمی صاحب) اندر سے سچا ہو۔" اب ان کی آواز میں من جانے والی معصومیت تھی کہنے لگے "ہو گا —— تو میں کیا کروں۔" میں نے شہ پا کر کہا "راشد صاحب آج میں وہ سبب معلوم کرنا چاہتا ہوں جس کی بنا پر آپ اور ندیم قاسمی رنجیدہ خاطر ہوئے۔" پائپ کا ایک لمبا سا کش کھینچ کر ہمیں اپنے قریب بلا لیا' کہنے لگے۔ "جس زمانے میں ندیم اور میں ریڈیو اسٹیشن پشاور میں یکجا ہوئے' یہ انہی دنوں کی بات ہے۔ ایک دن وہ میرے دفتر میں آئے اور کہنے لگے کہ ریڈیو پر نسوانی آوازوں کی کمی ہے چند خواتین کو سامنے لائیے۔ اس زمانے میں ان کے یہاں ہاجرہ مسرور اور خدیجہ مستور ٹھہری ہوئی تھی۔ میں نے کہا "خواتین میں کہاں سے پیدا کروں' دو ذہین لڑکیاں تھیں انہیں آپ اغوا کئے بیٹھے ہیں' میں کیا کروں۔" یہ فقرہ کہہ کر میں ہنسا مگر قاسمی کے چہرے کا رنگ اڑ گیا۔ وہ غصے سے کھڑے ہو گئے اور کمرے سے باہر چلے گئے۔ پان سات منٹ بعد واپس آئے' کہنے لگے "راشد صاحب! اگر آپ ن - م - راشد نہ ہوتے تو میں اتنے زور سے طمانچہ مارتا کہ آپ کا چہرہ بگڑ جاتا۔" یہ کہہ کر جذبات سے کانپتے ہوئے کمرے سے باہر نکل گئے۔ کسی مزیدار فقرے کو سراہنے کا ایسا فقدان میں نے کسی میں نہیں دیکھا۔ سنا ہے اب وہ ہنسنے ہنسانے لگے ہیں۔ بس یہیں سے ہمارے تعلقات میں گرہ پڑ گئی۔" انھوں نے اتنی صاف گوئی اور معصومیت سے ہمیں یہ واقعہ سنایا کہ عبداللہ حسین اور میں ان کے اور ان کی بڑائی کے اور قائل ہو گئے اور ہمارے دلوں میں ان کی قدرومنزلت اور بڑھ گئی۔

بعد میں ان کے کاغذات میں جب مجھے اس خط کی نقل ملی جو انھوں نے صہبا

لکھنوی کو لکھا تھا تو مجھے سخت تعجب ہوا اور عجب مسرت حاصل ہوئی کہ لیجئے قاسمی صاحب کی شخصیت ہی نہیں، ان کی شاعری کی تعریف میں بھی زمین آسمان کے قلابے ملا دیئے۔ دوسری طرف انہیں کاغذات میں پنسل سے لکھا ہوا یہ فقرہ بھی ملا "احمد ندیم قاسمی کی شاعری سبزی خور ذہن کی پیداوار ہے۔" مجھے یقین ہے اس فقرے کے حسن پر قاسمی صاحب بھی مسکرائیں گے۔ اچھا فقرہ چاہے کسی کا ہو اور چاہے کسی پر ہو، ضائع نہیں جانا چاہئے۔ میں راشد صاحب اور قاسمی صاحب کے تعلقات پر مزید کچھ نہیں لکھنا چاہتا مگر پشاور والے واقعے کے باب میں اتنا ضرور کہوں گا کہ ان دو مشہور لکھنے والیوں کے سلسلے سے چند کمینے مرد ادیبوں، شاعروں نے بعض احمقانہ اور ذلیل افواہیں پھیلا رکھی تھیں۔ (خیال اغلب ہے کہ ہاجرہ مسرور کی جودت طبع اور خدیجہ مستور کی فراست نے ان لوگوں میں احساس کمتری پیدا کیا ہو گا) ظاہر ہے قاسمی صاحب جو طبعاً" ہیرا ہیں، وہ ان افواہوں سے خاصے دکھی اور زخمی ہوں گے، ایسے میں راشد صاحب کے فقرے سے اور ٹوٹ گئے ہوں گے ورنہ وہ ایسے سخن ناشناس نہیں کہ مذاق اور کینے کا فرق نہ سمجھیں۔ دل دکھانا راشد صاحب کا شیوہ نہیں تھا۔ ہاں اگر کوئی ان کا دل دکھاتا تو ہزار طرح کے آزار دینے کے درپے رہتے۔ مگر دل دکھانے میں پہل نہیں کرتے تھے۔ میں اس کا گواہ ہوں۔

ایک دوسرا قصہ سنئے۔ آخری بار جب راشد صاحب پاکستان گئے تو کراچی ٹیلی ویژن والوں نے انہیں مدعو کیا کہ ایک انٹرویو کا رکارڈ کرا دیں۔ انٹرویو کرنے کے لئے ضیا جالندھری سے زیادہ موزوں آدمی کراچی میں اور کون ہوتا جو خود ایک خوشگو شاعر ہیں اور جن سے راشد صاحب کے برسوں پرانے تعلقات تھے۔ وہ آئے تو انہوں نے انٹرویو کرنے سے انکار کر دیا۔ ضیا جالندھری کو اپنی ہتک محسوس ہوئی۔ جہاں تک میرا خیال ہے ہم سب کی طرح ضیا جالندھری بھی ان کی شاعرانہ عظمت کے قائل تھے اور ہیں۔ پھر یہ کہ طبعی اور شاعرانہ عمر میں بھی راشد صاحب سے چھوٹے تھے۔ انہیں انکار نہیں کرنا چاہئے تھا۔ جب راشد صاحب نے مجھے یہ واقعہ سنایا تو مجھے سخت کوفت ہوئی اور اس لئے بھی کہ راشد صاحب اس بات سے غمزدہ رہے۔ ضیا جالندھری میرے پرانے کرم فرما اور بہت اچھے دوست ہیں۔ ایک دن بی بی سی ٹیلی ویژن کے سلیم شاہد کا فون آیا۔ "ضیا آ رہے ہیں، مشاعرہ کرنا چاہتا ہوں مگر راشد صاحب نے آنے سے انکار کر دیا ہے۔ میں اصرار کر

کر کے تھک گیا مگر ان کی "نہیں" کا کوئی جواب نہیں۔ انہیں صرف تم لا سکتے ہو۔" میں نے کہا' انہیں فون مت کرو۔ رکارڈنگ کا انتظام کرو۔ مہمانوں کو دعوت نامے بھیج دو میں لے آؤں گا۔ مجھ پر چھوڑ دو۔ شام کو راشد صاحب کو فون کیا۔ وہی دل موہ لینے والی آواز آئی "بلہ ساقیا۔" میں نے کہا راشد صاحب ضیا جالندھری آ رہے ہیں' کہنے لگے "معلوم ہے۔" میں نے کہا سلیم شاہد نے فون کیا تھا۔ کہنے لگے "میں نہیں جاؤں گا۔" میں نے کہا راشد صاحب ملنا تو آپ کو پڑے گا ہی کہ ضیا کو میں اپنے گھر پر بلاؤں گا۔ یعنی آپ' ضیا' عبداللہ اور میں' ہم چاروں مل کر ہنگامہ کریں گے۔ کہنے لگے "تمہارے یہاں بھی نہیں آؤں گا۔" میں نے کہا آپ کیا چاہتے ہیں۔ میں خودکشی کر لوں؟ اپنے کو گولی مار لوں؟ ہنسے' کہنے لگے "ساقی مجھے مجبور مت کرو۔" غرض کہ مان گئے۔ پل میں ہیرا پل میں ریشم۔ افسوس کہ ضیا جالندھری کا دورۂ لندن منسوخ ہو گیا۔ ورنہ دلوں کی صفائیاں ہو جاتیں۔ یہ غالباً مئی یا جون 1975ء کی بات ہے۔

اس سے پہلے 7 اپریل کو انہوں نے ضیا جالندھری کو ایک خط لکھا تھا جس کی ایک نقل مجھے بھیجی تھی۔ خط یوں شروع ہوتا تھا۔ عزیزی ضیا' حال ہی میں کراچی سے کسی دوست نے اپنے ایک خط میں تمہارے کسی تازہ مضمون کا ذکر کیا ہے جس میں اور باتوں کے علاوہ اس خاکسار کا بھی ذکر خیر ہے۔ اس نے تمہارے مضمون سے صرف دو جملے نقل کئے ہیں ----" اس خط کی نقل انہوں نے صبح کو مجھے ڈاک سے بھیجی مگر ان کی تسلی نہیں ہوئی۔ شام کو فون آیا۔ "میں تمہیں ٹیلی فون پر وہ خط سنانا چاہتا ہوں۔" خط کا پہلا فقرہ' جو میں نے اوپر درج کر دیا ہے' سنا کر کہنے لگے "میں اسے (یعنی ضیا کو) یہ سکھ نہیں دینا چاہتا کہ اس کا مضمون میری نظر سے گزر چکا ہے۔ حالانکہ میں سارا مضمون افکار' میں پڑھ چکا ہوں۔" یہ کہہ کر شرارت سے خوب ہنسے۔ یہ ان کا بدلہ تھا۔ کمال زندہ اور متحرک آدمی تھے۔ ہر فقرے کی کاٹ محسوس کرتے اور حملہ کرتے۔ کوئی ایک فقرہ کہتا یہ دس فقرے لگاتے۔ وہ بزرگ ہو کر Out of date ہونا نہیں چاہتے تھے بلکہ ہر وقت ادب کے مرکزی دھارے میں شامل رہنا چاہتے تھے۔ ماضی سے ان کی دلچسپی کم تھی' وہ مستقبل کے آدمی تھے اور حال سے اپنا خراج وصولتے رہتے۔

میں نے اس مضمون میں ان کی شخصیت کی چند جھلکیاں دکھا دی ہیں۔ ان کی

شاعری الگ مضمون یا کتاب مانگتی ہے۔ زندگی نے مہلت دی تو اس فریضے سے عہدہ برآ ہونے کی کوشش کروں گا۔ فی الحال اس ضدی اور جنگجو' شاعر کے ایک فقرے پر اس مضمون کو ختم کرتا ہوں۔

ایک بار فون آیا "ساقی۔ چوتھا مجموعہ تیار ہے۔ میری خواہش ہے کہ دیباچہ تم لکھو۔" بوکھلاہٹ میں ڈھیر ہو گیا۔ پھر ذرا سنبھالا تو ہکلا ہکلا کر عرض کیا کہ میری کیا مجال راشد صاحب؟ آپ بھی کمال کرتے ہیں' آپ کو پڑھ پڑھ کر تو شعر لکھنا شروع کیا ہے۔ آپ میری سست رفتار ذہانت پر کچھ زیادہ ہی بھروسا کرنے لگے ہیں۔ آپ پر مضمون لکھنے کے لئے مجھے کم از کم ایک سال کی فرصت درکار ہے کہ میں راشد کو اقبال کے بعد (یگانہ اور فراق فیض اور میرا جی کے باوجود' اردو شاعری کی سب سے زیادہ دور رس اور طاقت ور آواز سمجھتا ہوں۔ وہ بہت خوش ہوئے ہوں گے کہ انہوں نے میری جان بخشی کر دی۔ کہنے لگے۔ "اچھا۔ یار' مگر وہ مضمون سوچنا تو شروع کر دو۔" پھر ایک لمحے کے توقف کے بعد کہنے لگے۔ "تو ایسا کرتا ہوں کہ اپنے آپ سے سوال جواب کرتا ہوں' میرا خیال ہے دیباچے کی یہ صورت بہتر رہے گی' اس میں ندرت بھی ہے۔" پھر اگلے ہفتے ملنے کا وعدہ کر کے فون بند کر دیا۔

افسوس کہ وہ "اگلا ہفتہ" پھر کبھی نہیں آیا کہ اس عرصے میں یہ عالم شاعر ہم سے ہمیشہ کے لئے جدا ہو گئے۔ بعد میں ان کے کاغذات میں مجھے مندرجہ ذیل عبارت نظر آئی یعنی "ن - م" کا ایک سوال اور "راشد" کا جواب۔

"ن - م: آپ کسی اعتبار سے "پاپولر" شاعر نہیں ہیں۔ پھر یہ چوتھا مجموعہ کیوں شائع کر رہے ہیں؟

راشد: "ماورا" جب شائع ہوئی تھی تو اس نے ادبی حلقوں میں خاص ہیجان پیدا کر دیا تھا۔ اکثر لوگوں نے اس کی تعریف کی یا مذمت' مضحکہ اڑانے والوں کی بھی کمی نہ تھی۔ مجھے خوشی ہے کہ ایسے لوگ کم ہیں جنہوں نے بعد کے دو مجموعوں کی کسی گہرے شعور اور فراست کے ساتھ ستائش کی ہو۔ اس سے مجھے یقین ہو گیا ہے کہ یہ مجموعے "ماورا" سے بہتر ہیں اور ان میں زیادہ گہرائی ہے۔ بعض لوگ ان کو "ماورا" ہی کا شاخسانہ دیکھنا چاہتے تھے۔ وہ اس پر خوش نہیں ہیں کہ شاعر نے بعد کے مجموعوں میں کوئی نئی کروٹ لی ہے یا

نئے استعجاب یا نئی بے قراری کا اظہار کیا ہے۔ چوتھے مجموعے پر بھی اگر فوراً تعریف کے ڈونگرے نہ برسائے گئے تو میں اور بھی خوش ہوں گا۔ اسی لئے اسے شائع کر رہا ہوں۔"

اس صفحے پر اور کچھ نہیں ہے اور راشد صاحب کی تحریر نقل کرتے ہوئے میری آنکھیں بھیگ گئی ہیں۔

راشد صاحب! عبداللہ حسین نے ٹھیک ہی کہا تھا۔

"It was a great privilege to know you"

فیض احمد فیض

'زادِ سفر' کا ایک ورق

اگلے زمانے میں جن لوگوں کو کچھ بھی علمی ذوق ہوتا تھا وہ اپنے پاس ایک ایک بیاض رکھا کرتے تھے۔ کبھی اس کی تقطیع کتابی ہوتی جس کا شیرازہ عرض میں کاغذوں کو موڑ کر باندھا جاتا ہے، کبھی طول میں کاغذوں کو بھی کی طرح موڑ کر باندھتے۔ وہ ایک سادی کتاب ہوتی جو ہر وقت پاس رہتی۔ چھاپہ خانہ اس زمانے میں نہیں تھا، کسی خوش قسمت کو خود لکھ کر یا لکھوا کر کتابیں مل بھی جاتیں تو اس زمانے میں جب کہ ریل نہیں تھی اور اس طرح سفر آسان اور سہل نہیں تھا، کتابوں کو اپنے ساتھ ساتھ سفر میں رکھنا دشوار تھا اور رکھتے بھی تو سارا کتب خانہ کہاں کہاں لئے پھرتے۔ وہی سادی کتاب ساتھ رہتی۔ اسی وجہ سے اس بیاض کا ایک نام "زاد السفر" بھی تھا۔

سید عبدالحی

مصنف "گلِ رعنا" لکھنؤ

6 ربیع الثانی 1340ھ

فیض صاحب کے انتقال کے فوراً بعد، لندن کے ایک تعزیتی جلسے میں، جو تقریر میں نے کی تھی اس کے ابتدائی جملوں کو آج اس لئے دہرا رہا ہوں کہ اپنا دکھ آپ تک پہنچا سکوں۔ اور اس لئے بھی کہ ان افواہوں اور غلط فہمیوں کی تردید ہو سکے جو میری ایذا کے لئے بعض دل آزار ہم عصروں نے پھیلا رکھی ہیں:

معزز خواتین و حضرات،

ایک اندازے کے مطابق کم از کم تیرہ کروڑ اسی لاکھ سولہ ہزار نو سو دو افراد فیض

صاحب کے نام سے واقف ہیں۔ ان میں سے پچاس فی صد ایسے ہیں جنہیں ان سے مصافحہ کرنے کا شرف حاصل ہوا۔ دس فی صد ایسے ہیں جنھوں نے ان کے ساتھ تصویر کھنچوائی۔ ان میں سے 5 فی صد ایسے بھی ہوں گے جن کے کاندھے پر مرحوم نے اپنا دلدار ہاتھ رکھ دیا ہو گا۔ اب وہ چلے گئے ہیں تو تیرہ کروڑ اسی لاکھ سولہ ہزار نو سو دو سینوں میں کہانیاں پھڑ پھڑا رہی ہیں۔ بڑا شاعر کیا کرتا ہے' یہ مجھے نہیں معلوم۔ مگر جب بڑا آدمی جاتا ہے تو کہانیاں ہی کہانیاں چھوڑ جاتا ہے۔ افسوس کہ ضعف حافظہ کے باعث لوگوں نے حفیظ جالندھری مرحوم کی کوئی کہانی سنبھال کے نہ رکھی لیکن فیض صاحب والے اس سیکڑوں' ہزاروں' لاکھوں' کروڑوں کے ہجوم میں ایک نہایت افسردہ' معمولی اور بے شمار میں بھی ہوں-----

ابھی فیض صاحب میرے اندر ٹپ ٹپ گرتے ہوئے آنسوؤں کے پردے میں ہیں اس لئے ان کی شخصیت پر کوئی ڈھنگ کی بات کہنا میرے لئے ممکن نہیں۔ جب یہ پردہ ہٹے گا اور دھند چھٹے گی تو اپنی ننھی منی داستان میں بھی سنا دوں گا جو چالیس پچاس ملاقاتوں پر مبنی ہے' جو 1964ء میں اسپینیرڈس ان (Spaniard's Inn) لندن میں شروع ہوئی تھی اور 1984ء میں زہرا نگاہ اور ان کے میاں ماجد علی کے مکان پر ختم ہوئی۔ اور یہ داستان بھی اس لئے کہ مجھے اپنی گستاخیوں پر ندامت ہو اور ان کی شخصیت کی بڑائیاں نکھر آئیں----

(فیض اکیڈیمی لندن - 1984ء)

اب کہ یاد کا چاند برج سکون میں ہے' داستان سنانے کی گھڑی آن پہنچی ہے۔ میرے ذہن میں مہینہ اور سنہ اتنے الجھے ہوئے ہیں کہ تاریخی ترتیب تقریباً ناممکن ہے مگر کوشش کرتا ہوں۔ لندن آنے سے پہلے میں ان سے کبھی نہیں ملا۔ جب میں نے لکھنا شروع کیا تو وہ جیل میں تھے اور میں اردو کالج میں سائنس کا طالب علم۔ یہ 1952ء تھا۔ یعنی میرے خاندان کی غربت کے عروج کا زمانہ تھا۔ جب صرف روٹی اور چٹنی پر گزارا ہو تو رسالہ خریدنے کی جرات کہاں سے آئے۔ صدر کے دو تین بک اسٹالوں کا روزانہ پھیرا کرتا تھا۔ میری حریص نظریں دو چیزوں کی سخت متلاشی رہا کرتیں۔ منٹو کا نیا افسانہ اور

فیض کی نئی نظم یا غزل۔ اس زمانے میں ان دونوں کی چیزیں صرف لاہور کے رسالوں میں چھپا کرتیں۔ فیض صاحب کا کلام جوں ہی چھپتا میں دو تین اسٹالوں کا چکر لگا کر حفظ کر لیتا۔ دوسرے دن کالج پہنچ کر اپنے دوستوں پر اپنی اولیت کی دھونس جماتا۔ مگر منٹو کے افسانوں کا معاملہ جدا تھا۔ ایک صفحہ یہاں دوسرا وہاں۔ اسٹال ختم ہو جاتے افسانہ ختم نہ ہوتا۔ زیادہ عرصہ ایک ہی جگہ پر مفت خوری کرنا خطرے سے خالی نہ تھا کہ اسٹال کے مالکوں کی آنکھوں میں بے زاری اور دشمنی کے آثار نمایاں ہو جاتے۔ اس لئے اپنے ایک اور غریب دوست کو ساتھ لے جاتا۔ پلان کے مطابق میں پہلا صفحہ پڑھتا اور اسٹال کے دوسرے کونے میں کھڑا وہ دوسرا صفحہ ہضم کرتا۔ پھر ہم آنکھوں ہی آنکھوں میں اشارے کرتے اور اگلے اسٹال کی طرف روانہ ہو جاتے اور راستے میں پلاٹ اور کرداروں سے ایک دوسرے کو آگاہ کرتے۔ یوں صدر ہی کے اسٹالوں پر افسانہ ختم کر لیتے اور بولٹن مارکیٹ کے اسٹالوں پر جانے کی ضرورت محسوس نہ ہوتی۔ ایک بار "امروز" نے فیض صاحب کی کسی نئی نظم یا غزل کی اطلاع دی۔ غالباً سویرا یا نقوش یا ادب لطیف میں چھپی تھی۔ مجھے اپنے کرب کا عالم یاد ہے۔ میں چکر لگا لگا کے تھک گیا مگر صدر کے اسٹالوں میں یہ رسالے نہیں ملے۔ یہ معلوم کر کے کہ تمام رسالوں کا ٹھیکہ طاہر نیوز ایجنسی (بولٹن مارکیٹ) کے پاس ہے میں کالج ختم کر کے وہاں پہنچ جاتا۔ صرف یہ پتا چلانے کہ بلٹی آئی کہ نہیں۔ آخر پندرہ دن کے چکر کے بعد انہوں نے بتایا کہ لاہور سے نئے رسالے آئے ہیں۔ بغیر رسالہ دیکھے ایسی انجانی خوشی ہوئی کہ آنکھیں بھیگ گئیں۔ پوچھا پہلے کس بازار میں یہ رسالے جاتے ہیں۔ انہوں نے بتایا صدر میں۔ میں نے کچھ سفر ٹرام پر کیا۔ ٹکٹ کلکٹر کو قریب آتا دیکھ کر عالم حیرت میں اتر گیا اور پیدل چلتا ہوا رسالے تک پہنچا۔ آنکھیں جگمگا اٹھیں۔ نظم تھی "اے روشنیوں کے شہر۔" مختلف اسٹالوں کی زیارت کے بعد نظم یاد کی۔ حفظ ماتقدم کے طور پر اپنی نوٹ بک میں مصرعے لکھتا گیا۔ نظم مکمل کر کے سیدھا اردو کالج پہنچا۔ کوئی نہ تھا۔ صبح کی کلاسیں ختم ہو چکی تھیں۔ شام کے لوگ ابھی نہیں پہنچے تھے۔ میں ادھر ادھر ٹہل کر وقت ضائع کرتا رہا کہ ناگہاں ابن انشا مرحوم نظر آئے۔ وہ ایم اے فائنل میں تھے اور میں آئی ایس سی (انٹرمیڈیٹ سائنس) کا طالب علم۔ میں نے جلدی جلدی اپنا تعارف کرایا اور کہا کہ فیض صاحب کی نئی نظم آپ نے

دیکھی۔ کہنے لگے "آپ روشنیوں کے شہر کا ذکر تو نہیں کر رہے" میں نے کہا "جی ہاں ---" کہنے لگے وہ رسالہ مجھے پچھلے ہفتے مل گیا تھا' مجھے سخت صدمہ ہوا۔ مجھے یاد ہی نہیں رہا کہ ابن انشاء تو خاصے مشہور شاعر بن چکے تھے جب کہ مجھے کوئی نہ جانتا تھا۔ وہ ایک دو منٹ میرے پاس ٹھہر کر غالباً بابائے اردو سے ملنے انجمن ترقی اردو کی عمارت کی طرف چلے گئے اور میں کسی نئے شکار کی تلاش میں۔ فیض صاحب کی نظم کا ایسا نشہ تھا کہ میں ساری دنیا کو اپنی مستی میں شامل کر لینا چاہتا تھا۔ رقص کرنا چاہتا تھا۔ فیض صاحب کی شاعری کے عاشق لاکھوں ہیں مگر اتنی وحشت سے رم کتنوں نے کیا ہو گا۔ یہ باتیں قدرے تفصیل سے اس لئے لکھ دی ہیں کہ بعد میں ایک شاعر کی حیثیت سے جو اختلاف میں نے کیا اس کا پس منظر نمایاں ہو سکے اور مختلف اخباروں اور رسالوں میں گاہے گاہے جو ذاتی حملے اس تعلق سے مجھ پر ہوئے ہیں ان کی نوعیت سمجھنے میں آسانی ہو۔ اس سلسلے میں دو چار باتیں اور۔

اب ہم 1955ء میں ہیں۔ میری پہلی غزل "ادب لطیف" میں چھپ چکی تھی۔ ترقی پسندوں کی سانس اکھڑ چکی تھی مگر نام نہاد ترقی پسند شاعری (یعنی وہ شاعری جس میں یہ بتایا جاتا ہے کہ یہ رات کب ختم ہو گی' وہ سحر کب طلوع ہو گی' اخباروں رسالوں میں اب بھی اپنی بہار دکھا رہی تھی۔ اور یہ بد سرشت خزاں نصیب سیکڑوں شاعروں کو مار کر بھی نہیں مری اور آج بھی بعض مردوں کے یہاں زندہ ہے۔ فیض صاحب نے "سحر"۔ "شام"۔ "مقتل"۔ "دار"۔ "سنگ"۔ "لوح"۔ "قلم"۔ "صلیب" اور ایسے پچاسوں الفاظ کی قدر و قیمت کم کر دی تھی اور انہیں آفاقیت کے نگار خانوں سے گرفتار کر کے محدودیت کے زندانوں میں ڈال دیا تھا۔ یہ شاعری آسان تھی' اکہری تھی' جوشیلی تھی اور غیر ذاتی تھی۔ ایک رنگ کے مضمون کو سو ڈھنگ سے باندھنے والی تھی۔ میں نے بھی خوب خوب مشق کی۔ 1958ء تک سو سوا سو نظمیں لکھ کر مقتلوں اور صلیبوں کے انبار لگا دیئے۔ اس زمانے کے "امروز" اور لیل و نہار" میں ہر ہفتے اپنی کسی نہ کسی نظم کا کمپا لگا کے "سحر" کا انتظار کرتا۔ (فیض صاحب دونوں کے چیف ایڈیٹر تھے)۔ اس کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہوا کہ زبان کی زنجیر اور ہاتھ کی گرہ کھل گئی۔ دوسرا یہ کہ اپنی اور دوسروں کی ایک پرت کی شاعری سے دل ہمیشہ ہمیشہ کے لئے مکدر ہو گیا۔ میں نے "شمشاد کی صلیبیں" کے سوا اپنی

تمام نظمیں نذز آتش کر دیں اور آج تک اس راکھ کی طرف پلٹ کر نہیں دیکھا۔

مگر 1936ء کی تحریک کو معاف کرنا اس لئے آسان ہے کہ اس نے ہمیں فیض جیسا البیلا شاعر دیا جس کی ساحرانہ اور دردمند شخصیت نے اپنی تمام فنی جمالیات کے ساتھ اس قسم کی شاعری کو ایک ایسے نقطہ عروج پر پہنچایا کہ دوسرے ترقی پسند شاعر بونے نظر آنے لگے۔ بلکہ یہ کہنا بھی ناجائز نہیں کہ انہوں نے رجائی اور رومانی شاعری کے بیشتر امکان پورے کرکے دکھا دیئے اور بقیوں کے لئے اس کا جواز تقریباً ختم کر دیا۔

یہاں فیض صاحب کی شاعری کی خوبیوں اور خامیوں سے بحث نہیں۔ اس پر میں تفصیلی طور پر کہیں اور لکھ چکا ہوں۔ میرا مسئلہ میرا جی' راشد' محمد حسن عسکری' ممتاز شیریں بلکہ ان کے فوراً بعد ابھرنے والوں انتظار حسین' ناصر کاظمی' سلیم احمد' منیر نیازی اور وزیر آغا جیسے لوگوں سے الگ تھا۔ اسے سمجھنے کے لئے ضروری ہے کہ میں اپنی اس تقریر کا اقتباس پیش کروں جو میں نے سردار جعفری کو لندن میں خوش آمدید کرتے ہوئے ان کی سترویں سالگرہ پر کی تھی۔

جناب والا ---- میرا سیاسی مسلک آپ سے جدا نہیں ہے کہ کمیٹڈ سوشلسٹ ہوں بلکہ یہاں بسنے کے بعد اور بائیں کی طرف سرک گیا ہوں مگر شاعری میں صرف ایک ہی خیال اور ایک ہی جذبے کو متھنے کا قائل نہیں کہ میری کمٹ منٹ صحافت سے نہیں شاعری سے ہے جو پوری ذات کا مکمل اظہار مانگتی ہے ----'

میں نے اپنا سیاسی مسلک اور شاعرانہ مذہب آپ کے سامنے رکھ دیا ہے۔ اب آیئے ہم فیض صاحب کی طرف لوٹ چلیں۔ 1962ء میں انتظار حسین نے "ادب لطیف" کی ادارت سنبھالی۔ اور ناصر کاظمی مرحوم سے صلاح و مشورہ کرکے مجھے دعوت دی کہ میں کوئی "گرما گرم" مضمون لکھوں۔ عجب زمانہ تھا۔ میں ہمہ آتش رہا کرتا۔ مدیر کی "گرما گرم" کی قید غیر ضروری تھی۔ دو صفحے کا ایک مضمون "میں سب کا مخالف ہوں" لکھ کر بھیج دیا۔ اس پر نو دس مہینے تک واویلا ہوتا رہا۔ میرے خوب خوب لتے لئے گئے مگر انتظار حسین کے مزے آگئے۔ یہ آگ ذرا مدھم ہوئی تو انہوں نے میری حمایت بلکہ میری

تعریف میں دو صفحے کا مضمون لکھ کر بجھتے ہوئے شعلے پھر سے تیز کر دیئے۔ میرے مضمون میں ایک فقرہ یہ بھی تھا "کیا ادیبوں میں کوئی ایسا نہیں رہا جو فیض کو سیاسی اعزاز اور ادبی اعزاز کا فرق بتا سکے۔"

فیض صاحب کو لینن پیس پرائز مل چکا تھا اور 1963ء میں جب میں لندن پہنچا تو وہ ایک مکان خرید کر یہیں بسے ہوئے تھے۔ آتے ہی میرے دوست عباس احمد عباسی مرحوم نے بتایا "تمہارا فقرہ فیض صاحب کو سنا چکا ہوں۔ وہ صرف مسکرا دیئے تھے۔" میرے مزید اصرار پر عباس نے یہ بھی بتایا "فیض صاحب نے یہ ضرور کہا تھا کہ بھائی ——— ی ——— ی یہ سب تو ہوتا ہی رہتا ہے۔"

جنوری 1964ء میں ایک پروگرام کے سلسلے میں بی بی سی پہنچا تو عباس نے بتایا کہ " ہیمپسٹڈ کے اسپینیرڈس ان (ایک پب کا نام) میں شام کو فیض صاحب آئیں گے، پہنچ جانا تاکہ تعارف کروا دوں" میں کڑکڑاتی سردی میں کپکپاتا ہوا پہنچا تو عباس کے ساتھ غالباً تقی سید بھی بیٹھے ہوئے تھے اور بیر چل رہی تھی مگر فیض صاحب وہسکی پی رہے تھے۔ جوں ہی عباس نے مجھے خوش آمدید کہا فیض صاحب اٹھ کر کھڑے ہو گئے اور نہایت گرم جوشی سے گلے ملے۔ آئندہ بیس سال تک ان سے یہاں وہاں ادھر ادھر ملاقاتیں ہوتی رہیں۔ میں نے اپنے طور پر گلے شکوے اختلافات سب کئے مگر ان کی گرم جوشی اور تپاک کبھی نہ بھولا۔ اس دن ان کی بے لوث محبت سے اس قدر مانوس ہوا کہ ڈیڑھ گھنٹے تک کچھ نہیں بولا بس ان کے استفسار پر یہ ضرور بتایا کہ حصول تعلیم اور تلاش معاش کے سلسلے میں آنکلا ہوں۔ ان کے سامنے میری خاموشی کا یہ پہلا اور آخری دن تھا۔

میں ان دنوں گولڈرس گرین کے ایک کمرے میں رہتا تھا۔ کار وار ابھی نہیں خریدی تھی۔ ان کا قیام فنچلے میں تھا۔ ہمارے درمیان کوئی تین میل کا فاصلہ تھا۔ ہفتے میں ایک روز کبھی ٹیوب کبھی بس میں یہ فاصلہ طے کر کے انہیں کسی پب میں لے جاتا۔ ایک دو گھنٹے کا ساتھ رہتا۔ میرے گرم گرم سوالات اور ان کے نرم نرم جوابات کا منظر آنکھوں میں ہے۔ یہ نشستیں مہینوں جاری رہیں۔ انہیں قریب سے دیکھنے اور سمجھنے کا موقع ملا تو میرے بہت سے اندیشے جھاگ کی طرح ---- نہیں ---- انار کلی والے امتیاز علی تاج کی "کل کی گڑیا" کی طرح بیٹھ گئے۔ وہ مجھ سے عمر میں 25 برس بڑے تھے اور بین

الاقوامی شہرت کے مالک، میں ایک نوجوان شاعر جو ابھی اپنے استعارے کی تلاش میں بھٹک رہا تھا۔ انہیں بھی میرے مزاج کا علم ہو گیا۔ شاید اسی لئے انہوں نے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے میری شوخیوں کو طرح دے دی تھی۔ 1983ء اور 1984ء میں بعض 'رازنا آشناؤں' نے فیض صاحب سے شکایت کی کہ دیکھئے ساقی آپ سے اتنی گستاخی کرتے ہیں اور آپ کچھ نہیں کہتے۔ ان کا جواب بھی خوب تھا۔ "ارے بھائی ساقی تو ساقی ہے نا ----" سنا ہے شکایت کرنے والے ---- "Yes Sir" کہہ کر خاموش ہو گئے۔ ان عزیزوں کو یہی نہیں معلوم کہ ادب میں سوال کرنا، بزرگوں سے اختلاف کرنا یا ان کی خامیوں کی نشاندہی کرنا گستاخی یا بے ادبی نہیں۔ بلکہ

Yes Sir, Yes Sir.

Three bags full, Sir

You are great Sir

کہنا بد تہذیبی اور بد تمیزی ہے۔ یہ بات ان بدبختوں کو بتاتے بتاتے زبان سوکھ گئی۔ اب یہ ہے کہ خدا مجھے صبر دے۔

اب جو باتیں یاد آ رہی ہیں ان کی تاریخی ترتیب کی ذمہ داری اپنے حافظے سے اٹھا رہا ہوں۔ وہ باتیں نہیں دہراؤں گا جو اپنے مضمون "حسن کوزہ گر" میں لکھ چکا ہوں مگر اس سلسلے میں فیض صاحب اور ایلس کے ری ایکشن کا حوالہ ضروری ہے۔ ایک بار یہ دونوں زہرا نگاہ اور ماجد علی کے یہاں ٹھہرے ہوئے تھے (پہلے وہ یعنی فیض صاحب اپنے مکان میں رہے، پھر اسے بیچ کر چلے گئے اور جب آتے اپنے اور راشد صاحب کے کالج کے دوست محمد افضل مرحوم کے یہاں قیام کرتے مگر جب سے ماجد علی اور زہرا نگاہ لندن منتقل ہوئے وہ انہی لوگوں کے فلیٹ میں ٹھہرتے کہ جگہ بھی مرکزی تھی اور آرام بھی زیادہ تھا)۔ ماجد علی کے دوست صغیر صاحب نے ہم سب کو کھانے پر بلایا۔ وہیں پاکستان ایمبیسی کے وجاہت صاحب بھی موجود تھے جو اب آزاد کشمیر میں پولیس کمشنر ہیں۔ بڑے مخلص آدمی ہیں۔ میرا بھی بڑا خیال کرتے ہیں۔ کہنے لگے "ساقی صاحب، اقبال کے بعد فیض صاحب کے علاوہ اور کون ہوا ----" قبل اس کے کہ میں کوئی جواب دوں فیض صاحب نے انہیں روکا "ارے بھئی ---- ی ---- ی یہ تو ادھر کے آدمی ہیں نا ----

"ان کا اشارہ راشد صاحب کی طرف تھا۔ میں نے کہا "فیض صاحب یہ آپ نے بڑی زیادتی کی۔ میں ادھر کا بھی ہوں اور ادھر کا بھی اور سب سے بڑھ کر یہ کہ میں اپنا آدمی ہوں" یہ کہہ کر میں نے ان سے وہ حکایت بیان کی جو مجھ تک سلیم احمد کے ذریعے پہنچی تھی۔ اور یوں تھی۔ سرسید احمد خاں جس زمانے میں ہر مسلک کے مسلمانوں کی بقا کے لئے اپنے کالج کے واسطے چندہ جمع کر رہے تھے کسی بدقماش یا بدمعاش نے ان سے سوال کیا "سر، اگر آپ حضرت عمر فاروقؓ کی شہادت کے وقت زندہ ہوتے تو کس کو ووٹ دیتے، حضرت عثمانؓ کو کہ حضرت علیؓ کو۔" اس شرپسندی کا جواب ایسا تھا کہ سرسید کے دماغ کی زود بینی اور بذلہ سنجی دونوں کی داد واجب ہے۔ ان کا فقرہ یہ تھا۔ "اگر میں اس وقت موجود ہوتا تو اپنے لئے کوشش کرتا۔" خوب قہقہہ پڑا۔ مگر ایلس نے مجھ سے کہا (اور یہ ہماری پہلی ملاقات تھی) "ساقی جو باتیں تم نے میرے اور فیض کے سلسلے میں راشد والے مضمون میں لکھی ہیں، میں نے پورا مضمون تو نہیں پڑھا مگر فیض والا اقتباس 'نیا دور' سے چرا کر 'نوائے وقت' نے نہایت تزک و احتشام سے چھاپا تھا' وہ نامناسب ہیں' صحیح نہیں ہیں" میں نے جواباً اپنی گفتگو میں بتایا —— "ایلس آپ میرا Dilemma سمجھنے کی کوشش کریں' راشد صاحب تو یہ باتیں بتا کر چلے گئے' میں مضمون لکھنے بیٹھا تو اپنے آپ سے بہت الجھا' جو باتیں میرے شعور کا حصہ تھیں انہیں جھٹک کر ذہن سے کیسے نکال دوں' نہ لکھوں تو راشد کی ساری شخصیت کا احاطہ کیسے ہو' لکھوں تو آپ کی اور فیض صاحب کی خست سامنے آتی ہے' غرض پاکستان جا کر اعجاز بٹالوی' ضیا جالندھری اور حمید نسیم سے Check کیا' انہیں بھی راشد صاحب نے یہ واقعات بتا رکھے تھے' سو اس حصے کو مضمون سے نکالنا میرے اختیار میں نہ رہا۔" پھر میں نے 1947ء کے بعد کے سب سے اچھے غزل گو ناصر کاظمی کا مصرع پڑھا۔ اے بے گنہی گواہ رہنا ----' ایلس کی تشفی نہیں ہوئی اور میں نے ان سے وعدہ کر لیا کہ "جب بھی آپ کے میاں پر مضمون لکھنے کی نوبت آئی And I owe him an article —— میں آپ کا اعتراض قلم بند کر دوں گا کہ واقعات کے دونوں رخ سامنے آ جائیں۔" فیض صاحب خاموش رہے تھے اس لئے مجھے سخت تعجب ہوا جب 1983ء میں وہ آخری بار لندن آئے اور میں ان سے ملنے زہرا نگاہ کے یہاں پہنچا تو شکوہ سنج ہوئے۔ "ساقی ہمیں بالکل یاد نہیں کہ ہم راشد کو بلا کر بھول گئے یا

انہیں اپنے یہاں مدعو کر کے دوسروں کے یہاں لئے لئے پھرے؟" میں اپنے صوفے سے
اٹھ کر ان کے پاس جا بیٹھا' ان کا داہنا ہاتھ اپنے دونوں ہاتھوں میں بھینچ لیا تاکہ یہ
Great old man میرے خلوص کی گرمی کو محسوس کر سکے۔ میں نے کہا "جواب بعد
میں' پہلے یہ بتایئے کہ نو دس سال بعد یہ بات ایک دم سے آپ کو کیسے یاد آگئی" کہنے لگے
"ہم نے تمہارا راشد والا مضمون ہی نہیں پڑھا تھا' رات اس کی جستہ جستہ باتیں ظفر
الحسن کی کتاب میں دیکھیں تو اس کا ذکر کر رہے ہیں۔" زہرا نگاہ کی آنکھوں میں شریر
چمک دیکھ کر اندازہ ہوا کہ میری اس عزیز بہن نے رات یہ کتاب فیض صاحب کے
حوالے کر کے مجھے کھانے پر اس لئے بلایا ہے کہ میری بے کسی کا تماشا دیکھ سکیں۔ میرے
پاس کوئی نیا جواب تو تھا نہیں۔ وہی باتیں دہرا دیں جو پان سات سال پہلے ایلس کے اور
ان کے سامنے کی تھیں جنہیں یہ بالکل بھول چکے تھے۔ ان کا آخری جملہ لکھ کر اس قصے
سے درگزر کرتا ہوں۔ "چلو دعوت دے کر ہم تو بھول سکتے تھے مگر یہ کیسے ممکن ہے کہ
ایلس بھی بھول گئی ہوں۔"

اس بھولنے پر ایک اور قصہ یاد آیا کہ بھولتا نہیں۔ لندن میں سات آٹھ سال پہلے
تک غیر ادبی غل غپاڑے نہیں ہوتے تھے۔ اردو پڑھنے لکھنے والوں میں ایک غیر مرئی
سکون تھا —— Main Stream کے لوگوں میں بنے بھائی بہت پہلے رہ کر جا چکے تھے
اور اب صرف گاہے گاہے اپنی بیٹی نجمہ اور داماد علی باقر سے ملنے آ نکلتے۔ جب بھی آتے
بلوا لیتے۔ میں حسب مزاج اور ان کی توقع کے مطابق ان سے خوب نوک جھونک کرتا۔
وہ نہایت صبر سے میرے جوش کی آگ پر اپنے عالمانہ استدلال سے پانی چھڑکتے۔ اپنی
جوانی کو یاد کرتے اپنی یورپی محبوباؤں کے قصے سناتے۔ علی باقر مسکراتے اور نجمہ کہتی
جاتیں کہ "ابا کے یہ سب باتیں امی کو ضرور بتاؤں گی۔" غرض کہ ہم ایک دوسرے کو
اپنے Points of View سے آگاہ کرتے مگر قائل کوئی نہ ہوتا۔ ایک بار رضیہ آپا آئیں
اور اپنے میاں کے دفاع میں (جیسے میاں کو کسی دفاع کی ضرورت ہو' آخر کو ہندوستانی
چہیتی بیوی تھیں نا) میری ایسی خبر لی کہ مجھے خاموش ہو جانا پڑا۔ بنے بھائی نے کہا "اس
لڑکے (میں 35' 36 سے کم کا نہ تھا) کی جان کے پیچھے کیوں پڑ گئی ہو۔" پھر دونوں نے مجھے
گلے لگا کر رخصت کیا۔ بعد میں علی باقر اور نجمہ نے بتایا کہ میرے جاتے ہی "امی اور ابا"

بنے میری شاعری اور شخصیت کی دل کھول کر تعریف کی۔ دروغ برگردن اولاد مگر اس زمانے میں پیٹھ پیچھے تعریف کرنے کا رواج تھا۔ غرض میرے اور بنے بھائی کے گھرانے کے درمیان ایک ایسی اٹوٹ محبت قائم ہو گئی جو مرتے دم تک جاری رہے گی۔ میں باہر سے اپی تلوار کی طرح سخت سہی مگر اندر سے بریشم کی طرح نرم بھی ہوں۔ شاید۔ اور "شاید" میں کیا مضائقہ ہے۔

بنے بھائی کے انتقال کے بعد میں دلی پہنچا تو رضیہ آپا نے کھانے پر بلایا۔ میرے یار غار اور جدید ادب کے ذہین نقاد محمود ہاشمی اپنی موٹر سائیکل پر بٹھا کے مجھے ان کے یہاں چھوڑ آئے۔ رضیہ آپا گلے لگا اس طرح ڈہک ڈہک کر روئیں کہ میرا کلیجہ چھلنی ہو گیا۔ میں دو تین گھنٹے بیٹھ کر چلنے لگا کہ دوسرے دن لاہور پہنچنا تھا۔ انہیں تاکید کر دی کہ اپنے بکھرے ہوئے افسانوں کا مجموعہ مرتب کر کے مجھے بھیج دیں تاکہ پاکستان میں کہیں چھپوا دوں۔ انہوں نے شرط لگائی کہ دیباچہ میں لکھوں۔ میں نے کہا اس سے بڑا اعزاز کیا ہو گا۔ دو تین مہینے بعد نجمہ آئیں تو مسودہ لیتی آئیں۔ اس کے ساتھ رضیہ آپا کی چھٹی بھی تھی۔ اس میں وہی تاکید کی کہ دیباچہ میں ہی لکھوں۔ ایک زمانے میں کئی افسانے میں نے لکھے تھے اور سیکڑوں کہانیاں پڑھی تھیں۔ فکشن کی تنقید پر بھی اچھی نظر تھی مگر برسوں سے شاعری کو اوڑھنا بچھونا بنا رکھا تھا اس لئے اس دیباچے کے لئے مواد جمع کر رہا تھا کہ کوئی بات نکال سکوں کہ فیض صاحب لندن آئے۔ رضیہ آپا کی کتاب اور اپنے دیباچے کا ذکر ان سے اس لئے کیا کہ وہ کسی بھلے پبلشر سے چھپوا دیں۔ کہنے لگے "بھئی ——— ی ——— ی رضیہ کی کتاب کا دیباچہ تو ہم بھی لکھ سکتے ہیں نا۔" میں نے کہا "مگر انہوں نے تاکید کی ہے کہ میں لکھوں" بولے "تو تم بھی لکھ دو، ہم بھی لکھ دیں گے۔" میری کہاں مجال کہ ان کے دیباچے کے ساتھ اپنا دیباچہ بھی چھپواتا۔ مسودہ انہیں دے آیا۔ غضب یہ ہوا کہ وہ کہیں رکھ کر بھول گئے۔ میں نے رضیہ آپا کو سارا ماجرا لکھ کر بھیج دیا۔ انہوں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ ان کے انتقال سے پہلے دلی میں ان سے ملنے گیا تو بہت بیمار تھیں۔ چلنے لگا تو انہوں نے میرے دونوں بازوؤں پر امام ضامن باندھے اور صرف اتنا کہا "اگر فیض سے دیباچہ لکھوانا ہوتا تو میں مسودہ انہیں بھجواتی۔" میں نے کہا "آپ مجھے جی بھر کے ذلیل کر لیں۔ آپ کو اپنی شرمندگی کی داستان کیا سناؤں۔ بس مجھے صدق دل سے

ایک بار معاف کر دیجئے اور مجموعہ دوبارہ مرتب کر کے بھیج دیجئے' آنکھوں سے لگا کر رکھوں گا۔" انہوں نے اپنی موہنی مسکراہٹ کے ساتھ وعدہ کر لیا۔ میں مطمئن ہو کر چلنے لگا تو نجمہ اور علی باقر کے سامنے کہنے لگیں "اور ہاں دیباچے میں جدیدیوں کی خوب خبر لینا۔" میں نے کہا "رضیہ آپا جدید تو میں بھی ہوں۔ اپنی خبر کیسے لوں گا" بولیں "تو' دوسرے قسم کا جدید ہے' میں تو جدیدیوں کا ذکر کر رہی ہوں" میں لندن چلا آیا۔ تین چار ماہ بعد رضیہ آپا کا انتقال ہو گیا۔ دل کٹ کے رہ گیا۔ پھر Guilt کا احساس کچھ کم قاتل نہ تھا۔ اس کے بعد بیسیوں بار فیض صاحب سے ملاقات ہوئی۔ ہر بار اس مسودے کا ذکر کیا۔ انہیں اتنا تو یاد پڑتا تھا کہ افضل صاحب کے مکان میں انہوں نے کہیں رکھا تھا۔ اس کے بعد ان کا حافظہ ورطۂ انکار میں چلا جاتا۔ ہمیشہ میرے ساتھ ساتھ اداس ہو جاتے "دیکھو سوچتے ہیں" ضرور کہتے۔ پچھلے برس علی باقر ملنے آئے تو انہوں نے بتایا کہ رضیہ آپا کی کہانیوں کے مجموعے چھاپ رہے ہیں' ساری کہانیاں جمع کر لی ہیں سو اب اس باب میں طبیعت کو کچھ سکون ہے۔ فیض صاحب کی یادوں کے چراغ کے پاس رضیہ آپا کے امام ضامن بھی دل کے طاق میں رکھے ہوئے ہیں کہ ان خیراتوں کا مستحق مجھ سے زیادہ اور کون ہو گا۔

فیض صاحب سے تنہائی میں جو باتیں ہوئیں وہ خاصی ذاتی قسم کی تھیں ان میں سے دو ایک باتوں سے پردہ اٹھائے دیتا ہوں۔ وہ بھی اس لئے کہ ان سے فیض صاحب کی شخصیت کو سمجھنے میں آسانی ہو۔ ایک بار ایک نئے شاعر نے (جو پرانی زبان اور کلاسیکی استعارے میں درک رکھتے ہیں اور جن کی ملکیس میر انیس اور میرزا دبیر کے دریچے میں گڑی ہوئی ہیں) فرمائش کی کہ فیض صاحب کو ان کے ہاں لیتا آؤں۔ میں افضل صاحب کے گھر پہنچا تو ٹیلی ویژن پر فٹ بال کے ورلڈ کپ کا کوئی میچ دیکھ رہے تھے۔ تیار ملے۔ میں کار میں انہیں لے کر چلا۔ راستے میں Spaniard's Inn (ہمارا پرانا پب) پڑتا تھا۔ میں نے کہا "چلئے پرانی صحبتوں کی یاد تازہ کی جائے" کہنے لگے "کیوں نہیں" اصل میں میرا دل اپنی نظمیں سنانے کے لئے مضطرب تھا۔ وہ بیٹھ گئے میں جا کر شراب لے آیا۔ اور اپنی دو نظمیں "شیر امداد علی کا میڈک" اور "رات کے راج ہنس اور ہات" سنائیں۔ دھیمے سروں میں تعریف کی۔ اس طرح داد نہیں دی جیسی 'میڈک' والی نظم پر راشد

صاحب نے دی تھی۔ شاید جوش آفرینی ان کے مزاج میں نہیں تھی۔ پھر کہنے لگے "ان سب نظموں کی رسائی ہو گی، ہو گی کیوں نہیں، تمہاری بھی ہو گی، راشد کی بھی ہو گی، ذرا دیر لگے گی" میں نے کہا "آپ مجھے راشد صاحب سے کیوں بھڑا رہے ہیں، ان کی تو رسائی بھی ہو چکی ان کا Impact بھی شدید ہے نئے لوگوں پر، میرا جی کا بھی ہے۔" میں اس موقع کو ہاتھ سے نہیں جانے دینا چاہتا تھا۔ اس لئے ذرا ٹھہر کر پوچھا "فیض صاحب، ویسے راشد کے بارے میں آپ کی اصلی رائے کیا ہے۔" انہوں نے سگریٹ سے سگریٹ سلگائی اور گویا ہوئے "سچی بات تو یہ ہے کہ اس کا دماغ مجھ سے بڑا تھا۔" اس فقرے کے بعد اس دریا دل شاعر نے اپنے ہم عصر دوست کے بارے میں وہ باتیں بھی کیں جو "یہ صورت گر کچھ خوابوں کے" والے انٹرویو میں ہیں۔ مگر اس فقرے میں جو ہشت پہلو اعتراف چھپا ہوا ہے اس سے میرے دل میں فیض صاحب کا وقار بڑھ گیا۔ راشد صاحب نے اس طرح انہیں کبھی داد نہیں دی تھی۔ وہ دوسرے قسم کے آدمی تھے۔

اسی طرح انہیں ایک بار کسی محفل سے گھر واپس لے جا رہا تھا۔ ہمپسٹڈ کے ایک سنسان اور اندھیرے راستے میں گاڑی روک دی۔ رات کے دو بجے تھے اور سڑک کے دونوں طرف ہیبت ناک درختوں کی شاخیں اپنے پتوں کے دف بجا رہی تھیں۔ کہنے لگے "اتنی ڈراؤنی جگہ پر کار کیوں روک دی۔" میں نے کہا "تاکہ خوف سے گھبرا کر آپ جلدی جلدی ان تمام خواتین کا نام بتا دیں جو آپ کے شعروں کے حجاب میں ہیں اور جن کا ذکر آپ کسی سے نہیں کرتے۔ آخر میری ہی نسل کے لوگ تو آپ کا نام آگے لے جائیں گے نا۔ اور آنے والوں کو بتائیں گے کہ راشد ایسے تھے، آپ ایسے تھے۔" بولے "بتاتے ہیں بھئی ——— ی ——— ی بتاتے ہیں مگر گاڑی تو چلاؤ۔" میں نے انجن اسٹارٹ کیا اور پوچھا "یہ رقیب والی نظم کے پیچھے کون تھا؟"

"وہ ہمارے کالج کے زمانے کا ایک فلیم (Flame) تھا بھئی تم انہیں انہیں جانتے۔ یہ ہمارا پہلا عشق اور پہلی شکست تھی۔"

"اور رقیب کون صاحب تھے؟"

"انہیں بھی تم نہیں جانتے، ایک کاروباری آدمی ہیں۔"

"تو معاملہ کچھ آگے بڑھا کہ نہیں ----؟"

"نہیں"

"اور د ——— ر ——— ج' سے؟"

"ہم ان سے بہت ڈرتے تھے۔ عشق کا سوال ہی نہ اٹھا۔"

"اور ب ——— م ——— م' سے؟ سنا ہے کہ آپ دونوں کئی بار ایک ہی کمرے میں سوئے بھی؟"

"تو سونے سے کیا ہوتا ہے' بھئی بعض لوگوں پر نظر کا حق ہوتا ہے بعض پر دل کا' وہ حق تو ہم ادا کرتے رہے۔"

"بدن کے بھی تو کچھ حقوق ہوتے ہیں؟"

"تم یورپ میں آکر بس گئے ہو اور بھول گئے ہو کہ ہر عشق کے لئے ضروری نہیں کہ آدمی بستر بھی ساتھ ساتھ لے کر چلے' دوستیاں رہیں کئی خواتین سے اور خوب رہیں اور بس۔"

"یہ جو بھری محفلوں میں آپ خوبصورت خوبصورت لڑکیوں کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لئے بیٹھے رہتے ہیں یا ان کے شانوں اور گردنوں کو سہلاتے رہتے ہیں۔ یہ سب دیکھ کر میری روح پر خلجان طاری ہوتا رہتا ہے۔ ایک تو یہ کہ ان میں سے دو چار میرے حوالے کر دیجئے۔ دوسرے یہ کہ کیا آپ کا دل نہیں دھڑکتا؟"

"بھئی دھڑکتا ہے جبھی تو دل کا اور نظر کا حق ادا کرتے رہتے ہیں نا؟"

غرض کہ میں فلانے کا اور فلانے کا ذکر کرتا گیا مگر موصوف فقط "دل کا حق" اور "نظر کا حق" کی رٹ لگاتے رہے۔ ایسے شرمیلے تھے کہ یہ باتیں کرتے وقت بھی چہرے پر طرح طرح کے رنگ آتے جاتے رہے۔ یہ سوچ سوچ کر رشک آتا ہے کہ میں تو اپنے جہنم زار میں جل رہا ہوں اور وہ کم سن حوروں کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لئے' نظر اور دل کا حق ادا کر رہے ہوں گے۔

ایک محفل میں ایک چھوٹا موٹا ہنگامہ ہو گیا۔ اس کا سرسری ذکر میں اپنے مقالے "نظم کا سفر" میں کر چکا ہوں۔ پورا واقعہ یوں تھا۔ مغنی تبسم کی بہن اور بہنوئی نے اپنے فلیٹ میں ایک محفل برپا کی۔ تقریباً 5- مہمان تھے۔ ہم سب چھٹ بھئیے (میں' احمد فراز' شہرت بخاری وغیرہ) اپنا اپنا کلام سنا چکے تو فیض صاحب کی باری آئی۔ انہوں نے اپنی کچھ

نئی چیزیں سنائیں۔ ابھی داد کے ڈونگرے برس ہی رہے تھے کہ میں نے فرمائش کی۔ "فیض صاحب آج پھر اپنی وہ معرکہ آرا نظم "رقیب سے" سنایئے۔" انہوں نے اپنے سج سج انداز میں نظم شروع کی۔ ایک ایک مصرعے پر تحسین کا طوفان اٹھتا رہا۔ سب سے زیادہ زور شور سے میں داد دے رہا تھا کہ نظم کا بیسواں مصرع "جز ترے اور کو سمجھاؤں تو سمجھا نہ سکوں" آن پہنچا میں نے کہا "بس، نظم یہیں ختم ہو جاتی ہے، آگے مت سنایئے۔" ایسے ولدار آدمی تھے کہ مان گئے۔ پھر احمد فراز نے کہا، محمد علی صدیقی نے کہا، شہرت بخاری نے کہا۔ ہندوستان کے مشہور مصور حسین صاحب نے کہا مگر فیض صاحب بولے "نہیں بھئی جب ساقی نہیں سننا چاہتا تو ہم کچھ اور سنائیں گے۔" اور انہوں نے پبلک کے بے حد اصرار کے باوجود نظم نہیں سنائی۔ شہرت جیسے بھل مانس کم کم پیدا ہوتے ہیں۔ انہوں نے میرے کان میں کہا "اب تم کہو۔" میں نے تو من کی موج (Impulse) میں آ کر ایک بات کہہ دی تھی۔ شاید ذہن کے کسی گوشے میں یہ بھی ہو کہ آس پاس بیٹھے ہوئے بڑے بڑے شاعروں کو بتایا جائے کہ نظم کیسے شروع کرنی چاہئے اور کہاں ختم کرنی چاہئے۔ پھر اس سے زیادہ مہلک بات فیض صاحب سے اور راشد صاحب سے اور سجاد ظہیر صاحب سے اور سردار جعفری صاحب سے کر چکا ہوں۔ کہنے کے بغیر۔ اور نیت کی صفائی کے ساتھ۔ یہ کشادہ قلب بزرگ تھے اور ہیں۔ ان کے دلوں میں میری طرف سے کبھی رنجش پیدا نہیں ہوئی۔ فیض صاحب جب بھی آتے زہرا نگاہ سے فون کروا کے مجھے ضرور بلواتے۔ میں ان سے ضرور چھیڑ چھاڑ کرتا۔ وغیرہ وغیرہ۔ خیر۔

اب مجھے اپنے الفاظ تو یاد نہیں مگر شہرت کے کہنے پر میں نے فوراً کہا تھا "غریبوں کی حمایت اور مزدور کے گوشت کا تقاضا تھا کہ آپ ایک الگ نظم کہتے، اور آپ نے کئی عمدہ عمدہ نظمیں ان مسائل پر کہی ہیں، اس نظم میں آخری 12 مصرعے پیوند لگتے ہیں۔ اس لئے میں نے گستاخی کی تھی۔ اب یہ ہے کہ آپ پوری نظم سنایئے۔ میری بات کا برا نہ مانئے۔" مگر وہ بہانہ کر کے ٹال گئے۔ دوسرے دن محمد علی صدیقی نے مجھے بتایا تھا کہ اردو کے ایک ادارے میں سارے عندلیب بیٹھے آہ و زاریاں کر رہے تھے۔ میں نے اپنے طور پر اس بات سے طمانیت حاصل کی کہ تمام عندلیبوں کو کام پر لگا رکھا ہے۔

زہرا نگاہ کے یہاں آئے دن نشستیں ہوتی رہتی ہیں۔ اور کمال کی مگر جب جب

فیض صاحب ان کے یہاں ٹھہرنے آتے' گھر کی بہار اور محفلوں کی رونق بڑھ جاتی۔ اور میرے پھیرے بھی۔ ان پھیروں میں ان سے سیکڑوں باتیں ہوئیں۔ اور ساری باتیں زہرا نگاہ اور ماجد علی کے سامنے ہوئیں۔ یہاں صرف ان چیزوں کا ذکر کروں گا جن سے فیض صاحب کی شاعری یا شخصیت کو سمجھنے میں کسی نہ کسی قسم کی مدد مل سکے۔

ایک اتوار کی صبح کو پہنچا تو دیکھا ایک جوڑا فیض صاحب سے ہاتھ ملا کر رخصت ہو رہا ہے۔ میں زہرا نگاہ کے ساتھ دوسرے کمرے میں چلا گیا۔ انہوں نے بتایا کہ ہفتے بھر سے طرح طرح کے لوگ فیض صاحب سے ملنے چلے آ رہے ہیں۔ اور یہ کہ "آج والے لوگ" بسکٹ بناتے ہیں اور فیض صاحب کے لئے بسکٹوں کے کئی ٹن لائے ہیں۔ اور فیض صاحب کے ساتھ گھنٹے بھر بیٹھ کے گئے ہیں۔ اتنے میں فیض صاحب "تو ہاں بھئی ---- یہ کہاں غائب رہے" کہتے ہوئے کمرے میں داخل ہوئے۔ میں نے کہا۔ "ابھی بتاتا ہوں مگر پہلے آپ یہ بتایئے کہ ایرے غیرے چپڑ قناتیوں کے ساتھ آپ اپنا وقت کیوں ضائع کرتے ہیں؟"

"بھئی اتنی محبت سے یہ لوگ فون کرتے ہیں اور آتے ہیں۔ ہم ان کا دل کیسے دکھائیں۔"

"لیجئے فیض صاحب' آپ بھی کمال کرتے ہیں' دل ہوتا کس لئے ہے' دکھانے ہی کے لئے تو ہوتا ہے ---" میں نے ذرا دل لگی کی۔ "پھر یہ کہ آپ فرصت کا رونا روتے ہیں۔ اصل میں آپ نے اپنے آپ کو بہت پھیلا رکھا ہے۔ لکھنے پڑھنے کا وقت آپ کے پاس رہا نہیں۔ پچھلے دس پندرہ سال میں جو غزلیں نظمیں آپ نے لکھی ہیں وہ آپ کے معیار کی نہیں۔ آپ سے توقعات کچھ اور ہیں۔ یہ سچ ہے کہ آپ نے جو 'طرز سخن' ایجاد کی تھی وہی گلشن میں "طرز فغاں" ٹھہری ہے۔ مگر آپ وقت کی کمی کے باعث اپنی سطح سے بہت نیچے اتر گئے ہیں۔ پھر آپ کی گفتگو اور آپ کی تحریر سے پتا چلتا ہے کہ کم از کم 20 سال سے آپ نے کوئی نئی کتاب نہیں پڑھی۔ یہ اردو ادب کے ساتھ بڑی زیادتی ہے۔"

یہ مضمون لکھتے وقت سوچ رہا ہوں کہ شاید یہ باتیں سخت تھیں۔ اور لہجے میں بھی' ڈپلومیسی نہیں تھی۔ مگر جس آدمی سے دل کی دھڑکن کی طرح قربت محسوس ہو اس کے

ساتھ ڈپلومیسی کا سوانگ رچانا صرف غیر مہذب لوگوں کا کام ہے۔ اور دوغلا پن میرے احاطہ اختیار میں نہیں۔ ادھر کے لوگوں میں میر تقی میر، حسرت موہانی اور یاس یگانہ چنگیزی ایسوں اور ادھر کے لوگوں میں بیت ہوفن، ازراپونڈ اور ڈی ایچ لارنس جیسوں سے اپنے مزاج کو ہم آہنگ پاتا ہوں۔ دل دکھانے کا سب سے بڑا نقصان یہ ہے کہ خود اپنا دل بھی دکھتا ہے۔ اور حساس آدمی کا شاید کچھ زیادہ ہی۔ سو یہ درد تو سائے کی طرح زندگی کے ساتھ ساتھ ہے۔

ماجد علی اور زہرا نگاہ نے میرے جملوں کا کھردرا پن "چین جبیں" سے کم کرنے کی کوشش کی۔ مگر فیض صاحب کی "نازنینی" عجیب تھی۔ اپنے گرم تبسم سے اور اپنے نرم لہجے میں کہا تو صرف یہ کہا "بھئی ——— ی ——— ی فرصت ہی نہیں ملتی نا۔ اب پڑھیں تو کیسے پڑھیں۔ پھر ہم نے اپنا بہتر کام تو ختم کر دیا نا۔ اسی سے ہمیں جانچو، یہ نئی چیزیں اگر معیار سے ذرا گر گئی ہیں تو ہم کیا کریں، شاعر کو اس کے بہتر کلام ہی سے پرکھا جاتا ہے۔"

ایک شام میں ماجد علی کے ہاں گیا تو دیکھا کہ احمد فراز پہلے ہی سے پہنچے ہوئے ہیں۔ بہترین وسکی اور بہترین انواع و اقسام کے کھانے کے لئے زہرا نگاہ کا گھر چار دانگ میں مشہور ہے مگر مجھے یہ امید نہیں تھی کہ فقرے بازی کے لئے اللہ ٹارگٹ ——— (Target) بھی مہیا کر دے گا۔ فراز کو دیکھ کر آنکھوں کی چمک تیز ہو گئی۔ مالک حقیقی کے تحائف کو ٹھکرانا کفران نعمت ہے، اس لئے ادھر ادھر کی گفتگو کے بعد جب احمد فراز نے فیض صاحب سے پوچھا "آپ نے میری نظموں کے ترجمے دیکھ ڈالے؟" فیض صاحب نے جواب دیا "ادھر ادھر سے نظر ڈالی ہے، رومانی نظمیں بہتر ہو گئی ہیں مگر ----" میں نے بات پکڑ لی اور کہا "یونان کے ایک گم نام شاعر تھے۔ 1979ء میں انہیں نوبل پرائز مل گیا۔ اب اتنے گم نام نہیں رہے۔ ان کا نام ہے ALEPOUDHELIS (ELYTIS) جب ترجمہ باز پہنچے تو انہوں نے بڑی عمدہ بات کی اور بیان دیا کہ ان کی قدر و قیمت کا اندازہ ترجموں سے نہ لگایا جائے کہ ترجمے میں اچھے شاعروں کی سبکی ہوتی ہے اور برے شاعر بہتر ہو جاتے ہیں۔ اب اس بیچارے فراز کو لیجئے۔ ادھر آپ نے لاہور میں ایک بار "مقتل" لکھا۔ ادھر اس نے پشاور سے 30 "مقتل" بھیجے۔ ادھر آپ نے ایک "جاناں" لکھا۔ ادھر

اس نے "جاناں جاناں" کا ورد شروع کر دیا۔ ادھر آپ نے ایک "صلیب" اٹھائی۔ یہ برادر پورا درخت کاٹ کر چل نکلا۔ نہ صرف یہ بلکہ اب آپ ہی کی طرح اٹک اٹک کر مشاعروں میں شعر بھی پڑھنے لگا ہے۔ آپ ہی کی طرح سگریٹ پیتا ہے بلکہ راکھ بھی آپ ہی کے انداز میں جھاڑتا ہے ---- " فیض صاحب کہنے لگے "بھئی تم اپنا کام کئے جاؤ۔ انہیں اپنا کام کرنے دو۔" میں نے کہا "آپ کو تو لطف آتا ہے کہ لوگ آپ کی نقل کر رہے ہیں۔ بلکہ آپ ان لوگوں کی پرورش بھی کرتے ہیں۔ حالانکہ آپ کو اچھی طرح معلوم ہے کہ کسی زندہ اور بزرگ ہم عصر کی نقل کرنا اپنی موت کو دستک دینے کے مترادف ہے۔" ان کا وہی نرم جواب "بھئی سب آدمی تو زندہ نہیں رہتے نا۔ سب کو اپنا اپنا کام کرنے دو۔" میں نے زچ ہو کر کہا "جس طرح میر کا نام غالب سے غالب کا نام اقبال سے اقبال کا نام آپ سے اور راشد سے اور میرا جی سے چلا کہ آپ لوگ مختلف تھے۔ (آپ اقبال کی طرح لکھتے تو آپ کا نام کون لیتا)۔ اسی طرح آپ کا نام ناصر کاظمی، منیر نیازی جیسے لوگوں سے تو آگے بڑھے گا کہ یہ آپ سے مختلف انداز میں چلے، ان سے نہیں جنہوں نے آپ کے لفظ پر لفظ لکھا اور مکھی پر مکھی ماری۔" مگر واہ رے فیض صاحب۔ اپنے مسلک سے ٹس سے مس نہ ہوئے۔ واقعی دل آزاری ان کے مزاج میں نہیں تھی۔ آخر آخر میں بھی صرف یہی کہا "ہاں ہاں تو وہ ٹھیک ہے مگر یہ بھی غلط نہیں۔" یہ ادا ان کے مزاج کی سب سے بڑی خوبی سمجھی جاتی ہے لیکن میں اپنے آپ کو ان کی شخصیت کے اس پہلو سے کبھی متفق نہ کر سکا۔

اس پورے عرصے میں احمد فراز ہوں۔ ہاں، کے علاوہ کچھ نہیں بولے اس لئے کہ دوسرے دن انہیں میرے غیاب میں زہر اگلنا تھا۔ کھانا وانا کھا کے میں چلنے لگا تو وسکی بہت چڑھ چکی تھی اس لئے جب زہرا نگاہ نے کہا کہ میں فراز کو چھوڑتا جاؤں تو میں نے نشے کا حوالہ دیے بغیر بہانہ کیا "بہن، میں انہیں اپنی گاڑی میں نہیں بٹھا سکتا کہ جوں ہی کوئی خراب شاعر بیٹھتا ہے گاڑی کا ایک پہیہ جلنے لگتا ہے۔" یہ کہہ کر چلا گیا۔ دوسرے دن ملنے پہنچا تو فیض صاحب نے کہا۔ "تمہارے بیٹھنے سے تمہاری گاڑی کے دو پہیئے تو مستقل جلتے ہوں گے۔" میں ان سے لپٹ گیا۔

ایک چٹکلہ یاد آیا۔ اپنی زبان اور دوسروں کی طبیعت صاف کرنے کے لئے کراچی

کے زمانے میں دوچار شریر شعر کہہ کر سینہ بہ سینہ چلوا دیے تھے مثلاً:

دونوں "مفاعلاتن" اک دوسرے کے والد
سید رفیق خاور، عبدالعزیز خالد

(لطیفہ یہ کہ یہ شعر پچھلے سال حبیب جالب نے میری اور شہریار اور زہرا نگاہ کی موجودگی میں، اپنا کہہ کر سنایا۔ میری یاددہانی پر انہوں نے اپنی تصحیح کر لی۔ خیر حافظے کی لڑکھڑاہٹ ہم سب سے ہو جاتی ہے۔ پھر شعر ایسا ہے کہ ہر آدمی کو اپنا معلوم ہوتا ہے)

اور دوسرا شعر (جو فیض صاحب کے شعر میں صرف تین الفاظ بدل کر ترتیب دیا تھا) تو خوب چلا بلکہ حق تو یہ ہے کہ قیوم نظر کی شاعری سے زیادہ چلا۔ یوں ہے:

وہ تو وہ ہے تمہیں ہو جائے گی "نفرت" مجھ سے
اک نظر تم مرا "قیوم نظر" تو دیکھو

(سید ابوالخیر کشفی نے "افکار" کے فیض نمبر میں اسے لاہوری شعر کہہ کر پیش کیا تھا۔ ان کی اطلاع کے لئے عرض ہے کہ یہ خالص کراچوی ہے اور اس بندۂ عاجز کا ہے)

خالد صاحب سے کراچی میں اور قیوم صاحب سے لندن میں یہ کہہ کر معافی مانگ لی تھی کہ یہ اشعار برائے بیت ہیں اور تفنن طبع کے لئے کہے گئے تھے اور ان سے دل آزاری مقصود نہیں تھی۔ اور ان دونوں نے میرے خیال میں مجھے معاف بھی کر دیا مگر ایک دن بیٹھے بٹھائے فیض صاحب نے کہا کہ "تمہارا قیوم نظر والا شعر بڑھیا ہے مگر لوگوں کے دل دکھانے سے آدمی کو پرہیز کرنا چاہئے۔ مذاق میں بھی نہیں۔" میں کیا کہتا۔

میں پلٹ کر دو عشروں کی طرف دیکھتا ہوں تو فیض صاحب کی غیر معمولی فرشتہ صفتی پر صرف ایک داغ نظر آتا ہے۔ وہی تعلقات عامہ والا۔ اس کے کئی مناظر میری گنہ گار آنکھوں نے دیکھے۔ ان کا انداز اتنا دقیقہ سنج یعنی Subtle ہوتا تھا کہ دل عش عش کہہ اٹھتا تھا۔ کلیدی صحافیوں سے بنائے رکھنا، بعض احمقوں کو بار بار خط لکھنا، ایک ہی طرح کی دیباچہ بازی کرنا، وغیرہ وغیرہ۔ یہ سیاسی رویے کی کرشمہ سازیاں تھیں۔ اب سوچتا ہوں کہ ایسے سجیلے شاعر پر تو سات خون معاف تھے۔ وہ شاعر تھے اور شاعر رہیں گے۔ نہ انہوں نے پیغمبری کا دعویٰ کیا نہ وہ پیغمبر تھے۔

12 ستمبر 1983ء کی تاریخ دل پر نقش ہے۔ وہ میرے یہاں کھانے پر مدعو تھے۔ حکم

دیا کہ میں انہیں اپنے گھر کا ایک ایک کمرہ دکھاؤں۔ میں نے یہ کام اپنے بیوی (گن ہاؤ جنہیں میں خباثت اور میرے تمام احباب پیار سے گنڈی کہتے ہیں) کے حوالے کر دیا۔ نیچے اوپر ہر جگہ گئے۔ گنڈی کے سلیقے کی کھل کر تعریف کرتے گئے۔ گنڈی پر بوسے نچھاور کرتے رہے اور "دل کا حق" اور "نظر کا حق" ادا کرتے رہے۔ شاید گنڈی اس سارے عرصے' میرے مزاج کے برے پہلو "جلالیت" کی شکایت کرتی رہیں۔ آکر صوفے پر بیٹھے تو مجھے بہت ڈانٹا پھٹکارا اور بڑی لعن طعن کی۔ میری عمر پوچھی۔ بتایا تو کہنے لگے اب وقت آگیا ہے کہ تمام اول فول چیزوں سے پرہیز کروں اور بس جم کر صرف شاعری کروں اور گالی گلوچ تو قطعی طور پر بند کروں اور بخشش عام کروں۔ اور بیوی کی فرمائش پر "فیض اکیڈمی" کا کاغذ لیا اور "بادوستاں تلطف بادشمناں مدار" لکھ کر چلے گئے۔

فیض صاحب' اگر جوش گفتگو میں گاہے گاہے مجھ سے زیادتیاں ہو گئی ہوں تو مجھے معاف کر دیجئے۔ میں نے آپ سے اتنی ہی محبت کی جتنی دوسروں نے کی۔ مگر میں "اپنا آدمی" بھی ہوں۔ اور آج آپ سے آخری فرمائش کرنے آیا ہوں۔ ذرا "نسیم صبح چمن" سے کہہ دیجئے کہ میرے گھر میں' جہاں آپ کے سانسوں کی خوشبو بسی ہوئی ہے وہاں "یادوں سے معطر" تو آئے مگر "اشکوں سے منور" نہ جائے۔

لندن

15 اکتوبر 1986ء

ایک ندیم کی مدافعت میں

قاسمی صاحب پر بہت کچھ لکھا جا چکا ہے۔ اچھا کم اور برا زیادہ۔ ان کے اندر کے شاعر اور افسانہ نگار سے ان کے باہر والے صحافی نے بھی انصاف نہیں کیا اور "الحمدللہ" جیسی معرکہ آرا کئی کہانیاں اور "روح لبوں تک آ کر سوچے" جیسی کئی خوبصورت نظمیں اور

بجھ گئی ہیں مری آنکھیں مگر اے شام فراق
یہ دیے ان کے خیالوں میں تو جلتے ہوں گے

جیسے بچاسوں دل میں اتر جانے والے اشعار پارٹی بازی اور پبلک ریلیشنگ کے شور شرابے اور پبلسٹی کے غبار میں بھلا دیئے گئے ہیں۔ Space-ship-earth کی ترکیب تو اب عام ہوئی ہے مگر بہت پہلے "خلا کی رقاصہ" کہنے والے کے ساتھ منصفی ضروری ہے۔ ایک طرف ترقی پسندوں کے "گل محمد" سردار جعفری جیسے منجمد نظریات داں ہیں جو اپنے کرم خوردہ اکھرے پن کے بچاؤ کے لئے قاسمی صاحب کی مذہبیت اور پاکستانیت پر گاہے گاہے شاید اس لئے حملہ آور ہوتے ہیں کہ لوگوں کی نظر خود ان کی نہایت بیزار کن' بونی اور یکسانیت پسند شاعری پر نہ پڑے اور اس لئے بھی کہ ان کے پیارے پیارے بیٹے اطمینان اور فراغت سے امریکہ میں تعلیم و تربیت حاصل کرتے رہیں (ان سب باتوں پر سردار جعفری صاحب سے میرے کئی مجادلے ہوئے ہیں اور تعلقات اب تک استوار ہیں بلکہ یہ کہنا ناجائز نہ ہو گا کہ ہم ایک دوسرے سے متنفر نہیں۔ میرا خیال ہے طبیعتوں میں کینہ نہ ہو تو ظالم سے ظالم جملہ بھی اپنی کاٹ کے ساتھ ساتھ مرہم فراہم کرتا جاتا ہے)۔

دوسری طرف سبط حسن جیسے عالم اور روشن خیال لوگوں نے بھی قاسمی صاحب کی اسلام پسندی اور پاکستان دوستی کو متوحش اور مشکوک نگاہوں سے دیکھا جیسے مذہبی ہونا اور حب الوطنی کا جذبہ رکھنا سب سے بڑی گالیاں ہیں۔ ان سے (سبط حسن مرحوم سے) میری پانچ سات ملاقاتیں ہوئیں۔ دو تین محفلوں میں قاسمی صاحب کا نام بھی آیا اور ہر بار مرحوم نے ان کی شخصیت کو نیچا کرنے کی کوشش کی۔ میری گواہی کافی ہے۔ اسی لئے مجھے تعجب نہیں ہوا جب فیض کے انتقال (حکم ہو تو وصال لکھ دوں) کے بعد ایک اردو کے اخبار میں سبط حسن سے ایک نہایت احمقانہ سوال کیا گیا۔ کچھ یوں تھا۔

"اب کہ فیض صاحب چلے گئے ہیں، شاعری میں ان کی جگہ کون لے گا۔" اس سے قطع نظر کہ اس قسم کا سوال صرف اردو اخبار ہی میں ممکن ہے اور دوسری زبانوں کے لوگ ایسے غم زدہ سوال سن کر ہنسی سے لوٹ پوٹ اور شرم سے پانی پانی ہو جائیں گے لیکن سید سبط حسن کا جواب بھی ہم جیسے جاہل شعر پرستوں کے پیٹوں میں گدگدی کرنے اور ہمارے حوصلوں کو پسینہ پسینہ کرنے کے لئے کافی تھا۔ کچھ یوں تھا۔

"بھئی اس خلا کو پر کرنا آسان نہیں مگر ادھر سردار جعفری ہیں اور ادھر حبیب جالب ہیں (استغفراللہ) پھر احمد فراز ہیں (لاحول ولاقوۃ) ---- اور ہاں اپنے احمد ندیم قاسمی بھی ہیں ----" وغیرہ وغیرہ۔

فی الحال اسے بھول جایئے کہ قاسمی صاحب فیض کی جگہ لے سکتے ہیں کہ نہیں۔ ادب میں ایسے نازیبا سوالات کی کوئی اہمیت نہیں۔ فوج کا جنرل مرجاتا ہے تو دوسرا آجاتا ہے۔ وزیراعظم کا انتقال ہو جاتا ہے تو دوسرے وزیراعظم کے ہاتھوں پر بیعت کرلی جاتی ہے مگر ادب میں ایسا نہیں ہوتا۔ ساری عمر کے اکل حلال سے شاعر کی شخصیت کی تعمیر ہوتی ہے۔ آخر یہ معتوب زمانہ "اکل حلال" بلا کیا ہے؟ اور شعرو ادب میں اس کا حوالہ کیوں؟ عرض کرتا ہوں۔ اس کے معانی بہت معمولی ہیں۔ اور ادب میں یوں ہوں گے۔ اپنا لکھنا، اپنا سوچنا، گھڑے گھڑائے استعاروں او تشبیہوں پر قناعت نہ کرنا، چبائے ہوئے نوالوں کو ہضم نہ کرنا، اک الگ نظام ہاضمہ بنانا، تمام عمر ایک ہی صبح، ایک ہی مقتل، ایک ہی قاتل پر ضائع نہ کرنا اور اگر کسی نے عمر ضائع کر دی تو اس کا تتبع نہ کرنا۔ پرانے لفظوں کو نئے زاویے سے قطع کرنا، علم حاصل کرنے کے لئے "چین" تک پہنچنے کی تمنا

دل میں رکھنا۔ کم از کم جہالت پر ناز نہ کرنا۔ اپنی ادبی ترکیب نحوی ایجاد کرنا۔ وغیرہ وغیرہ مختصر یہ کہ فنی جمالیات چیزے دیگر ہے۔ اس "چیزے دیگر" پر نظر رکھنا اور جھک نہ مارنا۔

اب یہ دیکھئے کہ سبط حسن جیسے بالغ نظر کے ذہن میں بھی میرے بیان کردہ "ادبی اکل حلال" کا سارا منظر نامہ ہو گا (اگر نہیں تھا تو وہ اتنے بالغ نظر نہ تھے جتنے مانے جاتے ہیں)۔ آخر انہیں ایسا کون سا دکھ احمد ندیم قاسمی نے پہنچایا تھا کہ دوڈیم فول اور جونیئر شاعروں کے نام کے بعد "قاسمی بھی ہیں" کی ریوڑی بانٹی۔ اس کا ایک سبب تو شاید یہ ہو گا کہ وہ صرف ہنگامی شاعری اور ادب میں ڈائریکٹ ایکشن کو جوہر شعرو ادب سمجھتے تھے۔ (اس حساب سے تو وہ تین قدیم اور عظیم ستون بھی معطل ہو گئے جو میر، غالب اور اقبال کے نام سے پہچانے جاتے ہیں اور جدید شاعری کے وہ تین پل بھی منہدم ہوئے جنہیں ہم راشد، فیض اور میرا جی کے نام سے جانتے ہیں)۔ 35 سال پہلے (اور مجدد الف ثانی بننے سے پہلے) محمد حسن عسکری اپنے ایک خط میں ٹھیک ہی کڑھے تھے کہ اس قسم کا رویہ رواج پا گیا تو ہمیں مجید لاہوری اور رئیس امروہی جیسے لوگوں پر گزارا کرنا پڑے گا (یاد رہے کہ شیخ احمد سرہندی کے مکتوبات ان کی تمام تصنیفات سے زیادہ مشہور اور اہم ہیں)۔ دوسرا سبب شاید یہ ہو گا کہ قاسمی صاحب نے جنرل ضیا کی دعوت پر اسلام آباد کا سفر کیوں کیا یا اتنے پاکستانی اور مذہبی کیسے ہو گئے جب کہ اپنے آپ کو سوشلسٹ کہتے ہیں۔ میں کہتا ہوں کہ اس اسلام آباد والی تقریر کا متن بھی کسی کو یاد ہے کہ نہیں "ہم ملک کے وفادار ہیں اور رہیں گے مگر کسی حکومت وقت کی وفاداری ہم پر واجب نہیں۔" شاید اسی قسم کے الفاظ تھے۔ سطے بھائی، خدا آپ کو کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے ——————

مگر آپ جیسے ترقی پسند نے بھی قاسمی صاحب کے ساتھ زیادتی ہی کی اور یہی بات تو یہ ہے کہ شعروادب کو جھاڑ پونچھ کر قالین کے نیچے دبا دینے کی وبا اور ادیبوں شاعروں کے کرداروں کو قتل کرنے کا رواج عام ہو گیا ہے۔ اخباروں نے ادبی مباحث کو گھٹا کر ذاتیاتی تمسخر کی سطح پر لا کر کھڑا کر دیا ہے۔ اور معمولی معمولی رنجشوں کے انگاروں پر پنکھے کی طرح چلنے لگے ہیں۔ پھر جو واویلا قاسمی کے "اسلام آباد" جانے پر ہوا تھا وہی فیض کے "اسلام آباد" جانے پر بھی ہونا چاہئے تھا کہ انہوں نے (فیض صاحب نے) تو شاید جنرل صاحب کا کھانا بھی کھایا تھا۔ دو آدمیوں کے بارے میں دو طرح کے رویے کیوں اختیار کئے گئے۔

جہاں تک میرا تعلق ہے میں دنیا کی تمام فوجی حکومتوں کو جمہوریت اور ملک کے ماتھے پر کلنک کا ٹیکا سمجھتا ہوں اور ہر غاصب جنرل کی طرف حقارت کی نظر سے دیکھتا ہوں کہ یہ شخصی اور ذہنی آزادی کے قائل ہیں اور میں انہیں کسی صورت میں بھی معاف کرنے کا روادار نہیں مگر ان سے گفتگو کرنے یا ان کے ساتھ (یا ان کا) کھانا کھانے سے شعروادب کی تذلیل یا توقیر نہیں ہوتی۔ شاعر یا ادیب کو پرکھنے کا واحد ذریعہ وہ الفاظ ہیں جو وہ لکھتا ہے۔ لفظوں کی ہنرمندی ہی اس کے احساس و خیال کو زنجیر کر کے صفحے پر اتار دیتی ہے۔ یہ صفحہ تاریخ کا حصہ بنتا ہے یا نسیاں کا' اس کا انحصار لکھنے والے کی بالغ نظری' انسان دوستی اور چابکدستی پر ہے۔

یہاں میں ایک اور مسئلے کی طرف اشارہ کرنا چاہتا ہوں۔ دس سال ہونے کو آئے مگر ندیم قاسمی اور وزیر آغا کے مابین ایک طرح کی سرد جنگ آج بھی جاری ہے۔ ابتدا میں یہ ایک نظریاتی اختلاف کے طور پر ابھری تھی اور یہ ایک خوش آئند بات تھی۔ میں 22 سال سے دور بیٹھا ہوا ہوں اس لئے اس کے سبب پر اور اس امر میں کوئی حتمی بات نہیں لکھ سکتا مگر مجموعی طور پر جو تصویر میں نے اخباروں' رسالوں اور ادھر آنے والے شاعروں' افسانہ نگاروں اور نقادوں سے گفتگو کر کے اپنے ذہن میں بنائی تھی وہ غلط نہیں تھی۔ بلکہ اس کی توضیح و تشریح قاسمی صاحب اور آغا صاحب کے خطوں نے کر دی تھی۔ پھر ان دونوں سے ملاقاتوں کے بعد کچھ اور بھی میرے خیال کی توثیق ہو گئی تھی۔ دونوں "ذاتیاتی" حملوں سے نالاں تھے۔ وہ دونوں خوش نصیب ہیں کہ پاکستان میں بیٹھے ہیں اور ان کے نام اس طرح کے بیہودہ خطوط نہیں آتے جو میرے نام آتے رہتے ہیں (بلکہ ٹوٹی پھوٹی انگریزی میں میری بیوی اور بیٹی کے نام بھی) جن میں صرف مجھ پر ہی غلاظت نہیں اچھالی جاتی بلکہ میری بیٹی' میری بہنوں' میری بیوی' غرض کہ میرے خاندان کے ہر فرد پر بہتان تراشی ہوتی ہے۔ حالانکہ مجھے خاموش کرنے کا سب سے آسان طریقہ یہ ہے کہ کوئی اچھا مصرع کہہ کر یا تازہ جملہ لکھ کر مجھے بھیج دیا جائے۔ میں خود ہی خاموش ہو جاؤں گا۔ مکمل سچائی نہ قاسمی صاحب کے پاس ہے نہ وزیر آغا صاحب کے پاس اور نہ ہی میرے پاس۔ ہم سب پر چھوٹی چھوٹی سچائیاں منکشف ہوتی ہیں۔ انہیں کے اظہار سے ادب کی فضا رنگ زار بنتی ہے ورنہ یک رنگی سے ادب کا دم گھٹ جائے۔

میں چونکہ خود ادب میں، جمالیاتی اور نظریاتی سطح پر، بیشتر ہم عصروں سے جنگ کرتا رہتا ہوں اس لئے کوئی مصالحتی رول ادا کرنے سے قاصر ہوں اور جمالیاتی اور نظریاتی بحثوں کی شدومد پر جان دیتا ہوں بلکہ ذوق نغمہ کی کمیابی کے باعث اپنی نوا تلخ تر کر رکھی ہے۔ مگر میرا سارہ غصہ لکھے ہوئے غیر جمالیاتی الفاظ کے خلاف ہے (یہ بھی ہوا ہے کہ فرسٹریشن میں بعض احباب کی منھ زبانی تنبیہہ کرنی پڑی اور غیرپارلیمانی زبان استعمال کرنی پڑی۔ آج اپنے اس رویے پر ندامت ہے۔ اگر ان احباب کی فہرست طویل نہ ہوتی تو ایک کا نام لے کر معافی مانگ لیتا)۔ تاہم اس سلسلے میں اتنا ضرور کہوں گا کہ قاسمی صاحب اور آغا صاحب کو اپنے اپنے رویے میں لچک پیدا کر لینی چاہئے دونوں ہی بیمار رہنے لگے ہیں اور یہ کہ خدا کرے ان کی عمروں میں میری عمر لگے، مگر وقت کم ہے اور اپنے دوست ڈاکٹر وزیر آغا سے مزید کہتا ہوں کہ آغا صاحب یہ نہ بھولئے کہ قاسمی صاحب آپ سے طبعی عمر میں بھی بڑے ہیں اور ادبی عمر میں بھی۔ پہل کرنے میں کوئی حرج نہیں۔ اگر آخری کوشش ناکام رہے تو بھی یہ قلق تو نہیں ہو گا کہ آپ کی طرف سے کوتاہی ہوئی۔

میں قاسمی صاحب کے سلسلے میں یہ سب باتیں اس لئے نہیں لکھ رہا ہوں کہ ان کے ارد گرد پھیلا ہوا زرد غبار ختم ہو گیا تو یکایک وہ سب سے بڑے شاعر اور افسانہ نگار ہو کر ہویدا ہوں گے۔ ان سے ایک ملاقات میں دو تین راز کی باتیں کی تھیں اور ان سے استدعا کی تھی کہ اس راز کو فاش کرنے کی اجازت بھی دے دیجئے۔ ہنس کر کہنے لگے "اچھا اجازت دیتا ہوں" میں نے کئی باتیں پوچھی تھیں، ایک دو سامنے لائے دیتا ہوں۔

سوال : میری طرح راشد صاحب بھی آپ کی پچاس فی صد شاعری کو ناپسند کرتے تھے۔ اور کہتے تھے بالکل بے رس ہے۔ پھر وہ شرارت سے ہنسی مذاق پر اتر آتے تھے اور اپنی ناپسندیدگی کا جواز آپ کی پارسائی میں ڈھونڈ لیتے تھے۔ یعنی یہ کہ آپ کی شاعری میں کسی شدید عشق کی کامیابی یا ناکامی سے پیدا ہونے والے نشاط یا الم کی کمی بہت نمایاں ہے۔ آپ کیا کہتے ہیں؟ شادی سے پہلے یا شادی کے علاوہ بھی کوئی سلسلہ تھا کہ نہیں؟

جواب : اگر آپ دونوں کو میرے یہاں نشاط و الم کی کمی دکھائی دیتی ہے تو میں اسے المیہ کہوں گا۔ اظہار کا بھی اور رسائی کا بھی۔ اب جہاں تک "سلسلے" کا تعلق ہے

تو ایک خاتون سے بہت شدید اور بہت ٹوٹ کر محبت کی۔
سوال: اس کی تھوڑی سی وضاحت اور کر دیجئے؟
جواب : جی ہاں اس تعلق میں جنسی تجربات بھی شامل تھے۔ آپ یہی معلوم کرنا چاہتے تھے نا!

ادھر ادھر کی اور بہت سی باتوں کے بعد میں نے یہ بھی پوچھا تھا "قاسمی صاحب' اقبال کے بعد اردو کی جدید شاعری کا جو مثلث راشد' فیض اور میرا جی نے بنایا ہے' کیا آپ کی شاعری اسے توڑ سکتی ہے کبھی۔" کہنے لگے (اور اس جواب میں ان کی انانیت نہیں صاف گوئی تھی) "اگر کوئی شاعر یہ سوچ کے شاعری کرے کہ وہ فلاں مثلث یا فلاں مستطیل کو توڑنے کا اہل نہیں تو اسے شاعری نہیں کرنی چاہئے۔"

میں چونکہ دو چار جملوں میں یہ مضمون ختم کرنے والا ہوں اس لئے مجھے کہنے دیجئے کہ:

1- قاسمی صاحب کی شاعری اس مثلث کو توڑنے میں ناکام رہی ہے اور اب اس کا امکان بھی نہیں۔
2- مگر ترقی پسندوں کو اس کی اجازت نہیں کہ وہ مخدوم کے بعد اور سردار جعفری سے پہلے یا ساتھ ان کا نام نہ لیں۔
3- یہ بھی کہ یہ واحد ترقی پسند ہیں (اپنے ہم شہر اور بزرگ ہم عصر مجنوں گورکھپوری کی طرح میں بھی اس اصطلاح "ترقی پسندی" کا سخت مخالف ہوں) جن کے ہاں لچک ہے' جو اپنی نمو پذیر شخصیت برف کی سل کے نیچے دبائے سکتے نہیں رہے۔
4- انہوں نے اپنے اندر ہونے والی تبدیلیوں سے ہمیں مطلع کیا ہے مگر اچھی اور اہم (بڑی نہ سہی) شاعری کے لئے بھی صرف اطلاع کافی نہیں۔ ان کے یہاں مجموعی طور پر' کسی "آنچ کی کمی" کا شدت سے احساس ہوتا ہے۔
5- یہ منٹو اور بیدی کے پلے کے افسانہ نگار نہیں مگر کرشن چندر سے کسی طرح چھوٹے نہیں اور انہیں ان کا حق ملنا چاہئے۔
6- ان کی روکھی پھیکی شاعری پر میں بھی بہت گفتگو کر چکا اور دوسرے بھی۔ ان کے

مندرجہ ذیل (اور ایسے ہی بہت سے اور بہت پیارے) شعروں پر بھی گفتگو ہونی چاہیے:

(الف) سورج ابھرا کہ قیامت جاگی
رات گزری کہ زمانے گزرے

(ب) پا کر بھی تو نیند اڑ گئی تھی
کھو کر بھی تو رت جگے ملے ہیں

(ج) ابھی ابھی تمہیں سوچا تو کچھ نہ یاد آیا
ابھی ابھی تو ہم اک دوسرے سے بچھڑے تھے

(د) بھولے گا نہ اے بہار تیرا
چھپ چھپ کے کلی کلی میں آنا

(ہ) اک سفینہ ہے تری یاد اگر
اک سمندر ہے مری تنہائی

(و) ترے پہلو سے اٹھ کر کھو گئے ہم
خیالوں کی گھنی تنہائیوں میں

(ز) چاند جب دور افق پر ڈوبا
تیرے لہجے کی تھکن یاد آئی

(ح) تو نیند میں بھی میری طرف دیکھ رہا تھا
سونے نہ دیا مجھ کو سیہ چشمی شب نے

(ط) ہم نے ہر غم سے نکھاری ہیں تمھاری یادیں
ہم کوئی تم تھے کہ وابستہ غم ہو جاتے

(ح) اب دامن صحرا پہ بھی دھوکا ہے چمن کا
گلگشت ہے اب بادیہ پیمائی ہماری

(ک) اتنا سیال ہے یہ پل کہ گماں ہوتا ہے
میں ترے جسم کو چھو لوں تو پگھل جائے گا

(ل) اتنا مانوس ہوں سناٹے سے
کوئی بولے تو برا لگتا ہے

(م) تو نے یوں دیکھا ہے جیسے کبھی دیکھا ہی نہ تھا
میں تو دل میں ترے قدموں کے نشان تک دیکھوں

(ن) تو اتنا قریب ہے کہ تجھ سے
میں پوچھ رہا ہوں تو کہاں ہے

(س) آنکھ کھولی تو جہاں کان جواہر تھا ندیم
ہاتھ پھیلائے تو ہر چیز کو عنقا' دیکھا

سلیم الطبع شاعر
(1)

(مگر یہ خط نما مضمون دوسرے ہم عصروں کے نام بھی ہے ———)
(ساقی فاروقی)

پیارے سلیم بھائی،
کاش میں آپ کی غزل سے بھی اتنا ہی خوش ہوتا جتنا آپ کی شخصیت اور تنقید سے۔ افسوس ایسا نہیں ہے۔ میری ناچیز رائے میں جو چیز آپ کی شاعری کا دامن پیچھے ہی پیچھے کی طرف کھینچتی رہتی ہے وہ آپ کی کلا سکیت ہے۔ (سنا ہے کلا سکیت کا لفظ رواج پا گیا ہے) مجھے شدید قلق ہے کہ یہ سرطان آپ کو اندر ہی اندر کھاتا چلا جا رہا ہے (یوں زودنویسی کچھ کم مہلک نہیں)

بہت سے لوگ بلکہ اردو کے وہ تمام لوگ جن سے پچھلے بیس سال میں مجھے گفتگو کا موقع ملا ہے (مختلف شہروں میں) یا جن کی تحریریں میری نظر سے گزریں اور جنہوں نے آپ پر اظہار رائے کیا ہے، وہ آپ کی مذہبیت اور ہندی اور اسلامی تاریخ میں آپ کی غوطہ زنی کو آپ کی کلا سکیت کا پیش خیمہ قرار دیتے ہیں۔ میری حقیر رائے میں وہ سب لوگ جھک مارتے ہیں۔ ان میں سے بیشتر کی نہ اسطوری (یا اسطاری) اردو ادب پر نظر ہے نہ اس اسلام کی خبر جس کی ابتدا اس وقت ہوئی "جب خدا پانیوں پر بہتا پھرتا تھا۔" چند ایسے بھی ہیں جو اس سے آگاہ ہیں مگر اتنے فرعون قلب کہ ناک کے بانسے سے آگے دیکھنے کی جسارت نہیں کرتے کہ مبادا بشارت ہو گی۔ مذہب اور تاریخ اگر آدمی کو کلاسیکی بنا سکتے تھے تو ایسے مصرعے نہیں لکھے جا سکتے تھے:

April is the cruellest month, breeding
Lilacs out of the dead land, mixing
Memory and desire, stirring
Dull roots with spring rain

(الخ)

سچی بات تو یہ ہے کہ میں جتنا غیرمذہبی آدمی ہوں یا ہو گیا ہوں اتنا ہی مجھے آپ کا مذہبی آدمی پسند ہے اس کا سبب یہ ہے کہ جس سوچ بچار نے مجھے اس خدا سے دور کیا جو مجھے ماں باپ اور قوم نے سونپا تھا اسی سوچ بچار نے آپ کو اس خدا سے قریب تر کیا ہے یعنی میرے نزدیک ایک آمر مطلق کے خدا کے کوئی معنی نہیں مگر سلیم احمد کے خدا کے معنی بنتے ہیں' زندگی میں بھی اور ادب میں بھی۔ آپ کی تنقید میں یہ خدا منکشف ہوا ہے مگر شاعری میں نہیں۔ (اور میں شاعری کو شعری جوہر کے معنوں میں استعمال کر رہا ہوں۔) وہ جوہر جو "مسجد قرطبہ" میں ہے۔ "مسدس حالی" میں نہیں "شاہنامہ اسلام" میں نہیں۔ حتیٰ کہ "شکوہ جواب شکوہ" میں نہیں کہ یہ چیزیں زیادہ سے زیادہ صحافیانہ ہیں۔ ان میں ان بے پرت' بے تہ' مولویوں کا انداز ہے جن کا خدا مولود شریف پر طلوع ہو کر شکرپاروں میں غروب ہو جاتا ہے۔ یہ ایک مقصدی خدا ہے اور شکرپاروں کے بٹنے کے بعد اس کی افادیت ختم ہو جاتی ہے۔

اپنی کتاب "بیاض" کو ہی لیجئے۔ پوری کتاب میں صرف تین شعر ایسے ہیں جن سے پتا چلتا ہے کہ مذہب آپ کا گہرا تجربہ ہے۔ ان شعروں میں گہرائی لاشعور نے دی ہے (آپ شاعری کو شعور کی اولاد سمجھتے رہئے) یعنی جب تاریخ' کلچر اور تجربہ شعور کے پل سے گزر کر لاشعور میں پہنچ گئے اور پوری شخصیت میں سرایت کر گئے تو یہ شعر ہوئے:

-1 نہ جانے کس کی آمد ہے کہ تارے
دو رویہ مشعلیں لے کر کھڑے ہیں

-2 شاید کوئی بندۂ خدا آئے
صحرا میں اذان دے رہا ہوں !

-3 اس بیکراں سکوں میں جو رشکِ جنوں بنا
اک اضطراب تھا کہ بہ حد کمال تھا

(پہلا شعر دوسرے شعر سے بڑا اور گہرا ہے اور تیسرا شعر مجھے بہت عزیز ہے)

یہ شعر آپ کی تمام کلاسیکی شخصیت کے باوجود تازہ بھی ہیں اور انوکھے بھی کہ ان میں ذاتی تجربوں کی بیکرانی اور دکھ پوشیدہ ہیں۔ اب میں آپ سے اپنے پہلے نظریہ کی تصدیق چاہتا ہوں کہ تاریخی شعور اور مذہبی تجربہ آدمی کو کلاسیکی نہیں بناتے۔ مجھے ایسا لگتا ہے کہ اردو کا سارا کلاسیکی ادب آپ کے شعور میں زندہ ہے۔ یہی نہیں غالب' میر' آتش' یگانہ اور فراق کی آوازوں کے کنٹھے اور بالے آپ کے کانوں میں پڑے ہوئے ہیں۔ جب تک یہ ساری چیزیں اندر اتر کر (لاشعور میں پہنچ کر) دور نہیں ہو جائیں گی' آپ اپنی آواز کے تعاقب میں دیوانہ وار پھرتے رہیں گے۔

آپ کا خدا اگر اقبال کا خدا نہیں ہے' آپ کی محبوبہ اگر غالب یا آتش یا یگانہ یا فراق کی محبوبہ نہیں ہے تو آپ کا تجربہ جدا ہونا چاہئے (جو یقیناً ہو رہا ہے) اگر تجربہ جدا ہے تو اس کے الفاظ بھی جدا ہوں گے یعنی لفظوں کی نشست و برخاست اور آہنگ آپ کا اپنا ہونا چاہئے۔ آپ کے یہاں گاہے گاہے ایسا ہوا ہے۔ 90 فیصد نہیں ہوا۔ میں چونکہ آپ کی بہت قدر کرتا ہوں اور آپ سے بہت محبت کرتا ہوں اس لئے مجھے اس نوے فیصد یا اسی فیصد (یقیناً 3/4) شاعری کے رائیگاں ہونے کا اندر سے دکھ ہے۔

یہ سچ ہے اور دنیا کے تمام شاعروں نے (اور تمام سے میری مراد وہی ہے جو اس لفظ میں ہے یعنی ایک شاعر بھی نہیں بچا سوائے ان شاعروں کے جو اپنی زبان کے پہلے شاعر ہیں یہاں بھی اگر کوئی زبان کسی اور زبان یا زبانوں کے میلان سے پیدا ہوئی تو مادری یا بنیادی زبان کے شاعروں کے سائے میں نئی زبان کے اولین شاعروں نے سفر کیا ہے مثلاً رومن یا اردو' اپنے اگلوں کے سائے میں سفر شروع کیا مگر آگے وہ گئے جنہوں نے ان سایوں سے نجات پانے کی کوشش کی۔ جس کی جتنی کامیاب کوشش ہے وہ اتنا ہی الگ اور نیا ہے۔ مجھے آپ کے ہاں اس کوشش کا بہت فقدان نظر آتا ہے۔ آخر ایسا کیوں ہے؟ اس سوال پر آپ کو بہت غور کرنا پڑے گا۔ آپ خود اس سے واقف ہیں اور بیس سال پہلے آپ نے کوشش بھی کی تھی اور جست لگائی بھی تھی مگر وہ بھی ردعمل کی شاعری

تھی۔ آپ کو اس لمحے کو بھی قبول کرنا پڑے گا۔ جو "آج" ہے —— جس رد عمل نے "ویسٹ لینڈ" یا "مسجد قرطبہ" لکھوائی وہ لمحہ موجود کو قبولنے کے بعد نصیب ہوتا ہے اور رد عمل ایک تخلیقی اور نامیاتی عمل بن جاتا ہے۔ ان نظموں کے شاعر "آج" میں اترے ہوئے ہیں۔ اس کے تماشائی نہیں، پھر آپ کا رد عمل بھی آپ کا اپنا نہیں ہے یا بیشتر اپنا نہیں ہے۔ مثلاً ۔ جمع و تفریق میں گو طاق ہے جھتی کی مشین، اصل میں اقبال کے ۔ تمہاری تہذیب اپنے ہاتھوں سے آپ ہی خود کشی کرے گی، کی گونج ہے، الفاظ میں نہیں انداز میں۔

میرے خیال میں آپ کو اپنا سفر مندرجہ ذیل شعروں کی تازگی، خوبصورتی، آہنگ اور گہرائی کی اوٹ میں جاری رکھنا ہو گا کہ یہی اور اسی قسم کے اشعار اردو شاعری میں آپ کا Contribution ہیں۔

1- سائے کو سائے میں گم ہوتے تو دیکھا ہو گا (پورا شعر)
2- کہاں سے آج مری روح میں چمک اٹھے (پورا شعر)
3- نہ جانے کس کی آمد ہے کہ تارے (پورا شعر)
4- کیسی لالچ کیا قناعت آج میری روح میں (پورا شعر)
5- کیسا اس نفرت کے سناٹے میں گھبراتا ہے دل (پورا شعر)
6- روح کی توہین پر آمادہ رہتا ہے بدن (صرف مصرع)
7- یہ چاہا تھا کہ پتھر بن کے جی لوں (پورا شعر)

وغیرہ وغیرہ —— (یہ بہت قیامت شعر ہیں)

اس میں بہت دکھ اٹھانا ہو گا کہ آپ گلے گلے دوسروں کے لہجے اور کلاسیکی آہنگ میں دھنسے ہوئے ہیں۔ مگر آپ طاقت ور آدمی ہیں اس سے نکل سکتے ہیں مگر مجھ (اپنے دس سال چھوٹے دوست اور ہم عصر) شاعر کا مشورہ مان لیجیے، (اگر آپ مجھے اس کی اجازت دیں) 3'2 سال تک غزل بند —— ایک مصرع بھی غزل کا نہ لکھیے۔ قطعی نہیں، چاہے اس کے بعد سالی غزل بالکل نہ ہو۔ کوئی پرواہ نہیں۔ مگر جب غزل ہو تو ان ٹکڑوں اور لفظوں کے بغیر ہو: ذوق آرائش، آئینہ دار، صاحب ایثار، گل و صبا، حال دل، یار طرح دار، درخور اظہار، میرا گرفتار، جنون گستاخ، سردار، جناب دل، وہ زلف، تری

گلی، سنگ در، جوروکرم، شادی و غم، عرضِ تمنا، سرکارِ محبت، شکووں کے دفتر، قیس و کوہکن، داورِ حیات، نذروفا، میاں، اللہ رے، نگاہِ ناز، نرگسِ ناز، اندازِ تغافل، دل صد چاک، چاک پیراہن یوسف وغیرہ اور اسی قسم کے سیکڑوں الفاظ و تراکیب جن سے آپ کی شاعری اٹی ہوئی ہے۔ سوال یہ ہے کہ جن تراکیب کے بنانے میں (کوئی پہلا اور نیا تجربہ بیان کرنے کے لیے) دوسرے شاعروں نے جان کھپائی اس پر آپ بغیر دکھ اٹھائے، بغیر ان تجربوں سے گزرے، قابض کیسے ہو سکتے ہیں، اور اگر آپ دکھ اٹھا رہے ہیں تو تساہل کیوں برت رہے ہیں۔ نئی تراکیب وضع کیجئے۔ اپنی ذات کے آہنگ میں لکھئے جس کی کچھ مثالیں میں نے اوپر درج کر دی ہیں۔

اب کچھ قطعات کے بارے میں

میں قطعات کو مختصر نظموں کا مترادف سمجھتا ہوں۔ یعنی ہر قطعہ ایک ایسی نظم ہے جس کا ایک نادیدہ عنوان ہے۔ اس لئے ان سے میری توقعات وہ ہوں گی جو نظموں سے ہوتی ہیں یعنی ہر مصرع ایڑ لگائے اور آنے والے مصرع کو اوپر کی طرف دھکا دے یا اگر شاعر اس کی ضرورت محسوس کرے کہ ترسیل اور آہنگ کے رموز و اسرار کے لئے انہیں پیچھے کی طرف دھکیلنا ضروری ہے تو یہ بھی صحیح مگر مصرع کسی کفنائے ہوئے Statement کی طرح منجمد نہ ہو، حرکت کرے۔ ان معنوں میں جدید قطعات پرانے قطعوں سے جدا ہوں گے۔ ان میں خیال اور احساس ہر آن حرکت میں رہیں۔ (جوش کی تمام نظمیہ شاعری غالب کے قطعے "چکنی ڈلی" کی طرح منجمد ہے، یہی اس کا نقص بھی ہے اور سببِ مرگ بھی) آپ کے بیشتر قطعے غزل کے ایک مکمل اور اکثر بہت نوک دار اور نئے شعر کو کھینچ تان کر لکھے گئے ہیں اور عموماً پہلے دو مصرعے کمزور اور کم مایہ ہیں۔ اگر آخری دو مصرعے ہی ہوتے تو ان میں سورج کی سی تمازت اور روشنی ہوتی۔ مگر پہلے دو مصرعے ان پر گہن کی طرح بیٹھے ہوئے ہیں اور آخری دو مصرعوں کے بانکپن کو دیمک کی طرح چاٹ رہے ہیں۔ مثلاً کہنا آپ صرف یہ چاہتے ہیں کہ:

جسم و جاں کی اکائی ٹوٹ گئی
میں فقط ہوں دماغ میں زندہ

"جسم" سے لے کر "زندہ" تک ہر لفظ ایک دوسرے کو آگے بڑھاتا جاتا ہے۔ بلکہ زندہ تک آتے آتے دکھ اور تھکن کا احساس ہونے لگتا ہے اور ماتم کی کیفیت نہایت خوبصورتی سے پیدا ہوتی ہے۔ اور ایک احساس کی نہایت مکمل تصویر بن جاتی ہے۔ پہلے دو مصرعے اسی احساس کے دعوے کی توجیہ پیش کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ پھر "دماغ" کی مجبوری کے باعث "چراغ" اور "ایاغ" کی ضرورت محسوس ہوتی ہے اور چراغ کے لئے "روشنی" کی طرف آپ بھاگتے ہیں اور "ایاغ" کے لئے نشہ مانگتے ہیں۔ یعنی ہونا یہ چاہئے کہ احساس یا خیال لفظوں کو Dictate کریں، ہو یہ رہا ہے کہ الفاظ آپ کے خیالات اور احساسات کو گھسیٹ رہے ہیں اور آپ کف افسوس نہیں مل رہے، بلکہ بغیر رسہ کشی کے لفظوں سے ہار مان رہے ہیں۔ اکثر آپ کی شاعری اس رسہ کشی سے خالی ہے ورنہ یہ کشمکش شاعری میں آتی ——— On the other hand) میں جس سلیم احمد سے واقف ہوں اس کی ساری زندگی ہی کشمکش ہے)۔ سوچنے کی بات یہ ہے کہ وہ کون راز یا خوف ہے جس کے باعث شاعری میں وہ کشمکش نہ آنے پائی جس سے زندگی مزین ہے۔ کسی پرانے لفظ یا محاورے کے چکر میں شاعر کو اس لئے نہیں پڑنا چاہئے کہ زبان پر چٹخارہ آجائے گا۔ ہر لمحے چوکنا رہنے کی ضرورت ہے اور یہ دیکھتے رہنا چاہئے کہ یہ محاورے، زبان کے یہ چٹخارے کہیں وہ تو بڑے تو نہیں جنہیں پہن کر شاعر کے خیالات و احساسات جگالی کرتے رہتے ہیں۔

میں نے اکثر قطعات کے دو مصرعوں کو اور بعض کے ایک ایک مصرعے کو کاٹ دیا ہے اور گاہے گاہے تین مصرعے نکال دیئے ہیں۔ اس طرح لفظوں کی کنجوسی بھی کارگر ہوئی ہے اور خیال یا احساس چمک بھی اٹھے ہیں اور ان میں تازگی اور انوکھاپن بھی آگئے ہیں۔ (جب کتاب چھپے تو پورے صفحے پر بس ایک مصرع ہی چھپے کہ وہ مکمل ہے۔ ایک پورا احساس یا خیال)

بارے نظموں کا کچھ بیاں ہو جائے

سب سے پہلے تو یہ سنئے کہ

You have taken me completely by surprise

مجھے یہ توقع نہیں تھی کہ غزل کا وہ شاعر جس پر میں نے پچھلے 4'5 صفحے سیاہ کے ہیں، نظم میں اتنا الگ، خوبصورت، گہرا، دکھی اور تازہ ہو گا۔ میں نے ادھر ادھر آپ کی اکی دکی نظمیں دیکھی تھیں مگر کوئی رائے قائم نہ کر پایا تھا۔ اپنی جہالت پر شرمندہ ہوں۔ معاف کر دیجئے۔ ان موہنی نظموں میں مذہب اور محبت دونوں تجربے اور ان کا اظہار اس انداز سے ہوا ہے جو سلیم احمد ایسے شاعر کے شایان شان ہے۔

چونکہ نظم پر آپ کی 30 سالہ ادبی زندگی کا بہت کم عرصہ صرف ہوا ہے (میرے خیال میں مشکل سے 3'4 سال، اس لئے ان کی Execution میں کہیں کہیں آپ Sure نہیں تھے۔ مگر یہ ضمنی اور بہت چھوٹی بات ہے۔ میرے لئے سرشاری کی بات یہ ہے کہ آپ بالکل صحیح راستوں پر ہیں اور بہت خوبصورت باتیں آپ نے لکھی ہیں۔ مجھے شبہ ہے کہ تنگ نائے غزل آپ کے نئے اور گنجلک تجربات کے لئے کافی نہیں رہی۔ شاید وقت آگیا ہے کہ آپ اپنا حساب (assesment) پھر کریں۔

اگلی کتاب "نیند کی نوٹ بک" کے نام سے چھپے۔ یا تو صرف ان نظموں کا مجموعہ ہو یا یہ نظمیں پہلے ہوں اور غزلیں اور قطعے بعد میں۔

میں نے کچھ نظمیں کاٹ دی ہیں۔ کئی نظموں کے مصرعے نکال دیے ہیں بعض مصرعوں میں ایک آدھ لفظ گھٹا بڑھا دیا ہے۔ کچھ عنوانات بدل دیئے ہیں۔ یہ سب کرتے ہوئے میری کوشش یہ رہی کہ:

(1) بے جا الفاظ استعمال نہ ہوں۔

(2) نظم Compact ہو جائے۔

(3) آگے کی طرف سرعت سے بڑھے۔

(4) پوری نظم کا ایک اپنا آہنگ ہو جو تجربے کے تابع ہو۔ کہیں جھنجلاہٹ کہیں سرگوشی، کہیں اداسی، کہیں لکنت کا انداز آ جائے۔

(5) رومانی فضا اگر ایک آدھ لفظ کی مرہون منت ہو تو اسے نکال دیا جائے۔

(6) شاعر کو لفظ نہیں لفظوں کو شاعر برتے۔

(7) بات To the point ہو۔

(8) ایک نظم اپنی پوری Complexity کے ساتھ آئے مگر ایک ہی نظم میں دو Complex مسائل نہ ہوں۔ نیا Complex نئی نظم مانگتا ہے ورنہ ترسیل میں دقت پیدا ہوتی ہے اور تصویر دھندلا جاتی ہے۔

(9) پرانا پن نکال دیا جائے (یعنی لفظ "ہائے" اور "ظالم" وغیرہ)

(10) نظم پہلے مصرعے سے نہیں 'آہستہ آہستہ کھلے' راز کی طرح۔

(11) سہل ہو جائے (دبیز لفظوں کی جگہ سیدھے الفاظ جو روزمرہ ہیں)

مثلاً "عہد طفلی کی سادہ بہاریں" میں نے "اور بچپن کے دن" میں بدل دی ہیں۔

(12) کشمکش کا انداز قائم رہے۔

مگر ان باتوں کو فی الحال بھول جائیے کہ میں آپ کی کئی نظموں سے بہت خوش اور بہت مطمئن ہوں۔

خدا کرے آپ خوش ہوں ——— آپ کا ساقی

(2)

میں اس کتاب کے مسودے کو پڑھ کر خوش اور حیران ہوا کہ غزلوں اور قطعوں
ے الگ نظموں میں ایک انوکھا شاعر منکشف ہوا ہے۔ ایک ایسا شاعر جو اب تک ہم سے
ور شاید اپنے آپ سے چھپا ہوا تھا۔ یہ نظمیں (اگر سب نہیں تو بیشتر) سلیم احمد کی ہفت
لو شخصیت کے Puzzle کے وہ کھوئے ہوئے ٹکڑے ہیں جو اچانک بازیافت ہوئے
ں۔ محبت اور مذہب' دونوں تجربوں میں تازگی' پیچیدگی اور گہرائی ہے۔ چونکہ شاعر سے
ری دلچسپی بڑھ گئی ہے اس لئے دو نظموں کا تجزیہ ضروری ہے۔

) "حمد" —— اس نظم میں ایک ایسی سرشاری کی کیفیت ہے جو صرف سوچ بچار کا
جہ نہیں بلکہ پوری شخصیت کی شمولیت سے پیدا ہوتی ہے۔ پھر خدا کا اقرار کائنات کے
یلے سے ہے۔ سورج کی نرم کرنیں "شیخ" کے حرارت بخش تصور کی طرح ہیں۔ نشاطیہ
جے کا سبب یہ ہے کہ اس پر چھائیں (کائنات) کے پیچھے کوئی سروقد ہے۔ شاعر کے پاس اتنا
ت نہیں کہ ان لوگوں کا محاسبہ کرے جنہوں نے خدا کو گم کر دیا ہے مگر "خدائے گم
دہ" کا ٹکڑا اس بات کی دلیل ہے کہ اسے (شاعر کو) ایسے لوگوں کا علم ہے بلکہ ایسے
ں کا بھی جنہوں نے اپنے تئیں خدا کو مار رکھا ہے۔ یہ نظم منفی رویوں کی ہوتی تو ایسے
ں کا ماتم ہوتا یا ان پر غم و غصہ کا اظہار ہوتا مگر "خدائے زندہ" سے دو باتیں سامنے
ہیں ایک تو یہ کہ جہاں تک شاعر کا تعلق ہے God is alive and well and
kinki دوسرے یہ کہ اسی انکشاف سے یہ حوصلہ پیدا ہوا کہ وہ اپنی بخشش عام کرے۔
ی تین مصرعوں میں ایک پیغمبرانہ شان ہے اور انہی مصرعوں کے باعث اس نظم کا
غالب کے رویے "کوئی معشوق ہے اس پردۂ زنگاری میں" سے مختلف ہے' بڑا یا بہتر

نہیں۔ مختلف۔ ان معنوں میں کہ یہ نظم اگلا زینہ ہے۔ اس نظم کا غنائی حسن مجھ جیسے "خدا کے انکاری" کو بھی رام کرتا ہے۔ ہم عصر شعرا میں "حمد" لکھنے کی وبا عام ہے مگر بیشتر کا لہجہ اتنا غمناک اور لیٹا لیٹا سا ہے کہ ان پر نوحے کا گمان ہوتا ہے' ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کسی چلتے ہوئے فیشن کے سبب جلدی جلدی خدا پر ہاتھ صاف کیا جا رہا ہے اور خدا کو ذات میں محسوس نہیں کیا گیا ہے۔ مثلاً منیر نیازی کی ایک کتاب میں 5 حمدیں ہیں' میں ہر نظم کا پہلا مصرع اس لئے لکھ رہا ہوں کہ آپ میری بات کو آسانی سے سمجھ سکیں (یہاں سلیم احمد اور منیر نیازی کا مقابلہ نہیں کر رہا ہوں بلکہ دو رویوں کو پیش کر رہا ہوں) منیر نیازی کے مصرعے دیکھئے:

1- اسی کا حکم جاری ہے زمینوں آسمانوں میں (ساری نظم خیال و احساس کے اسی <u>کلیشے</u> کی بازگشت ہے)
2- شام شہر ہول میں شمعیں جلا دیتا ہے' تو' (لاحول ولاقوۃ - خدا کا تذکرہ ہے کہ -----)
3- تسکین اتارتا ہے دلوں میں خدا کا نام

دوسرے دلوں کے بارے میں آپ Statement دینے والے کون؟ شاعر کے اپنے دل پر کیا گزری؟)

4- کیسے گزرے شام۔ کیوں کر آئے یاد۔ وہ بھولا ہوا نام (سپاٹ' بے مزہ۔ اتنی بے دلی سے تو آدمی دشمن کو بھی یاد نہیں کرتا)

آخر میں منیر نیازی اور سلیم احمد کی حمدوں کے دو دو مصرعوں کو دیکھئے:

مہر کی پہلی کرن اس آنکھ پر آ کر پڑی
رنگ کچھ بدلا عجب اس چشم غم نے اس گھڑی

(کیا سمجھے؟ یہ مصرعے دیکھ کر آپ جان گئے ہوں گے کہ یہ منیر نیازی ہیں)

ابھرتے سورج کی نرم کرنیں
فصیل شب کے حصار میں رقص کر رہی ہیں

(یہ سلیم احمد کے مصرعے ہیں۔ ان مصرعوں میں خدا کے اقرار نے ایک رقص' ایک دیوانگی کی کیفیت کو ابھارا ہے)

یہاں دو شاعروں کی بڑائی یا چھوٹائی کی بحث نہیں تھی بلکہ یہ دکھانا مقصود تھا کہ خدا
ے سلیم احمد کا رشتہ بہت گہرا اور بہت مضبوط ہے اور اس یافت میں ایسا طلسم ہے کہ وہ
د نمائی سے بھی نہیں شرماتے۔ شاید عشق کی ایک منزل ایسی آتی ہے جب آدمی
اشائیوں سے بلند ہو جاتا ہے۔

یہ کوئی بڑی نظم نہیں ہے مگر اس کا تجزیہ قدرے وضاحت سے اس لئے کر دیا گیا
ہے کہ سلیم احمد کے خدا سے ذرا تفصیلی ملاقات ہو جائے۔

(: "دکھ کی بات" —— میرے نزدیک یہ ایسی نظموں میں ہے جو بڑائی کے ذیل میں
تی ہیں۔ یہاں ہم ایک ایسی عورت سے ملتے ہیں جو اس سے پہلے اردو شاعری میں یوں
ق نہیں ہوئی تھی۔ یعنی وہ ہمارے معاشرے میں تو موجود تھی مگر اسے لفظوں میں یوں
رفتار نہیں کیا گیا تھا۔

34 مصرعوں کی یہ نظم ایک مسلسل یاد ہے مگر اس یاد کے دو حصے ہیں۔ پہلا حصہ
سویں مصرعے پر ختم ہو جاتا ہے۔ جہاں بس سوچ لینا اور ہو جانا برابر تھا —— یہ حصہ
ں "دنوں کے ہجوم" کی یاد کی کسک ہے۔ دوسرا حصہ "ایک خاص دن" کا قلق ہے۔

نظم کے پہلے مصرعے "وہ دن بھی کیسے دن تھے" سے ہی ہم متوجہ ہو جاتے ہیں کہ
عر اپنی گزری ہوئی زندگی کا کوئی واقعہ سنانے والا ہے۔ مگر چونکہ اس قسم کے جملے "یار
بھی عجب دن تھے" ہم آئے دن اپنے دوستوں یا عزیزوں سے سنتے چلے آئے ہیں اس
ے ہم چوکنا بھی رہتے ہیں کہ کہیں اس داستان کا انجام بھی اتنے سامنے کا نہ ہو کہ ہر
ید سے اعتبار اٹھ جائے۔ ہم خاموشی سے گویا شوق اور سوال بنے رہتے ہیں۔ دوسرے
رعے سے ہی نظم کا دکھا دکھا لہجہ ہمیں سوگوار کرنے لگتا ہے۔ دو ایسے محبت کرنے
وں کی تصویر ابھرتی ہے جو ایک دوسرے کی محبت میں شرابور ہیں۔ مصرعوں میں سوچ کا
داز ایسا کہ جیسے کوئی رک رک کر ایک لمحے کے بعد دوسرے لمحے، ایک منظر کے بعد
سرے منظر کو یاد کرے۔ یاد کرے اور لذت اٹھائے۔ لذت اٹھائے اور اداس ہو
ئے۔ پھر ٹھہر ٹھہر کر یاد کرنے میں یہ بات بھی نہایت چابکدستی سے آگئی ہے کہ یہ کل
وں کا واقعہ نہیں بلکہ خاصا وقت گزر چکا ہے۔ یہ بھی شاید کہ اس یاد سے اتنی تکلیف

ہوتی تھی کہ اسے شعور سے نکال کر لاشعور میں پھینک دیا گیا تھا۔ اب دوبارہ شعور میں لاکر لفظوں میں قید کرنے کا سبب یہ ہے کہ یہ اتنی طاقتور یاد ہے کہ اس سے پیچھا چھڑانے کی اور کوئی صورت باقی نہیں رہی۔ یاد کی شدت میں کلام نہیں کہ جن خاتون کو برسوں لاشعور میں قید رکھا گیا تھا جب وہ پورے طمطراق سے شعور میں پھر لفظوں میں آئیں تو ان کا عالم یہ ہے:

"بدلتے موسموں کی طرح تیرے جسم پر عالم گزرتے تھے
مری جاں تو بہار جاوداں کا ایک موسم تھی"

یہ تو ممکن نہیں کہ سلیم احمد کی طرح ان کی محبوبہ بھی وقت اور عمر کی خزاں سے گزری نہ ہوں مگر وہ ان کے احساس میں بہار جاوداں کی طرح زندہ ہیں۔ اس لئے نہیں کہ "کیا جانئے تو نے اسے کس آن میں دیکھا۔" یہاں "آن" کی حیثیت ثانوی ہے جیسے کوئی کسی کو اور نزدیک سے دیکھنے کے لئے وقت کی چادر بھی درمیان سے ہٹا دے۔

اب نظم کے دوسرے حصے کی طرف آیئے جو اس مصرعے "تجھے کیا یاد ہے وہ دن" سے شروع ہوتا ہے۔ یہ مصرع بھی پہلے مصرعے کی طرح بہت سامنے کا ہے مگر اس کا جواز یہ ہے کہ بہت سے دنوں میں سے ایک دن کو علیحدہ کرتا ہے۔ اصل میں اسی "ایک دن" کے لئے ساری نظم بنی گئی ہے۔ فوراً ہی یہ خیال انگیز مصرعے آتے ہیں:

"کہ جب حرف شکایت کی گرہ سی پڑ گئی تھی میرے سینے میں"

ہوتا یہ ہے کہ شکایت کرنے کے بعد گرہیں کھل جاتی ہیں' گرہ پڑنے کے معنی یہ ہوئے کہ شکایت سننے والے نے کچھ دیر کے لئے کچھ ایسا سکوت اختیار کیا کہ الجھن بڑھ گئی ہے اور سلیم احمد طرح طرح کے وسوسوں میں گھر گئے ہیں۔ پھر اندر اداسی اتنی بڑھ گئی ہے کہ آس پاس کی تمام چیزیں سوگوار ہو گئی ہیں۔ جیسا کہ آخری مصرعے سے پتا چلتا ہے' شکایت انہوں نے اپنے رقیب یا دشمن جاں کے بارے میں کی ہے اور اس لگاوٹ اور توقع کے ساتھ کہ ان کا عشق افضل ہے اور اس کا ادراک ان کی محبوبہ کو ہونا چاہیے۔ اب محبوبہ کی خاموشی (چاہے اس خاموشی میں چند ثانئے ہی گزرے ہوں) کا مطلب یہ ہوا کہ وہ کسی گہری سوچ میں ہے۔ وہ انہیں خوش یا مطمئن کرنے کے لئے آج کوئی ایسا جواب نہیں دینا چاہتی جو شاید پہلے دے چکی ہو۔ آج وہ سچ بولنے کے موڈ میں

ہے۔ ایسا لگتا ہے تعلقات کی وہ نہج آگئی ہے جہاں دل ٹوٹنے اور دل توڑنے کی منزل سے آدمی گزر جاتا ہے۔ یہاں عورت آگے نکل آئی ہے' یہی اس کی بڑائی ہے' اسے اپنی محبت پر اتنا اعتبار ہے کہ وہ سچ بولنے پر قادر ہے مگر سلیم احمد اپنی محبوبہ سے ایک زینہ نیچے کھڑے ہیں یعنی وہ سچ سننے کے اندیشے سے حواس باختہ بھی ہیں اور جھوٹ سننے پر تیار بھی۔ اب محبوبہ کا جواب دیکھئے:

"کہ میرے جسم میں دو دل دھڑکتے ہیں
تمہارے واسطے بھی
اور اس کے واسطے بھی
جو تمہارا دشمن جاں ہے۔"

جس کا خوف تھا وہی ہوا کہ کوئی اور ان کی محبوبہ کے الطاف و اکرام میں (کم نہیں' زیادہ نہیں) برابر کا شریک ہے۔

یہ کوئی پہلی عورت نہیں جس کے دو یا کئی عشاق ہوں۔ فرق صرف یہ ہے کہ دوسری عورتیں تو اپنے تمام عاشقوں کو یہ سمجھا کر خوش رکھتی ہیں کہ "تمہاری بات اور ہے" مگر اس عورت کو اپنے عشق پر اتنا ناز ہے کہ وہ سچ سے محجوب نہیں ہے مگر سلیم احمد کا المیہ یہ ہے کہ وہ اسے اپنی ہتک سمجھتے ہیں۔ اگر وہ اس سچائی کو اسی لمحے قبول کر لیتے تو برسوں اس "ناگوار یاد" کو لاشعور میں چھپائے چھپائے نہ پھرتے اور آزردہ نہ ہوتے۔

اب اس نظم کی دوسری پیچ دار جہت کی طرف اشارہ کروں گا۔ نظم کے یہ مصرعے دیکھئے:

"میں دل کی بات اگر اس سے بھی
کہہ سکتی تو کہہ دیتی"

سوال یہ ہے کہ جب یہ عورت اچھی طرح سے جانتی ہے کہ اس کے جسم میں دو دل دھڑکتے ہیں اور اسے اپنی محبت پر اتنا بھروسا ہے کہ وہ ایک سے سچ بولنے کا حوصلہ رکھتی ہے تو دوسرے سے آخر کیوں نہیں۔ اس کا راز صرف یہ ہو گا کہ وہ دوسرا' عاشق کے علاوہ کچھ اور بھی ہو گا۔ یہاں شوہر کے سوا کسی اور کا امکان نہیں۔ اور "اس" سے نہ کہہ سکنے کا سبب صرف یہ ہو گا کہ بنا بنایا گھر نہ تباہ ہو جائے۔ ممکن ہے اس عورت کے

بچے بھی ہوں جن کے مستقبل سے وہ خوف زدہ ہو۔

یہ تو عشق کسی "کنوارے جسم اور کنواری آتما" سے نہیں کیا گیا تھا اور سلیم احمد پہلے نہیں دوسرے عاشق ہیں یعنی ان کی طرف یہ عورت اپنی بعض روحانی اور جسمانی تشنگیوں کو پورا کرنے کے لئے بڑھی ہو گی۔ انہیں یہ زعم ہوا ہو گا کہ وہ ساری کی ساری ان کی ہے مگر جب اس نے ایک سچے لمحے کے سامنے انہیں کھڑا کر دیا تو ان کی انا اور محبت دونوں سراسیمہ ہوئے۔

اس نظم میں کئی تہیں ہیں اور پیچ پیچ شخصیت کے بغیر سکھوں' دکھوں' لذتوں اور کراہوں کو اس طرح اسیر کرنا ممکن نہیں۔ عجب خوبصورت نظم ہے۔

میں نے محبت اور مذہب کے دو کلیدی مسائل پر مجموعے کی پہلی دو نظموں کا تفصیلی جائزہ اس لئے لیا ہے کہ آپ بقیہ نظموں سے سرسری نہ گزریں اور نظم پڑھنے کے آداب سے واقف ہو جائیں۔ سلیم احمد ایک سوچ بچار کرنے والے نہایت سنجیدہ شاعر ہیں اور پڑھنے والوں سے سنجیدگی کے طلب گار۔

خاص کر مندرجہ ذیل نظمیں بہت غور طلب ہیں اور خیال اور اظہار کی تازگی کے باعث انمول:

(1) جن:——

کچھ لوگوں پر لفظ آتے ہیں
وہ جو کچھ بھی کہتے ہیں
اپنے آپ نہیں کہتے
لفظ ان سے کہلاتے ہیں

"لفظ آنا" قطع نظر اس کے کہ یہ انوکھا پیرایہ اظہار ہے' یہ نہ بھولنا چاہئے کہ یہ "لفظ اترنے" سے الگ بات ہے۔ "لفظ اترنے" میں سوچنا اور دکھ اٹھانا شامل ہے یعنی سوچتے سوچتے اور دکھ اٹھاتے اٹھاتے ایک ایسی وجدانی کیفیت کا طاری ہونا کہ لفظ اترنے لگیں۔ "لفظ آنا" ایک طرح کا Forced عمل ہے یعنی جس پر لفظ آ رہا ہے اس کے یہاں کوئی اشتعال پذیری یا برا نگیختگی نہیں۔ ظاہر کی کوئی قوت باطن پر جبر کر رہی ہے۔ اور دونوں میں کوئی ہم آہنگی اس لئے نہیں ہے کہ بارش کے قطرے کو قبول کرنے والی سیپی

نے اپنی آغوش وا نہیں کی۔ خیال واحساس کے موتی پر آب کیسے آئے۔

(2) ایک خط:——

میں کتنا سنگ دل ہوں
جو تری جنت پہ خوش ہوتا نہیں
دوزخ پہ ہنستا ہوں

یہ اس خوبصورت نظم کے آخری مصرعے ہیں۔ میں جس جنت اور دوزخ کا قائل ہوں وہ روحانی یا ذہنی کیفیتیں ہیں۔ یہ اپنی ہی ذات کے خیروشر کی مملکتوں کے نام ہیں (سلیم احمد کا مسلک مجھ سے جدا ہے مگر یہاں اس سے بحث نہیں) جہاں تک اس نظم کا تعلق ہے سلیم احمد میرے ہم خیال ہو گئے ہیں۔ کسی بھی روحانی رشتے کی معراج یہ ہو گی کہ دوسرے کے دیے ہوئے دکھوں سے بھی ایسی محبت ہو جائے جیسی سکھوں سے۔ یہ کہ گل وصال و گل فراق دونوں کی خوشبو جاں معطر کرے۔ یہ نظم ہم آہنگی کی اسی طلب سے طلوع ہوئی ہے اور یہی 'نیند' 'اسٹیشن' 'کونپل' 'بچے' دشت وغیرہ کی زرخیز امیجری سے عجب طرح کی پیچ داری اور تازگی لئے ہوئے اپنے آپ سے سوال کرتی ہوئی ختم ہوئی ہے۔ پھر کئی جگہ بریکٹ کا استعمال یوں ہوا ہے جیسے ہمزاد بیچ میں ٹوک کر بتائے کہ دیکھو تم یہ کہنا بھول گئے تھے —— Association of Thoughts سے بھی شاعر غافل نہیں ہے مثلاً ان مصرعوں:

"کہ جیسے شوخ بچے
ہاتھ اور دامن چھڑا کر
گھر سے باہر بھاگ جائیں"

کے فوراً بعد آس پاس کی گزرگاہوں پر سو جانے والے بچوں کا ذکر اور اس ذکر کا دکھ۔ یا اس مصرعے:

"اور روح میں غم ہو تو آنسو بھی"

جیسے یکایک "آنسو" کے لفظ کے یاد آتے ہی شاعر کو اپنی پیاسی آنکھوں کا خیال آئے کہ اگلا مصرع ہے:

"مجھے آنسو نہیں ملتے، نہیں ملتے، نہیں ملتے"

(3) راکھ:——

ساری عمر کے سفر کی کہانی یہ ایک لفظ "راکھ" —— نظم کے اختصار نے آخری مصرعے "میں اس راکھ کو اپنے چہرے پہ مل کے کھڑا ہوں" کو سان دی ہے۔

(4) سفر:——

پہلے مصرعے سے آخری مصرعے تک شاعری کی لے نہیں ٹوٹی۔ بانکی نظم ہے، خاص کر آخری مصرع پوری نظم کے گرد ایک حصار بناتا ہے۔ خوبصورتی اس نظم کی یہ بھی ہے کہ مسلسل سفر میں کہیں تھکن نہیں ہے۔

(5) ایک رات:——

اپنے محبوب کے لئے جان دینے کی تمنا کوئی بہت نئی یا اہم بات نہیں ہے۔ (جان دینا بڑی بات ہے) مگر یہ کہنے کے لئے بڑا حوصلہ اور شاعرانہ ہنرمندی درکار ہے:

دعا مانگی تھی میں نے تیرے مرنے کی

فرض کیجئے "تیرے" کے معنی "خدا کے" ہوں تو؟ یہ ایک انوکھا مذہبی تجربہ ہو گا۔ یہ تو دیکھئے کہ دعا کس سے مانگی جا رہی ہے (سلیم احمد مجھے معاف کریں)

(6) ایک دروازے پر:——

ذات کی نفی پر ایک تازہ اور پرکار نظم ہے۔ اناؤں کے گھنے جنگل میں بھٹکتے ہوئے آدمی کا اپنی انا سے ستیزہ کار ہو جانا اپنے آپ کو پہچاننے کی کوشش ہے (ستیزہ کاری میں نے اس لئے لکھا ہے کہ "میں" کی چنگیزی قوت کا احساس ہی جنگ کی ابتدا ہے)

(7) الجھی سانسیں:——

ان مصرعوں کا کرب اور جلال دیکھئے:

"داغ جو روح پہ ہیں
جسم پہ ہوتے تو مجھے
لوگ جلتا ہوا اک شہر سمجھتے"

(8) دس برس:——

آیئے سلیم احمد کے ساتھ ہم بھی اداس ہو جائیں:

"میں نے سوچا کہ جب / تیری اس محفل شب میں، میں ہی نہیں ہوں تو پھر /

تیرے دل کے دھڑکنے کے انداز/آنکھوں کے جھکنے کی اس کیفیت/اور میٹھی ہنسی کی حلاوت کو یوں یاد کرنے سے کیا فائدہ/وقت میرا نہیں۔

(9) میرا دشمن (10) لکیریں (11) سورج (12) گراموفون (13) کہاں (14) سورج کی بیماری۔

میں نے اس مجموعے کی دو نظموں کا تفصیلی مطالعہ کر دیا ہے اور آٹھ نظموں کے بعض محاسن کی طرف ضمنی اشارے کر دیے ہیں اور چھ نظموں کے نام اوپر لکھ دیے ہیں۔ یہ سولہ نظمیں مجھے پسند آئیں۔ ہم عصروں کے بیشتر مجموعوں میں اتنی بہت سی اچھی نظمیں نہیں ملیں گی۔ سلیم احمد کو مطمئن ہو جانا چاہئے۔ جو پچیس نظمیں مجھے پسند نہیں آئیں ان کی اہمیت اس لئے ہے کہ ان کے وسیلے سے شاعر کے کئی رویوں کو سمجھنے میں مدد ملے گی' یوں میری ناپسندیدگی کے اسباب مندرجہ ذیل ہیں:

(1) کاتا اور لے دوڑے (2) شعری جوہر کی کمی (3) سپاٹ لہجہ (4) جو چیز بہتر نثر میں لکھی جا چکی ہے اسے کم تر نظم میں دہرایا گیا۔ ازرا پونڈ تک کی بات سنی ان سنی کر دی (5) اخبارات کے تراشے کو جوں کا توں نظم کر دیا (6) گہرائی کا فقدان (7) اکہرے پن کی بہتات (8) نعرے بازی (9) رجعت پسندانہ رویہ جس کا مذہب سے کوئی تعلق نہیں (جیسے چاند والی نظم) (10) خدائی فوج داری وغیرہ۔

آپ سے درخواست یہ ہے کہ آپ میرے Prejudices اور Reservations کا خیال نہ کریں اور ان نظموں کو بھی اس طرح پڑھیں کہ مجھ سے اختلاف کی گنجائش نکل سکے۔

چونکہ میں سلیم احمد کی غزلوں اور قطعوں پر' ایک خط نما مضمون میں' اظہار خیال کر چکا ہوں اس لئے اپنے آپ کو دہرانا نہیں چاہتا کہ اپنی آواز سننا دیباچہ نگار کے فرائض میں نہیں ہے۔ یہاں آپ سے صرف اتنا کہنا چاہتا ہوں کہ خواہ آپ کلاسیکیت سے شغف رکھتے ہوں یا جدیدیت سے مگر ایسے شعروں کی حسن کاری اور تہہ داری سے آپ بے نیازانہ گزر جائیں گے تو آپ کو معاف کرنا مشکل ہو گا:

(1) کس انجمن گل کی لگن ہے کہ چمن میں
نکلا ہی نہیں پاؤں نسیم سحری کا

(2) زہر ہے میرے جام میں' ہونٹوں پہ آ گئی ہے جاں
ذائقہ حیات سے اینٹھ گئی مری زباں

(3) تری کشش سے ترے گرد رقص شوق میں ہوں
جو قرب سے نہیں گھٹتا وہ فاصلہ ہوں میں

(4) پھر اس کے بعد کئی راستے کئی گھر تھے
وہ موڑ تک مجھے رک رک کے دیکھتا آیا

(5) رات کو خالی مکانوں میں دیے جلتے ہیں
جانے کون آتا ہے شب بھر کو ٹھہرنے کے لئے

(6) رات بھر پرچھائیوں سے جنگ کی
میرا دشمن ایک مٹی کا دیا

(7) جانے کس رات کوئی نیند کی مانند آ جائے
چشم بے خواب ہے دروازۂ امکاں کی طرح

(8) باد بہار شوق نے پھول نئے کھلا دیے
روح کی تازگی نہ پوچھ سارا بدن نیا ہوا

(9) تو گرم رات میں ٹھنڈی ہوا کا جھونکا تھا
ذرا قریب سے گزرا تو نیند سی آئی

(10) تجھے میں اپنی محبت سے ہٹ کے دیکھ سکوں
یہاں تک آنے میں مجھ کو کئی زمانے لگے

میں سلیم احمد کی حد سے بڑھی ہوئی کلا سکیت کو شک اور شبہ کی نظر سے دیکھتا ہوں مگر مندرجہ بالا شعروں میں اتنی جادوگری اور احساس کی ایسی سچائی ہے کہ مجھے بھی تزکیہ ذات کا خوشگوار احساس ہوا ہے اور میری سنگ دلی موم کی طرح پگھلی ہے۔

ان شعروں کے علاوہ غزل "تو دن کی طرح نکل رہا تھا" مجھے بے طرح پسند آئی۔ لہجے کے آہنگ میں دھوپ کھلنے کی کیفیت ہے۔ مصرعوں میں قید موسیقی سے یہ بھی کھلتا

ہے کہ دکھ کے بیان میں آواز کا لجلجا ہونا ضروری نہیں ہے۔

میں سلیم احمد کا شکر گزار ہوں کہ انہوں نے مجھ سے دیباچہ لکھوا کر مجھے عزت بخشی اور اظہار رائے کی آزادی دی۔*

ساقی فاروقی

لندن 23 مئی -1980ء

* سلیم احمد کی کتاب "اکائی" کا دیباچہ جو مرحوم نے بوجوہ مجموعے میں شامل نہ کیا۔ انہوں نے اسباب بتائے تو مجھے ان سے کوئی شکایت نہ رہی —— ساقی

ایک ہم عصر سے

کچھ "ایک ہم عصر سے" کے بارے میں

1971ء میں یہ خط نما مضمون لکھ کر میں نے شمس الرحمٰن کو بھیج دیا تھا۔ ان کی بڑائی یہ کہ انھوں نے پڑھ کر ردی کی ٹوکری میں نہیں پھینکا بلکہ شہریار اور مغنی تبسم کے رسالے "شعروحکمت" میں چھپنے کے لئے بھیج دیا۔ افسوس کہ اس رسالے کی اشاعت بند ہو گئی۔ میں بھی بھول بھال گیا۔ مگر اس سال مغنی تبسم یہاں آئے تو پھر اس کا ذکر چلا۔ مغنی نے بتایا کہ یہ مضمون ان کے پاس محفوظ ہے۔ میں نے کہا مجھے بھیج دو۔ یہ اپریل 84ء کا قصہ ہے۔ جولائی میں یہ مضمون مجھ تک دوبارہ پہنچا۔ پڑھا تو کھلا کہ جن مسائل پر شمس الرحمٰن سے گفتگو کی تھی اس کے مخاطب دوسرے ہم عصر زیادہ ہیں چنانچہ اسی باعث اسے شائع کیا جا رہا ہے۔

اس مضمون کو پڑھتے وقت ایک بات خاص طور سے دھیان میں رہے کہ پچھلے 13 برس میں نہ صرف یہ کہ ہمارے درمیان محبتیں بڑھی ہیں بلکہ شمس الرحمٰن کا ادبی قد بھی بہت بڑھا ہے۔ اب مجھے یہ کہنے میں کوئی ہچکچاہٹ نہیں کہ خوش قسمت ہے وہ زبان جس میں شمس الرحمٰن فاروقی جیسے لوگ نثر لکھ رہے ہیں۔

ساقی فاروقی

11 اگست 1984ء

پہلی مئی 71ء

پیارے شمس الرحمٰن،

تمہیں میری نئی نظموں سے اردو شاعری میں ایک الگ Trend کا احساس ہوا، میری محنت ٹھکانے لگی۔ مگر ابھی تو ابتدا ہے۔ میں یہاں کے احمق اردو زادوں کی بات نہیں کرتا مگر مجھ جیسے تنہا اردو شاعروں کی زندگی ایک یورپی شاعر کی زندگی سے زیادہ Complex ہے یعنی اس کے مسائل وہ ہیں جو یورپی شاعر کے ہیں Plus وہ مسائل بھی جو ہندوستانی اور پاکستانی اردو شاعروں اور اردو شاعری کے ہیں۔ میری تلاش دہری ہے اور مجھ پر اس حرافہ، جسے زندگی کہتے ہیں، کے وار دہرے ہیں۔ میرے زخم جگر نہ دیکھو کہیں اس قتالہ کے دست و بازو کو نظر نہ لگے۔

ایک خوشگوار بات میرے ساتھ یہ ہوئی کہ میں اس زوال پسند اور دینار پرست معاشرے کو نفرت اور حقارت کی نظر سے نہیں دیکھتا۔ نہ ہی بلندی سے۔ میں اس سے الگ نہیں ہوں۔ اس میں جذب ہو گیا ہوں اور پلان بنا کر نہیں۔ آپ ہی آپ۔ میرا کراچی کا ایک مصرع ہے: میں اپنی آنکھوں سے اپنا زوال دیکھتا ہوں۔ یا لندن میں بس جانے کے بعد میں نے لکھا:

مجھے عزیز تھا ہر ڈوبتا ہوا منظر
غرض کہ ایک زوال آشکار میں بھی تھا

میری تعمیر میں خرابی کی صورت کچھ زیادہ ہی مضمر ہے۔ یعنی ۔ میں بہت تیز چلا اپنی تباہی کی طرف۔ موتی لانا آسان نہیں۔ سمندر میں ڈوبنا ہی پڑتا ہے۔ رات اپنے رکارڈ پلیئر پر Joan Baez (ایک امریکی مغنیہ جس کی ہر تان دیپک ہے) کا ایک نغمہ جسے پاپ نغمہ نگار Bob Dylon نے لکھا ہے، سن رہا تھا۔ ایک مصرعے نے بہت ہراساں کیا۔

.....But what ever you wish to keep, you better grab it fast.

دیکھنا یہ ہے کہ میں اپنے اندر کتنا اتار سکتا ہوں اور اظہار کی طاقت کتنی ہے۔ میں خسرو سے لے کر جدید تر لڑکے لڑکیوں تک، سب کو الٹ پلٹ کر دینا چاہتا ہوں اور CANTERBURY TALES سے لے کر تازہ ترین امریکی مصرعے:

A testicle a day keeps the doctor away.

کو بالکل اتھل پتھل کر کے دیکھنا چاہتا ہوں کہ ہوا کیا ہے اور جانا کدھر ہے۔ راہ کٹھن ہے اور تخلیقی تنہائی کا احساس شدید۔ سلیم احمد کے بعد تمہاری ذات سے یہ احساس کچھ کچھ زائل ہو سکتا ہے۔ تم مجھ سے عمر میں دس مہینے بڑے ہو (میں 21 دسمبر 36ء کی پیداوار ہوں) مگر ادبی عمر میں مجھ سے پان سات سال چھوٹے ہو۔ یعنی 1963ء میں جب میں نے کراچی سے لندن کے لئے ہجرت کی اس زمانے میں شاید تم نے رسالوں میں لکھنا شروع کیا ہو گا۔

تم سے اور سلیم احمد سے محبت اس لئے ہے کہ تم دونوں لڑنا جانتے ہو۔ الیٹ اور پونڈ جب لندن میں ملے تو ہوا یوں کہ انگریزی کی بہت سی نظمیں طویل اور بے ہنگم ہونے سے بچ گئیں۔ کتربیونت کے شہنشاہ اعظم نے الیٹ کو ہمیشہ شکر گزار کیا' دوسری طرف THE LOVE SONG OF J. A. PRUFROCK کے بغیر پونڈ کی مشہور نظم —— HUGH SELWYN MAUBERLY کا تصور محال ہے۔ صرف عنوان کی مشابہت ہی نہیں بلکہ AIKEN کے الفاظ میں (AIKEN جسے پونڈ نے ایک خط میں لکھا تھا

Jesus God, Aiken, you poor blithering ass.)

دونوں عنوانات میں "Twentieth Century quotidian comic character" موجود ہیں۔ کہنا یہ چاہتا ہوں کہ ان دونوں شاعروں کو ایک دوسرے کی ذات نے اٹھایا۔ تخلیقی تنہائی بڑی عذاب ناک چیز ہے جبھی تو الیٹ سے مل کر ایک مستی کے عالم میں پونڈ نے "POETRY" کی مدیرہ مس مزو کو لکھا:

He is the only american I know of who has made what

I can call adequate preparation for writing.

He has actually trained himself and modernized himself

on his own.

اسی کے ساتھ ساتھ اس زمانے کے جدیدیوں پر پھبتی دیکھو ——

Most of the promising young.... معاف کرنا اس نے اور زیادہ خطرناک بات لکھی ہے MOST نہیں اس نے تو The rest of the promising young لکھا

ہے۔ ہاں تو پورا جملہ دیکھو اور پونڈ کا غصہ بھی:

The rest of the promising young have done.
one or the other but never both (most of the
swine have done neither)

اور پھر الیٹ کی طرف واپس آتے ہوئے لکھا:

It is such a comfort to meet a man and not to have
to tell him to wash his face, wipe his feet and
REMEMBER the date on the calender,

ایک بات اہم ہے دونوں کے یہاں REJECTION مکمل ہے۔ تمہیں اتنا گھمایا پھرایا اس لئے ہے کہ تمہارے یہاں REJECTION ابھی نامکمل ہے۔ اسی لئے تمہاری بہت سی گرہیں کھلتے کھلتے رہ جاتی ہیں۔ تمہاری نثر اور تمہاری آرا سے اختلاف کیا جا سکتا ہے مگر تمہارا استدلال تخلیقی ہے۔ اسی لئے میں تمہاری تنقید کو تخلیقی کہوں گا۔ تمہاری نثر میں سارتر والا PATHOS عنقا ہے (سارتر کی آپ بیتی "WORDS" میں شکست کا احساس اور بڑھ گیا ہے مثلاً:

for a long while I treated my pen as a sward;
now I realise how helpless we are ....culture
saves nothing and nobody, nor does justify.

مگر تمہارے قلم میں حساب داں کی ہنرمندی مضمر ہے۔ تم رسل سے قریب ہو حالانکہ رسل جیسی خوبصورت نثر تم کبھی نہیں لکھ سکو گے (سارتر کی آپ بیتی کے بعد رسل کی آپ بیتی The Autobiography کے یہ جملے دیکھو:

The holiday from responsibility is really
delightful, so delightful that it almost
outweighs everything. ——I am not so great
as that, really not——I know where peace is
——I have seen it, and felt it at times——

but I can still imagine mis fortunes that would rob me of

peace.)

جیسا کہ میں نے کہا تمہارا استدلال تخلیقی ہے۔ تم سے اختلاف کرنے کی بہت گنجائش ہے۔ مگر تمہیں نظرانداز نہیں کیا جا سکتا۔ تم کہ نثر میں اتنا صاف ذہن رکھتے ہو موضوعات کے SELECTION میں احتیاط نہیں برتتے۔ نوح ناروی اور عظیم احمد آبادی یا احمد عظیم آبادی پر اسی صبر اور خاطر جمعی سے لکھتے ہو جس طرح غالب اور سارتر پر۔ کیوں اپنا وقت ضائع کرتے ہو۔ زندگی تیز رفتار ہے وقت کم ہے۔ لوگوں کے ہجے اور املا درست کرنے کا کام اردو استادوں کے سپرد کرو۔ ایمجسٹ شاعروں کا سب سے بڑا نقص یہ تھا کہ خدا اور ماچس دونوں کو یکساں TREAT کرتے تھے (اس سے اپنے پونڈ صاحب بھی نہیں بچے) تم پہلے تو ایک بوگس کتاب کو شروع سے لے کر آخر تک پڑھتے ہو پھر 2 صفحے اس پر ضائع کرتے ہو کہ صاحب بوگس ہے' بڑی بوگس ہے' لاحول ولاقوۃ بہت ہی بوگس ہے۔ بھلے آدمی اچھی کتاب پہلے ہی صفحے سے پکارنا شروع کر دیتی ہے کہ میں اچھی ہوں۔ دنیا میں ہزاروں زبانیں ہیں۔ اور آئے دن ہزاروں اچھی کتابیں چھپ رہی ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ تم اور میں ہر دن اور زیادہ جاہل بنتے جاتے ہیں۔ شرمندہ ہونے کی ضرورت نہیں یہ ہماری تقدیر ہے۔ ہفتے میں ایک اچھی کتاب ختم ہو جائے تو سمجھو قسمت کے دھنی ہو۔ اور تم سے زیادہ بہتر طور پر (دس بیس ادیبوں کو چھوڑتے ہوئے) آج اردو کے لکھنے والوں میں بھلا کون جانے گا کہ ہر اچھی تحریر وار کرتی ہے۔ قبضے کی کوشش کرتی ہے۔ پڑھنے والے کو (اگر وہ سوچنے والا بھی ہو) چوکنا رہنا چاہئے اور صرف اپنے تجربے کی کسوٹی پر پرکھ کر دوسرے کے تجربے کو قبول یا رد کرنا چاہئے۔ میں کہ پونڈ کا بہت قائل ہوں۔ اس کی 1/2 شاعری اور 1/4 نثر کو TRASH جانتا ہوں۔ یہ باتیں تمہیں پونڈ صاحب کی A.B.C. OF READING میں نہیں ملیں گی۔ وہ یورپی اور امریکی AUDIENCE کے لئے لکھی گئی ہے۔ جن کتابوں کو پڑھ کر انگریز یا فرانسیسی یا جرمن یا اطالوی شاعر اپنی تیاری کرتا ہے ان کا نام جانے بغیر بھی اردو شاعر بڑی شاعری کر سکتا ہے۔ اسے اپنی تیاری ہندوستان اور پاکستان میں بیٹھ کر کرنی چاہئے۔ اپنے ماضی' اپنی مٹی' اپنی زبان اور اپنے مسائل میں۔ اور سب سے زیادہ اپنی ذات میں۔ اس کا مطلب یہ ہرگز

نہیں ہے کہ دنیا کے ادب میں جو کچھ ہوا ہے یا ہو رہا ہے اس سے آدمی آنکھیں بند کر لے۔ اگر اس نے ایسا کرنے کی کوشش کی تو جوش یا جگر یا ساحر لدھیانوی کی طرح مارا جائے گا۔

۔ اک شہنشاہ نے دولت کا سہارا لے کر (ساحر)

یا

۔ کیا اسیری ہے کیا رہائی ہے (جگر)

یا

۔ نامرد قوم میں مجھے پیدا کیا ہے کیوں (جوش)

یہ سب اپنی نامردی یا کم علمی کا اعتراف ہے۔ ان مصرعوں کی پہنچ کالج کے لڑکوں اور مشاعرے کے کلرکوں اور دکانداروں اور اردو پڑھانے والے استادوں تک ہے۔ اب ایسے لوگوں کے مصرعے دیکھو جنہوں نے تازہ ہوا اور روشنی پر اپنے گھر کے دروازے بند نہیں کئے۔

۔ ہاتھ سے آنکھوں کے آنسو تو نہیں پونچھے تھے (میرا جی)

یا

۔ کنول کی چٹکیوں میں بند ہے ندی کا سہاگ (فراق)

یا

۔ ایک سسکی ہوا میں بجتی ہے (ساقی فاروقی)

میں تمام اچھے یا تمام برے شاعروں کے مصرعے لکھنے نہیں بیٹھا۔ ہم عصروں میں بے شمار شاعر اچھے مصرعے کہتے ہیں۔ تم سب سے واقف ہو۔ نام گنانے کا یہ موقع نہیں۔ میرا جی اور فراق کے ساتھ اپنا مصرع اس لئے نہیں لکھا کہ ان کے برابر ہونے کا دعویٰ ہے صرف یہ جتانے کی خواہش تھی کہ چھوٹا موٹا بیدار آدمی ہوں اور میرا جی اس لئے برا نہیں مانیں گے کہ ہم میں نہیں ہیں اور فراق اس لئے خفا نہیں ہوں گے کہ انہی کے شہر کا ہوں۔

تم سے ایک اور بات بھی کہنی ہے۔ تم جس جس نئے ادیب اور شاعر سے واقف ہوتے جاتے ہو یا واقف ہو (میرا اشارہ بیرونی ادیبوں کی طرف ہے) ان کی اچھی باتیں اور

ان کے تجربات اردو کے جدیدیوں تک پہنچانے کی کوشش کرتے ہو کہ شاید اسی طرح یہ بدنصیب پڑھنے لکھنے لگیں۔ میں اس کی قدر کرتا ہوں۔ مگر ایک اندیشے کی طرف تمہاری توجہ مبذول کرانا چاہتا ہوں۔ ایسا نہ ہو کہ اس نئی نسل کو
INFERIORITY - COMPLEX کا گلو بند مہیا کرنے والوں میں تمہارا نام بھی آ جائے۔ مادام دی بوار نے فارسی پڑھ کر فرانسیسی میں لکھنا نہیں شروع کیا نہ آڈن صاحب نے عربی کی تعلیم حاصل کر کے انگریزی میں لکھنا شروع کیا۔ ہر شخص اپنے ادب کے آئینے کے سامنے کھڑا ہوتا ہے۔ آئینہ صاف نہ ہو تو اپنا قد بڑا معلوم ہوتا ہے اور صیقل ہو تو اپنے بونے پن پر شرمندہ ہوتا ہے اور حوصلہ ہو تو اپنا قد بڑھانے کی کوشش کرتا ہے ورنہ آئینے کو منہ چڑاتا ہے۔ رکھے ہوئے تھا آنکھ پہ تابوت میں انگلی' لکھتا ہے' خون تھوکتا ہے اور مرجاتا ہے۔

تم نے انگریزی میں ایم ۔ اے کیا۔ بڑا اچھا کیا۔ ظاہر ہے جو تم نے پڑھا ہے اس کا اظہار بھی کرو گے۔ یہی صحت مند رویہ بھی ہے ورنہ بے چارے اثر لکھنؤی نے بھی انگریزی میں ایم ۔ اے کیا تھا جنہیں شیکسپئر نے ایسا لقوہ مارا کہ میر کی ایک پسلی توڑ کر اس بے چارے میں سما کر بیٹھ گئے۔ اور میر درد سے ساری عمر لقا کبوتر کی طرح لوٹتا رہا۔ جب آغا حشر کاشمیری کے ''توفیق کس حال میں ہے''؟ —— ''شیر لوہے کے جال میں ہے'' کی لوبانی خوشبو ہی میں مست رہتا تھا تو سیزر کی لاش پر مارک انٹونی کی تقریر

("But were I Brutus,:

....

Would ruffle up your spirits, and put a tongue

In every wound of ceasar, that should move

The stones of rome to rise and mutiny.")

کا لخلخہ سونگھنے کی کیا ضرورت تھی۔ مگر اردو نئی نسل کو صرف بودلیر' کافکا اور الیٹ سے شرمندہ نہیں ہونا چاہئے۔ شرمندہ کرنے کے لئے غالب' اقبال اور کالیداس کچھ کم نہیں۔ اگر چوسر صاحب یونانی کومیڈی کے خوف سے ہاتھ پیر توڑ کر بیٹھ جاتے تو انگریزی زبان ہی تخلیق نہ ہوتی۔

ہر زبان بنتے بنتے بنتی ہے۔ جس زبان میں آدمی لکھ رہا ہے اگر اس زبان ہی کے سلسلے میں COMPLEX میں مبتلا ہے تو کیا خاک لکھے گا۔

دوسری زبان کبھی دلاسا نہیں دے گی۔ اگر تحریر میں جان ہے تو دنیا کالی داس کا ترجمہ بھی کرے گی اور ٹیگور کو نوبل پرائز بھی دے گی۔ لونڈوں میں جا کر ڈنڈ پیلنے کی کیا ضرورت ہے۔ لڑکی وہ جو لڑکیوں میں کھیلے۔

19 مئی 1971ء

یہ خط تمہاری کتاب پڑھ کر لکھنا شروع کیا تھا۔ کوئی 3 ہفتے بعد آج تمہارا ایک اور بہت خوبصورت خط ملا تو اپنے لکھے ہوئے خط کو دوبارہ پڑھا۔ سوچا تھا کہ "گنج سوختہ" پر گفتگو ہو گی' معلوم ہوا کہ سوائے تمہارے کتاب کے اور ہر مسئلے پر بات چیت موجود ہے۔ ارادہ تھا کہ تم سے بہت نجی قسم کی باتیں کی جائیں' کھلا کہ تمہارے سوا باقی تمام نسل سے مخاطب ہو گیا ہوں۔ یہی نہیں میری زیر تحریر کتاب "ہدایت نامہ شاعر" کے کئی مسائل اس خط میں در آئے ہیں۔ چلو اس میں بھی کیا مضائقہ ہے۔ مگر آج کی نشست تمہارے لئے مخصوص ہے۔

(1) تمہاری کتاب کا نام دقیانوسی ہے۔ ہر چند کہ اس میں معانی کی تہیں ہیں لیکن محمد بادشاہ اور STEINGASS کی بیساکھیوں کے باوجود اس میں ایک طرح کا CLICHE ہے۔ یہ تمہارے نیم کلاسیکی مزاج کی وضاحت ضرور کرتا ہے مگر تمہارے اندر کے غالب تر رجحان جدیدیت کی نفی کرتا ہے۔ اور تمہارے کلام سے منصفی نہیں کرتا۔ تمہاری اگلی کتاب کا نام میں رکھوں گا۔

(2) کتاب کا نام ہی نہیں دیباچہ بھی میں لکھوں گا۔ اس لئے کہ ن۔ م۔ راشد نے بڑی بددیانتی سے باتیں کی ہیں اور خواہ مخواہ بھٹکانے کی کوشش کی ہے۔ انہیں نظم اور بہت اچھی نظم لکھنے کا سلیقہ ہے۔ مگر جب بھی انہوں نے نثر لکھی یا لکھنے کی کوشش کی ہے غصہ کھایا ہے۔ ان سے میرے بڑے دیرینہ مراسم ہیں اور ہم دونوں ایک دوسرے کو پسند بھی کرتے ہیں مگر ان کی نثر والی شخصیت بے اعتبار ہے۔ انہیں ڈرنے کی کیا ضرورت ہے مگر کئی سال سے انہیں اپنے شاعرانہ مستقبل کا ہوکا لگ گیا ہے۔ ہر تحریر میں وہ اپنا

بچاؤ پہلے کرتے ہیں۔ دوسری باتیں بعد میں۔

"لامساوی انسان" کا دیباچہ ہی لے لو۔ فیض پر اتنے سطحی انداز میں لے دے ہوئی ہے کہ کالج کے وہ تین لڑکے بھی شرمندہ ہوئے ہوں گے۔ پہلے تو انہیں سوال بنا بنا کے دیے اور جب انہوں نے یتیمانہ لہجے میں ان سوالوں کو دہرایا تو ایسا کڑکے برسے ہیں کہ میخانہ ہی ڈوب گیا۔ اس سب کے پیچھے وہی بانجھ ہو جانے کا خوف کہ نام کیسے چلے گا۔ (ارے راشد صاحب آپ کو گھبرانے کی کیا ضرورت ہے۔ ان دنوں آپ پتا مار کر اگر بری بری نظمیں لکھ بھی رہے ہیں تو کیا۔ آپ نے جو کام کیا ہے اسے نئی نسل نظرانداز نہیں کر سکتی۔ فیض کو ڈس مس ہو جانے کا خوف ہو تو ہو کہ ان کی سریلی بانسری سر سرانے لگی ہے۔ آپ بے وجہ ہی بدحواس ہوئے جا رہے ہیں۔)

تمہاری کتاب کے دیباچے میں بھی ان کی کوشش یہی ہے کہ اپنے کھوئے ہوئے گاہک واپس لے لیں۔ صرف تمہاری نظمیں ایسی دنیا کا ذکر نہیں کرتیں "جو ثابت و سالم بھی ہے اور ہموار بھی، صرف انسان اس کے اندر فریب خوردہ ہے ---- انسان اس دنیا میں اتنا گھرا ہوا ہے کہ تنہا رہ نہیں سکتا لیکن اس نے تنہائی اپنے اوپر طاری کر رکھی ہے" بلکہ نئے پرانے بہت سے شاعروں کے بارے میں یہ رائے دی جا سکتی ہے اور میں تو یہ کہوں گا کہ اگر اسی ABSTRACT انداز میں گفتگو کرنی ہے تو دنیا کے ہر جدید شاعر کے دیباچے میں یہ سب کچھ لکھا جا سکتا ہے۔ پھر یہ کیا CLICHE ہے کہ شاعر کی طرف "موضوعات خود بخود کھنچے چلے آتے ہیں۔" خود بخود نہیں آئیں گے تو کیا انہیں رسی سے باندھ کے کھینچا جائے گا یا راشد صاحب کی طرح عجمی تراکیب کے بانسوں پر چڑھا کر انہیں گھسیٹا جائے گا۔ اور آگے چلیے۔ وہ کہتے ہیں "---- اس طرح ثقیل فلسفیانہ مضامین کے اندر بھی ایک صالح مسرت کی لہر چمک اٹھتی ہے۔" مسرت کی لہر تو سمجھ میں آئی یہ "صالح مسرت کی لہر" کیا بلا ہے۔ وہ شاعری میں تو اسم صفت کا استعمال قدم پھونک پھونک کر کرتے ہیں جو ایک اچھے شاعر کا شیوہ ہے مگر نثر میں ان کی سخاوت گمراہ کن ہے۔ راشد صاحب کہتے ہیں کہ تمہاری نظموں میں "جانے پہچانے مفروضات کے علاوہ اساطیر یا مذہبی تصورات کا ذکر بھی ملے گا لیکن یوں نہیں کہ شاعر ان میں کسی کو شک کی نظر سے دیکھ رہا ہو یا ان کی کوئی نئی قیمت مقرر کرنے کی کوشش کر رہا ہو۔" یہ بیان محل نظر ہے۔ شک کی

نظرسے تم بے شک نہیں دیکھتے (اور یہ کوئی خوش ہونے کی بات نہیں) مگر نئی قیمت مقرر کرنے کی کوشش بہرحال تمہارے یہاں ہے۔ یہ کوشش کامیاب ہے یا ناکام یہ الگ بحث ہے۔ تعجب ہے راشد صاحب نے ایسی بات کہی۔ مگر آگے چل کر تو کمال ہی کر دیا ہے' ان کے خیال میں تمہارے یہاں بعض دوسرے شاعروں کی زبان کی گونج بھی ملتی ہے۔ وہ اتنا کہہ کر خاموش ہو جاتے تو کوئی شکایت نہیں تھی اس لئے کہ تمہاری پہلی کتاب ہے اور ظاہر ہے کچھ ہم عصروں اور کچھ پرانوں (خاص کر غالب) کی گونج سنائی دیتی ہے مگر مشکل یہ ہے کہ انہوں نے دو رومانی شاعروں کی گونج سن لی ہے تمہارے کلام میں۔ خود راشد تک کی گونج تو تمہارے یہاں ملتی ہے (مثلاً۔ جس طرح حبشی حسینہ کے ڈھلے' یا۔ آبنوسی جسم کے اعصاب میں' یا۔ اژدر آسودہ خاطر کو جگائے' یا۔ مجھے مینار کی کھڑکی سے جھک کر ------ وغیرہ وغیرہ' مگر فیض کے بناؤ سنگھار اور کیٹس کی حزنیہ بیانیہ دردیلی آواز کا پرچھاواں تمہارے یہاں نہیں۔ اچھا یاد آیا۔ کیٹس پر ایک نئی کتاب آئی ہے۔ ظاہر ہے کہ مجھے کیٹس پر کتاب پڑھنے کی فرصت نہیں۔ "نیو اسٹیٹس مین" میں تبصرہ پڑھا تھا۔ تازہ دریافت یہ ہے کہ موصوف ساری عمر سوزاک کے المناک مرض میں مبتلا رہے۔ اس سے ان کی الم انگیز شاعری کو سمجھنے میں مدد ملے گی تمہیں۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ تم بھی کسی ایسی ہی خطرناک بیماری میں مبتلا ہو اور کسی خط میں راشد صاحب سے اس کا ذکر کر دیا ہو اور یوں انہوں نے کیٹس سے تمہارا رشتہ ڈھونڈ لیا ہو۔ اگر ایسا ہے تو مجھے فوراً لکھو۔ پانچ دن کا نسخہ ہے ٹیڑاسائکلین کی 15 گولیاں مفت بھیج دوں گا۔ اور کہو تو کیٹس کے مکان میں جا کر راشد صاحب کے لئے دعا کروں۔ اس کا مکان میرے مکان سے پندرہ منٹ کے فاصلے پر واقع ہے۔ مگر راشد صاحب کی آخری رائے سے میں پوری طرح متفق ہوں یعنی یہ کہ **"من عرف نفسہ"** واقعی اس مجموعے کی سب سے خوبصورت نظم ہے اور امید کرتا ہوں کہ اسی آواز کے سائے میں تم سفر کرو گے۔ اگر ایسا ہوا تو اردو کو ایک نئے اور اچھے شاعر کا منتظر رہنا چاہئے۔ مجھے تمہاری کئی اور نظمیں بہت بھلی لگیں مثلاً " --- کہ پیش آدم بر ملنگے سوار۔" اس میں آدمی کی جدوجہد' نباتات اور زمانہ سنگ سے لے کر زمانہ شکست تک' پوری قوت سے اجاگر ہوئی ہے اور یوتوشینکو کی شاعری کا ساکس بل اس میں موجود ہے۔ مگر آخری چار مصرعوں تک پہنچتے پہنچتے تمہاری سانس اکھڑ گئی ہے۔ اصل میں

آخری آٹھ مصرعے غیر ضروری ہیں۔ یہ نظم ۔ جو اندھے مکوڑے کی صورت گھسٹتا چلے ہے۔ پر ختم ہوتی تو اس کا تاثر دونا ہوتا اور تکمیل کا احساس بھی انمٹ ہوتا کاش تم نہ بڑھاتے۔ مجھے "مناجات" بھی پسند آئی اور پوری کی پوری سوائے اس انگریزی لفظ THEATRE کے تلفظ کے۔ جسے تم نے "فعولن" باندھا ہے۔ اردو میں اس کا مروجہ وزن "فعلن" ہے۔ اگر یہ فرض بھی کر لیا جائے کہ تم نے اس کا انگریزی تلفظ پکڑنے کی کوشش کی ہے تو وہ صرف دو ہیں ایک آکسفورڈ اور کیمبرج کا۔ "فعلات" یا بی۔ بی۔ سی کا "فعلن" اور کوئی تیسرا تلفظ غلط ہے۔ "شیشہ ساعت کا غبار" کا دوسرا حصہ مجھے بہت عزیز ہے۔ یہ اتنا تازہ اور نیا ہے کہ جی خوش ہو گیا۔ اصل میں تم نے دو نظموں کو ایک کر دیا ہے۔ دوسری نظم "شب برات" والے مصرعے سے شروع ہوتی ہے۔ اور خاتمے تک ایک بالکل الگ اور مکمل نظم ہے۔ اس طرح مجموعے میں ایک نظم بھی بڑھ جاتی اور دو الگ الگ اچھی نظمیں بھی ہو جاتیں۔ "ارتباط منسوخ کے مرثیہ خواں" عنوان سمجھ میں نہ آنے کے باوجود بہت اچھی لگی۔ اتنی رواں دواں، محبت سے لبالب، حجت سے پاک اور ٹھنڈی آگ سے بھری ہوئی ہے یہ نظم کہ ختم کرتے کرتے تمہاری شکست میں آدمی کو اپنی شکست کا احساس ہونے لگتا ہے۔ یہ نظم کی کامیابی ہے۔ تمہارا مصرع "چہرۂ کوہ ہے جہاں کا وہیں" اگر تم نے جان بوجھ کر لکھا ہے تو اور بات ہے ویسے "وہیں کا وہیں" بولتے ہیں۔ "گم شدہ نیش عقرب کا نوحہ" میں بھی زبان کی لڑکھڑاہٹوں کے باوجود، بے اعتباری اور فنا کی زنجیروں کی آواز سنائی دیتی ہے۔ بحر میں بھی ایسا مدوجزر ہے جو کسی مرنے والے کی اکھڑتی ہوئی سانسوں میں ہوتا ہے یعنی جلد جلد بات کرنے کا انداز جس میں یہ بھی یاد رہے کہ وقت کم ہے۔ "تین شاموں کی ایک شام" خاصی بوگس نظم ہے۔ یاد رکھو ہم سب بہت غریب ملک کے رہنے والے ہیں لفظوں کے استعمال میں سخت بخیلی درکار ہے۔ تمہیں کبھی کبھی ایک PAINTER کا برش استعمال کرنا چاہئے۔ اگر اس نظم کا عنوان ہوتا، "ایک شام" اور یہ ان تین مصرعوں میں ختم ہو جاتی:

یہ تجھ سے کس نے کہہ دیا
کہ دامن چمن میں آفتاب کو
زمیں نے دفن کر دیا

تو شفق کی طرح گلنار ہو جاتی۔ ہو نہ ہو "سنگ سوال" کو پڑھ کر راشد نے تم پر کیٹس کا بہتان لگایا ہے۔ مجھے تو اس کی رومانوی اداسی میں گرے کی دھمک سنائی دیتی ہے۔ اس کی داد تمہیں جمیلہ نے دی ہو گی۔ وہ بھی اب نہیں بلکہ جب تم دونوں نے ایک دوسرے سے تازہ تازہ محبت شروع کی ہو گی۔ جب آدمی کہتا ہے:

My love is like a red rose.

اور اب تو تم میری طرح ادھیڑ ہو چلے۔ امید ہے میٹھے میٹھے درد کے اس ماہتابی غسل کے بعد دھوپ میں جل رہے ہو گے: Burn, Baby, Burn

(3) اب کچھ تمہاری غزلوں کے بارے میں: یہ سانپ، بچھو، جناب، آسمان، یہاں تک کہ بہار، خزاں، گلستاں، چمن وغیرہم، یہ تمام ردیفیں زبان کا مزا ٹھیک کرنے کے لئے ہیں۔ اور اردو شاعری کی تاریخ دیکھو تو لکھنؤ کے بعد لاہور میں ان کا کثرت سے استعمال ہوا ہے۔ اور ان لوگوں نے کیا ہے جن کے پاس کہنے کا ذخیرہ ختم ہو گیا۔ "درخت" - "درختوں میں" والی ردیفیں سامنے کی چیزیں ہیں۔ یہ غزل کی تنگ فضا میں حبس پیدا کرتی ہے اور آدمی کی ساری توجہ ردیف برتنے پر صرف ہو جاتی ہے۔ خیال اور احساس کا گلا گھٹ جاتا ہے۔ ردیفوں میں NOUNS کا گلا مارنے کی سخت ضرورت ہے۔ PRONOUNS, VERBS اور ADJECTIVES کے علاوہ کوئی صراط مستقیم نہیں اور انہیں سے ردیف منتخب کرنی چاہئے۔ امید ہے کہ تم اپنی غزل، آب میں سانپ، گلاب میں سانپ، پر رائے مانگ کر مجھے شرمندہ نہیں کرو گے۔ مگر تمہیں شرمندہ کرنے کے لئے اس غزل پر حرف آخر کے طور پر جو شعر میں نے کہا ہے اسے سنائے بغیر چارہ نہیں:

پڑے ہیں پھن کی طرح بال اس کے ماتھے پر
حرامزادہ ملانے لگا خضاب میں سانپ

یوں تو تمہاری دو غزلیں بے شمار دوسرے لوگوں کی غزلوں کی طرح سپاٹ اور "یک بحری" نہیں ہیں مگر مجھے کہنے دو کہ On the whole ابھی کوئی ایک بھی معرکہ آرا شعر ایسا نہیں جو بڑی غزل میں ہوتا ہے۔

یعنی اسی طرح کے شعر تمہارے یہاں ابھی نہیں آئے:

چشم خوں بستہ سے کل رات لہو پھر ٹپکا

چشم خوں بستہ سے کل رات لہو پھر ٹپکا
ہم تو سمجھے تھے کہ اے میر یہ آزار گیا

یا

دل پھر طواف کوئے ملامت کو جائے ہے
پندار کا صنم کدہ ویراں کئے ہوئے

ظاہر ہے میں تم سے ایسے شعر کہنے کو نہیں کہہ رہا ہوں اور نہ ہی ان بڑوں کے آگے تمہیں ذلیل کرنے کی کوشش مقصود ہے۔ کہنا یہ ہے کہ غزل لکھتے ہوئے یہ معیار سامنے رہیں تو آدمی اپنے بہت سے شعر کاٹ کے پھینک دیتا ہے۔ مگر غزل کہنے کی ایک دوسری صورت بھی ہے۔ فضا پیدا کرنے کی کوشش اور تسلسل کا خیال' یہ بھی ایک اچھی غزل کا پیش خیمہ ہے۔ ناصر کاظمی' ابن انشا وغیرہم کا نام اس سلسلے میں لیا جا سکتا ہے اور میرا خیال ہے جدید غزل لکھنے والوں کو اس طرف خاصی توجہ دینی چاہئے تاکہ پونڈ والا " جذباتی اور انٹلکچول کمپلکس " اس میں سما سکے۔ تمہارے یہاں یہ کوشش ملتی ہے اور ایک غزل کی حد تک (موسم سنگ و رنگ سے ربط شرار کس کو تھا) بہت کامیاب۔ یہ پوری غزل بڑی بانکی ہے اور دردگساری کی کیفیت لئے ہوئے ہے۔ بچھو کے ڈنک اور سانپ کے زہر سے ڈرو اور اس طرح کی اچھی غزلوں میں اپنی منزل ڈھونڈو۔ غالب کا مارا پناہ تک نہیں مانگتا۔ نظم طباطبائی کی حجت تمام نہ کرو اور تفہیم غالب کا سلسلہ قطعی بند کرو۔ تم بیدار آدمی ہو ورنہ اب تک تمہیں غالب ہو گیا ہوتا۔ میرا خیال ہے غالب کے جتنے برے شعر تمہیں یاد ہیں اس نسل میں کسی کو بھی نہ ہوں گے۔ مجھے اس خیال سے جھرجھری محسوس ہوتی ہے۔ خدا کے لئے غالب کی زمینوں میں غزل کہہ کر اپنی ہتک مت کرواؤ۔

(4) کچھ تمہاری زبان کے بیان میں: تمہاری شعر کی زبان تمہاری نثر کی زبان سے مختلف ہے۔ ظاہر ہے مختلف ہونی چاہئے۔ مجموعی طور پر اس میں تازگی بیان اور ندرت کا احساس ہوتا ہے۔ اور اس کا پتا چلتا ہے کہ تم اپنی شعری تخلیق کے لئے جلد ہی اپنی نئی زبان کا سراغ پالو گے۔ یہ بڑی خوش آئند بات ہوگی۔

مگر صاف اور ہموار ہونے کا جو تین سو یا چار سو سالہ سفر زبان نے کیا ہے اسے

آگے لے جانے کی کوشش کرو پیچھے نہ گھسیٹو۔ مثلاً "آنکھوے" کے "ن" کو میں نے بڑی مشکل سے کاٹ کر الگ کیا تھا۔ میری پہلی کتاب میں تمہیں میرا یہ مصرع ملے گا۔ جب دل میں اکھوے پھوٹ چلے۔ سات آٹھ سال کے بعد تمہاری کتاب میں پھر "انکھوا" نظر آیا تو دل مرجھا گیا۔

۔ پھینکا کئے ہیں گرچہ ہم سنگ سوال ہر طرف۔ کی بجائے ۔ پھینکا کئے اگرچہ ہم سنگ سوال ہر طرف۔ ہوتا تو مصرعے میں صفائی آ جاتی۔ یا تمہارے مصرعے ۔ "روح ہم اس میں پھونکیں گے کوئی تراشو پیکر تم" میں "روح ہم" کا ٹکڑا بہت ناگوار گزرتا ہے۔ "ح" اور "ہ" کی دہری آواز نے ستیا ناس مار دیا ہے۔ وزن بھی غارت ہوا۔ تمہارا مصرع ہے ۔ یہ سنتے پڑھتے آئے ہیں ہے موت اک نیا سفر---- یہاں پھر "ہیں" اور "ہے" سے جی مکدر ہوتا ہے۔ تھوڑی سی محنت سے یہ نقص دور ہو سکتا تھا۔ اسی نظم میں آگے چل کر ۔ جو پا سکوں تو موت ہے، ہے موت گر نہ پا سکوں۔ "ہے ہے" نے واویلا مچا کر رکھ دیا ہے۔ تم کہ تنقید میں نئی نسل کے رہبر ہو تمہیں تو سخت احتیاط برتنی چاہئے۔

جھپٹی چلی آ رہی ہے دیکھو تو
لبتی ہے شکار، شام چیتا ہے

اب اس شعر میں "دیکھو تو" کا ٹکڑا نہ شعر کو آگے بڑھاتا ہے نہ معنی کو ایڑ دیتا ہے۔ ایسی خانہ پری سے اجتناب کرو۔ تمہاری تحریروں سے پتا چلتا ہے کہ تم عروض کے واسکوڈی گاما ہو اس کے باوجود اس مصرعے میں "منظر شکست رنگ کا دیکھا کیا اور بس۔" "اور" وزن میں نہیں ہے۔ "اور" کا ایک وزن ہے فعل، دوسرا وزن ہے فع یہاں وہ صرف "ف" بندھا ہے۔ یہاں کوئی لفظ "کہ" کے وزن کا ہونا چاہئے تھا۔ تمہارا مصرع "جو اندھے مکوڑے کی صورت گھسٹتا چلے ہے۔" عبث ہے۔ یہ وبا ہندوستان میں ہے اور پاکستان میں ایک زمانے میں چلی تھی۔ جسے دیکھو "وہ مجھے پکارے ہے" یا "دل مرا جلاوے ہے" لکھ لکھ کر میر اور غالب کی روح کو ثواب پہنچا رہا تھا، ارے ظالم زندگی کے ساتھ ساتھ زبان کا آہنگ بھی بدل جاتا ہے۔ نہ بدلے تو زندگی کے مسائل زبان کے قبضے سے باہر نکل جائیں۔ تازہ احساسات اور خیالات کے لئے تازہ زبان درکار ہے۔ جسے زبان کا پتا نہ ہو اسے سب کرنے دو۔ تم ہنرمند آدمی ہو تمہیں تساہل نہیں برتنا چاہئے۔ تمہارے

ایک دو مصرعوں سے اندازہ ہوا کہ انگریزی ترکیبوں کا ترجمہ ہیں مثلاً۔ مجھے دیکھ کر یہ عمارت مری سمت میں چل پڑی ہے۔ In my direction کا ترجمہ تم نے پورے کا پورا "مری سمت میں" کر دیا ہے حالانکہ اردو اس کی متحمل نہیں ہو سکتی۔ "مری سمت چل پڑی ہے"۔ درست ہے۔ اپنی جدید شاعری کا المیہ یہ بھی ہے کہ لوگ زبان کی طرف سے غافل ہو گئے ہیں۔ حالانکہ مسائل کی COMPLEXITY کا تقاضا یہ ہے کہ اس پر دسترس مکمل ہونی چاہئے۔ خوب لوگ ہیں ۔ لڑتے ہیں اور ہاتھ میں تلوار بھی نہیں۔

(5) آخر آخر میں یہ کہنا ہے کہ رباعی نہ لکھو۔ نہ یہ تمہارا مزاج ہے اور نہ یہ تمہارے بس کی بات ہے۔

محبت کرو - فقط - تمہارا منتظر دوست

ساقی فاروقی

۔ modernised کے یہی ہجے پونڈ نے لکھے ہیں ——— (ساقی)

شام کا پہلا تارا

ڈیئر ہم عصر زہرا نگاہ'

میرا خیال ہے شروع میں ہی' ضمنی طور پر ان باتوں کی طرف اشارہ کرتا چلوں جو مجھے پسند نہیں آئیں تاکہ بعد میں میری پسندیدگی کے کچھ معانی سمجھ میں آ سکیں۔

1- گرد پوش پر سردار جعفری کی رومانی' مردہ اور بے معنی تحریر نہ کتاب سے انصاف ہے نہ شاعر سے۔ بالکل یہی کچھ وہ فہمیدہ ریاض کے لئے بھی لکھ چکے ہیں اور پروین شاکر کے لئے بھی کہہ چکے ہیں۔ ان کی نثر ان کی شاعری کی طرح بے اعتبار ہے۔ اگر آپ کا نام قرۃ العین یا مریم ہوتا تو وہ آپ کا رشتہ ایران اور فلسطین سے نکالتے اور بات کا بتنگڑ بناتے۔ 1940ء میں انہوں نے یہ لکھ کر اپنی شلف پر رکھ لیا تھا "الف نے اپنی شاعری کا آغاز غزل / نظم سے کیا تھا جس میں جذبے اور احساس کی فراوانی تھی ---- الف نظموں / غزلوں کی طرف مائل ہوا / ہوئی اس شاعری میں آج کی بے چین دنیا کی بے چین روح ہے۔ ظلم کے خلاف احتجاج کی لے ہے۔ الفاظ نرم اور لطیف ہیں" وغیرہ وغیرہ۔ الف کی جگہ کبھی فہمیدہ کبھی ساحر کبھی اختر الایمان اور کبھی زہرا کا نام ڈال دیتے ہیں اور پچھلے 40 سال سے یہی مشغلہ اختیار کر رکھا ہے۔ انہیں آپ کی نظموں میں بھی "ظلم کے خلاف" والی نظمیں پسند آئیں اور یاد رکھئے کہ یہ "ظلم" ترقی پسندوں والا ظلم ہے یعنی "THEM" اور "US" والا۔ وہ ظلم نہیں جس پر آپ نے اپنی 20 خوبصورت نظمیں لکھی ہیں جو آپ کی ذات پر ہوتا رہا ہے اور جس کی طرف میں بعد میں اشارے کروں گا۔

2- عورتوں کی زبان سے ہم مرد زبان سیکھتے آئے ہیں اس لئے ان دو چار غلطیوں

سے آپ دامن بچا سکتیں تو بہتر تھا۔ "انتساب" کے پہلے مصرعے میں "عذاب لہو" اگر آپ نے دانستہ طور پر لکھا ہے تو خیر ورنہ "لہو" ہندی کا لفظ ہے اور اضافت کا بوجھ نہیں اٹھا سکتا۔ ویسا میرا اپنا خیال یہ ہے کہ اس طرح کی تراکیب اردو میں جاری ہو جانی چاہئیں اگر زبان آگے جانا چاہتی ہے مگر یہ فعل شعوری ہو، لاعلمی میں نہ ہو۔

3- نظم "شام کا پہلا تارا" میں صفحہ 16 پر بارھویں مصرعے میں "رائے" کو آپ نے کھینچ تان کر "فعلن" باندھا ہے جس سے مصرعے کا حسن اور نغمہ مجروح ہوتے ہیں۔ یہ لفظ "فعل" کے وزن پر ہے اور اسی میں اس کی موسیقی بند ہے۔

4- "جرم وعدہ" میں ایک مصرع ہے ۔ جہاں آنکھوں کی سوئیاں رہ گئی تھیں۔ "سوئیاں" آپ نے بروزن "سیاں" یا فعلن باندھا ہے جو غلط نہیں ہے کہ بزرگوں نے بھی فعلن لکھا ہے مثلاً جانصاحب کا شعر ہے:

مجھ کو وہ چاہ نگوڑی نے جھکائیں کوئیاں
تن بدن میں ہیں مرے چبھ رہیں غم کی سوئیاں

مگر یہ تلفظ متروک ہو گیا ہے جیسے لفظ "کبھو" متروک ہو گیا۔ اور اس لفظ کو اب "فاعلن" باندھتے ہیں جیسا شاد کے شعر میں:

دکھا کے غیر کو مژگاں کی سوئیاں کیا کیا
مرے جگر میں وہ لیتا ہے چٹکیاں کیا کیا

5- نظم "نیا گھر" میں ایک مصرع ہے:

اس کے دیوار و در فرش و آنگن

آنگن ہندی ہے اور "واؤ" فارسی کا حرف عطف ہے۔ فرش عربی ہے۔ میں سمجھتا ہوں مصرعے سے دونوں "واؤ" نکال دیے جائیں اور COMMA کا استعمال کیا جائے۔ دیوار کے بعد، در کے بعد، اور فرش کے بعد، تو مصرعے میں مزید روانی آ جائے گی اور "واؤ" کی علت بھی جاتی رہے گی۔

6- نظم "ایک لڑکی" میں غالباً کتابت کی غلطی سے ساتویں مصرعے میں لفظ "ا-ستادہ" چھپ گیا ہے اور مصرع گر گیا ہے اسے "استادہ" ہونا چاہئے۔ "ی" کے

بغیر "مفعولن" نہ کہ "فاعلاتن"

7- نظم "یہ ہوا کا جھونکا" میں ایک مصرع ہے: ان گھروں کے درودیوار۔ یہ مصرع حرف عطف کی وجہ سے بے وزن ہو گیا ہے۔ یہاں بھی "واؤ" کو نکال کر COMMA لگا دینے سے مصرع وزن میں بھی ہو جائے گا اور رواں بھی۔

8- آپ کی ایک بہت اچھی نظم "اپنے بیٹے علی کے نام" میں "مشام جاں" کا استعمال میرے نزدیک بہت اجنبی ہے کہ مشام جاں کا لغوی مطلب "دماغ" ہے "خوشبو" نہیں۔

اب میں کچھ غزلوں کے بارے میں کہنا چاہتا ہوں' اس مجموعے میں 34 غزلیں شامل ہیں۔ مگر میرا انتخاب بہت کڑا ہے۔ میرے کڑپن سے ناراض ہونے کی ضرورت ہے نہ اداس ہونے کی کہ یہ میرے ساتھ ناانصافی ہو گی۔

مجھے تین مکمل غزلیں اور بقیہ غزلوں کے دس شعر ایسے لگے کہ جی نہال ہو گیا اور آپ کی غزل کا جواز نظر آیا۔ ان کی طرف اشارہ کرنے سے پہلے یہ بتانا ضروری ہے کہ ہندوستان اور پاکستان میں چھپنے والی سیکڑوں کتابوں (مجموعوں) میں خال خال کوئی ایسی غزل یا ایسے شعر نظر آتے ہیں کہ غزل کا امکان روشن ہو۔ جو غزلیں مجھے پوری کی پوری پسند آئیں وہ یہ ہیں:

(1) اپنا ہر انداز آنکھوں کو تر و تازہ لگا
(2) بیٹھے بیٹھے کیسا دل گھبرا جاتا ہے
(3) قربتوں سے کب تلک اپنے کو بہلائیں گے ہم

بڑے مارکسی فلسفی ہربرٹ مارکوزے نے 1975ء سے یہ کہنا شروع کر دیا تھا کہ مارکسیت کو دنیا کی آدھی مزدور آبادی یعنی عورتوں کے حقوق کے لئے جنگ شروع کر دینی چاہئے کہ یہ مزدور نہتے ہیں۔ یہی بات ایک غریب ملک کے ایک چھوٹے شاعر ساقی فاروقی نے 1970ء میں کہنی شروع کر دی تھی مگر ادب کے رشتے سے کہ Female Experience کا جو ذخیرہ ہندوستان اور پاکستان کی عورتوں میں بند ہے' وقت آگیا ہے کہ وہ لاوے کی طرح ابلے۔ یورپ کی سوسائٹی بھی مردوں کے زیر اثر ہے مگر یہاں این سیکسٹن اور سلویا پلاتھ تو پیدا ہو کر اور خودکشی کر کے جا چکیں اور شاعری میں ایک تازہ تر

امکان کی نشاندہی کر کے بھی۔ مگر انگریزی کی شاعری میں عورتوں کی آواز نے رومانیت سے اظہاریت کی طرف یہ سفر 50 سال میں کیا ہے اور 1930ء سے ہی ایسے مصرعے آنے لگے تھے:

Full of desire I lay, the sky wounding me (kathleem Raine)

یا

So the first flutter of a baby felt in the womb

(Anne Ridler)

اور 1960ء کے لگ بھگ Sylvia Plath کا اپنے باپ پر یہ مشہور مصرع:

Dady, dady, you bastard,

I'm through.

مگر ہمارے یہاں عورتوں کے تجربات کا اصل اظہار 15، 16 سال سے شروع ہوا ہے۔ یہ انوکھا بھی ہے اور تازہ بھی اور کشور ناہید نے اپنی ایک نثری نظم میں ٹھیک ہی لکھا تھا:

مجھے جن جذبوں نے خوفزدہ کیا تھا
اب میں ان کے اظہار سے
دوسروں کو خوف سے لرزتا دیکھ رہی ہوں۔

اب اس اظہار کی ایک مثال فہمیدہ ریاض کے ایک مصرعے میں دیکھئے:

تم اپنی زباں، میرے منھ میں رکھے جیسے پاتال سے میری جاں کھینچتے ہو

یا پروین شاکر کے اس شعر میں:

کمال ضبط کو خود بھی تو آزماؤں گی
میں اپنے ہاتھ سے اس کی دلھن سجاؤں گی

یا شاہدہ حسن کا یہ شعر:

میں نے ان سب چڑیوں کے پر کاٹ دیئے
جن کو اپنے اندر اڑتے دیکھا تھا وغیرہ وغیرہ

میں نے اردو اور انگریزی کی خواتین کے تجربات کا پس منظر اس لئے اجاگر کیا ہے کہ آپ یہ سمجھ سکیں کہ مجھے یہ تین غزلیں کیوں پسند ہیں اور بقیہ 30 کیوں نہیں۔ اب

اپنی غزل: اپنا ہر انداز آنکھوں کو تر و تازہ لگا ـــــــ کو لیجئے

یہ غزل پہلے مصرعے سے آخری مصرعے تک ایک ہندوستانی/پاکستانی "عورت" کی سرشاری ہے۔ عورت میں نے اس لئے کہا کہ اس میں "لڑکی" کا الھڑپن نہیں جو مثال کے طور پر (اور یہ مثال میں صرف Contrast کے لئے لکھ رہا ہوں) پروین شاکر کی ایک خوبصورت غزل: رقص شوق سے جب تک انگلیاں نہیں کھلتیں۔ میں ہے۔ پروین کی غزل میں کنوارپن کی کچی خوشبو ہے۔ آپ کی غزل میں سہاگن کا انبساط ہے۔ محبت سے لبریز اس غزل میں اندر کی اتھاہ سرخوشی کا بھاری بھرکم پن ہے۔ اس غزل کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ پہلے ہی لفظ کے "گھماؤ" نے 'یکایک محسوس ہونے والی خوشی کو اپنی گرفت میں لے لیا ہے اور بحر کی موسیقی کو جنم دیا ہے جو ذات کی امنگ سے ہم آہنگ ہو گئی ہے جیسے آرزو لکھنوی کے ایک مصرعے کی ابتدا:

وہ پلٹ کے جلد نہ آئیں گے یہ عیاں ہے طرز خرام سے

آرزو صاحب نے "وہ پلٹ" لکھ کر ابتدا ہی میں وہ ـــــ Twist دی ہے جس سے ایک ایسی چال کا اندیشہ پیدا ہو گیا ہے جو واپس آنے والی نہیں۔ یا غالب کے مصرعے: الٹے پھر آئے در کعبہ اگر وا نہ ہوا۔ میں پہلے ہی لفظ سے وہ ترنگ اور انانیت پیدا ہوتی ہے جو کسی اور طرح ممکن نہ تھی۔ ایک جھٹکے کی کیفیت جیسے کوئی بچہ جلتی موم بتی کی طرف ہاتھ بڑھاتے بڑھاتے جلنے کے خوف سے ایک دم ہاتھ کھینچ لے۔

پھر یہ کہ "اپنا ہر انداز آنکھوں کو تر و تازہ لگا" کے بعد ایک خاموشی سی ہے۔ جیسے کسی اندرونی لذت سے مسرور ہونے کے لئے کوئی ایک لمحے کو اپنے آپ میں گم ہو جائے۔ پھر ایک ٹھنڈی سانس کے ساتھ دوسرا مصرع آتا ہے "کتنے دن کے بعد مجھ کو آئنہ اچھا لگا۔" دونوں مصرعوں کے درمیان کی خاموشی میں یہ بھی ہے کہ "بہت دنوں میں اداس رہ چکی اور یہ انہونی خوشی overdue تھی۔" وغیرہ وغیرہ۔

جوں جوں غزل بڑھتی جاتی ہے ایک ایسی گھریلو عورت کی تصویر ابھرتی جاتی ہے جو روزمرہ کی یکسانیت سے بور تھی اور اب کسی ایک لمحے نے سب کچھ بدل دیا ہے جیسے کوئی پھولوں کا گلدستہ تھما دے یا تمام کاموں کا شکریہ ادا کر دے یا محبت کا اعادہ کرے' کوئی نہایت سامنے کی معمولی مگر انہونی بات کہ سارے دن کے routine کے معانی سمجھ میں

آنے لگے۔ کوئی ایسی میٹھی بات کہ جس کے بعد باہری آرائش کی ضرورت نہیں رہتی کہ آدمی اندر سے جگمگانے لگتا ہے۔ پھر شروع کے چار شعروں میں دن پھیلا ہوا ہے اور آخری شعر کے اس ٹکڑے سے "وہ جو تھک کر دیر سے آیا" پورے دن کو ریشم کے لچھے کی طرح لپیٹا گیا ہے۔ جو غزل صبح سے شروع ہوئی تھی شام پر ختم ہوئی ہے۔ یہ ایک خوبصورت اور مکمل غزل ہے۔

اب میں اپنی پسند کی دوسری غزل کی طرف آتا ہوں یعنی: بیٹھے بیٹھے کیسا دل گھبرا جاتا ہے۔ والی غزل۔

اس غزل کے تانے بانے جیسے دل کی دھڑکن پر بنے گئے ہوں۔ دھک دھک دھک ——— بیٹھے ----- بیٹھے ---- ایک حزنیہ سرگوشی جو سننے والوں سے قربت کا مطالبہ کرتی ہے۔ اس لئے نہیں کہ ، میری سنو جو گوش نصیحت نیوش ہے' بلکہ اس لئے شاید کہ باہر بہت شور ہے' قریب آجاؤ ——— یہ اپنے ہی "دوسرے میں" سے خود کلامی بھی ہے اور آنے جانے والے مہمانوں سے بات کرنے کی تمنا بھی۔ اس میں ایک ایسی عورت کا دکھ ہے جو تمام دنیاوی آرائشوں کے باوجود اداس ہے۔ سلیم احمد نے اپنے بانکے مضمون "نئی نظم اور پورا آدمی" میں بڑی سفاک بات لکھی تھی۔ "آپ عورت کو خوبصورت الفاظ سے خوش نہیں کر سکتے۔ صرف زیور' کپڑے اور نان نفقے سے بھی نہیں۔ یہاں تک کہ صرف اس کام سے بھی نہیں جسے محبت کہتے ہیں ---- عورت یہ سب چیزیں چاہتی ہے مگر الگ الگ نہیں۔" یہاں مجھے لفظ "کام" کی ہولناکی سے اختلاف ہے اور مجھے معلوم ہے کہ سلیم احمد نے بھی اپنا مسلک بدل لیا ہے مگر انہوں نے بڑی گہری بات کہی ہے۔ اس غزل میں مجھے ایک ایسی عورت کی پرچھائیں نظر آتی ہے جو ہجوم کی طالب ہے مگر جسے ہجوم تنہا کرتا ہے مگر وہ تنہائی سے کچھ اس درجہ خوف زدہ ہے کہ تیسرے کی کچی ڈور کا عارضی سہارا بھی بہت ہے۔ یہاں مجھے فراق کا ایک شعر بھی یاد آرہا ہے:

کہاں وہ خلوتیں دن رات کی اور اب یہ عالم ہے
کہ جب ملتے ہیں دل کہتا ہے' کوئی تیسرا بھی ہو

اس غزل میں یہ شعر بھی کہیں چھپا ہوا ہے۔ مگر یہ غزل اس شعر سے ان معنوں

میں جدا ہے کہ تیسرے کی آرزو تو ہے مگر اس لئے نہیں کہ دو روحیں ایک دوسرے کو
اس طرح جان پہچان گئی ہیں کہ مزید گفتگو کا کوئی سلسلہ نہیں بنتا۔ اور تیسرے کے حوالے
کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ (اطہر نفیس نے کیا عمدہ مصرع لکھا تھا: عشق صداقت
ہوتے ہوتے کتنا کم احوال ہوا) نہیں ایسا نہیں ہے۔ یہاں تیسرے کی ضرورت اس لئے
ہے کہ دوسرا' وہ جو اپنا ہے' اسے فرصت ہی نہیں اور وہ زندگی کرنے اور زندگی بنانے میں
اتنا مصروف ہے کہ جس کے لئے یہ سارے جتن کئے جا رہے ہیں' ساری آسائشیں
خریدی جا رہی ہیں وہ نراس ہوتی جا رہی ہے کہ درمیان یا تھکن ہے یا خاموشی اور وہ لفظ
نہیں ہیں جن سے جان پہچان بڑھتی ہے۔

اب اس گھر کی آبادی مہمانوں پر ہے
کوئی آ جائے تو وقت گزر جاتا ہے

اس شعر میں جان بوجھ کر ایک استہزائیہ کیفیت کو اجاگر کیا گیا ہے جیسے کوئی
کھلنڈری لڑکی توبہ توبہ کر کے اپنے کان چھوئے کہ ہائے اللہ میں نے اتنا سارا سچ سب کے
سامنے کیوں کہہ دیا۔

یہ ایک نیا تجربہ ہے اور میں ایسی ہی غزلوں میں "زہرا نگاہ" کی نجات دیکھتا ہوں۔

اب میں اس کتاب کی اس تیسری اور آخری غزل کا ذکر کروں گا جو مجھے پوری کی
پوری پسند آئی' اس غزل کے مختلف شعروں میں کئی طرح کی کہانیاں پھیلی ہوئی ہیں' ایک
ہی ذات کی کئی پرچھائیاں جو ایک دوسرے کو کاٹ نہیں رہیں بلکہ ایک دوسرے میں گم
ہوتی جاتی ہیں۔ پوری غزل میں ایک سوچ بچار کا لہجہ ہے یعنی یہاں آپ لفظوں کی مشین
میں ہیں کہ کھٹ کھٹ کھٹ بنے بنائے جذبے اور خیال کیپسوں میں نکلتے چلے
جائیں۔ نہیں' یہ ایک محسوس کیا ہوا درد ہے۔

قربتوں سے کب تلک اپنے کو بہلائیں گے ہم
ڈوریاں مضبوط ہوں گی' چھوٹتے جائیں گے ہم

ایک کشمکش ہے' ایک الجھن ہے۔ صرف قربت کافی نہیں' اس ایک کھلونے سے
ملنا محال ہوتا جا رہا ہے' اس شعر میں اس سوال اور جواب کی گونج ہے:

i). There should be something else......?

i). There must be something else....!

دوسرے شعر میں یہ ہے کہ ہم دو جدا جدا شخصیتیں ہیں، اتفاق سے یا کسی حادثے
کے سبب یا انجانے میں یکجا ہو گئے ہیں اور اب اس "آن" کے منتظر ہیں جس میں ذاتوں
کی ہم آہنگی میسر آ سکے۔ مگر دوسرے مصرعے کی اٹھان میں یہ جھلاہٹ بھی ہے کہ ساری
کوششیں رائیگاں گئیں اب وہ "آن" آپ ہی آپ آجائے تو آجائے۔ پہلے مصرعے میں
ایک بڑی خوبصورت بات یہ بھی آگئی ہے کہ ہرچند آپ کی آنکھیں سوئے مہر ہیں مگر اس
کا نتیجہ یہ ہو گا کہ تھوڑی ہی دیر میں آنکھوں کے سامنے سائے ناچنے لگیں گے اور دونوں
کی آنکھوں کے سامنے سائے ہوں گے۔ شاید ملن کی ایک کوشش یہ بھی ہو۔

تیسرے شعر کا ایک سامنے کا مطلب تو وہ ہے جس کی طرف ڈاکٹر عبادت بریلوی
عنقریب توجہ دلائیں گے مگر میں سمجھتا ہوں کہ اس میں یہ ماتم ہے کہ ہم دونوں جسماً" او
روحاً" خرچ ہو گئے ہیں اور تجدید یا احیاء کی کوئی صورت نہیں رہی۔ یہ بہت سوگوار کر
دینے والا شعر ہے اور ہم میں سے بہتوں کا المیہ ہے۔

چوتھے شعر میں علم و حکمت کی کتاب کی موجودگی اور پھر اس کا کھلا ہونا بے سبب
نہیں ہے۔ یعنی ہنگاموں میں تو ٹھیک تھا کہ چوتھے اور تیسرے کے حوالے سے دوسرے
تک پہنچنے کا امکان تھا مگر اب کیا ہو کہ دو تھکی ہوئی روحیں اور بدن اپنے خلوت کدے
میں ایک دوسرے سے اس لئے محجوب ہیں کہ کہنے کو کچھ نہیں رہا اور دونوں نے یا دونوں
میں سے ایک نے فرار کی ایک صورت یہ اختیار کر رکھی ہے کہ بستر پر پہلے ہی سے کتاب
کھلی چھوڑ دی ہے تاکہ ندامت نہ ہو۔ اور ادھ کھلی کتاب کے یہ معنی بھی نکلتے ہیں کہ
ایسی راتیں پہلے بھی گزر چکی ہیں۔ اور یہ کوئی نرالی بات یا انوکھا واقعہ نہیں۔ یعنی د
ذاتوں نے اپنے درمیان بڑھتی ہوئی اجنبیت سے سمجھوتہ کر لیا ہے۔ پھر کتاب کی موجودگی
اس "تیسرے دیو" کی موجودگی کا سمبل بھی ہے جس کے بغیر کسی طرح کا اظہار اور کسی
طرح کی رسائی ممکن نہیں رہی۔

پھر یوں ہوتا ہے کہ وسوسوں اور واہموں میں گھرے ہوئے یہ دو لوگ یکا یک
لگاوٹ سے ایک دوسرے کی طرف کھچ آتے ہیں۔ اور وہ بیجا رنجش یا کسی ایک کی مغلوب
الغضبی یا زک پہنچانے والا کوئی معمولی واقعہ جو پچھلے روز یا پچھلے ہفتے یا پچھلے مہینے ہوا تھا

Direct communication سے جیسے ہمیشہ کے لئے ختم ہو جاتا ہے اور اس اجنبیت کی دیوار کے گرتے ہی وہ ساری understanding سامنے آ جاتی ہے جو دو چار برس میں نہیں بنتی بلکہ زندگی کے طویل سفر کے بعد دستیاب ہوتی ہے اور جس کے پیچھے دکھوں اور سکھوں کا ایک لامتناہی سلسلہ ہے اور جس کے حصول میں میر صاحب آگ سے خاک ہوئے:

اس نے آہستہ سے زہرا کہہ دیا' دل کھل اٹھا
آج سے اس نام کی خوشبو میں بس جائیں گے ہم

غزل پر گفتگو ختم کرنے سے پہلے ان دس شعروں کا ذکر کرنا چاہتا ہوں جنہیں بارہا گنگنایا ہے۔ یہ 5'5 شعروں کے دو گروپ ہیں مگر اس سے پہلے مجھے کہنے دیجئے کہ میں فیض صاحب کی طرح آپ کی شاعری کے تین دور نہیں بناؤں گا۔ کتاب سے صرف دو دور سامنے آتے ہیں۔ ایک کلاسیکی جس میں آپ کی آواز اپنی نہیں ہے۔ بیشتر مانگے کا اجالا ہے۔ احساس اور خیال دوسروں کے ہیں' آپ صرف لفظوں کی سزاوار ہیں۔ آپ کے گلے میں اجنبی آوازوں کی چمپا کلی ہے مثلاً:

فنا ہو چکی ہیں زمانے کے ہاتھوں
تری جلوہ گاہیں' مری سجدہ گاہیں

یا:

عمر ساری غم دنیا میں بسر ہوتی ہے
تب کہیں جا کے ترے غم کی سحر ہوتی ہے

یا:

آندھیاں آئیں کئی رنگ ابھرے
آگ برسی تو بہت پھول کھلے

یا:

شورش قلب و نظر آخر زباں تک آ گئی
بات یہ اتنی سی تھی' لیکن کہاں تک آ گئی

یا:

گردش مینا و جام دیکھئے کب تک رہے
ہم پہ تقاضا حرام دیکھیے کب تک رہے

یا:

مری غریبی کی خیر یا رب مجھے مقامات بوذری دے
بڑے بڑے صاحب بصیرت یہاں پہنچ کر بھٹک گئے ہیں

یا:

غم بھی اس دل کا آسرا نہ ہوا
تیرا احسان تھا ادا نہ ہوا

یا:

پھولوں سے ہوا بھی کبھی گھبرائی ہے دیکھو
غنچوں سے بھی شبنم کبھی کترائی ہے دیکھو

یا:

خوب ہے صاحب محفل کی ادا
کوئی بولا تو برا مان گئے

یا:

بھٹکے ہوئے بھٹکتے ہوئے کارواں کی خیر
رہبر سے راہزن کی ملاقات ہو گئی

یا:

لو ڈوبتوں نے دیکھ لیا ناخدا کو آج
تقریب کچھ تو بہر ملاقات ہو گئی وغیرہ وغیرہ۔

یہ غزلیں زیادہ سے زیادہ لکھنؤ کے برے اساتذہ کی' ابھرے ترقی پسندوں کی' اقبال اور فیض اور ناصر کی یاد دلاتی ہیں۔ ایسا لگتا ہے انہیں لکھنے والے نے کوئی دکھ نہیں اٹھایا اور دوسروں کے اسلوب بیان (Phraseology) میں مقید ہو کر رہ گیا ہے۔ ایسی غزلوں کی وجہ سے لوگ آپ کو Assess کرنے میں دقت محسوس کریں گے اور آپ کے شعری مقام کے تعین میں دیر لگے گی۔

مگر اس دور میں ایسے شعر بھی ملتے ہیں کہ پتا چلتا ہے کہ آپ کو جادوگری کا ڈھنگ آتا ہے۔ جیسا کہ آپ کو معلوم ہے آپ کی تان کے دیپک سے میں 20 سال سے جل رہا ہوں (اس میں آپ کی عمر کی طرف اشارہ نہیں بلکہ میری میٹھے برس میں شامل ہونے کی تمنا ہے) آپ تو پہلی ہی غزل سے مشہور ہو گئی تھیں' یہاں آج تک یہ سوگ ہے کہ مشتاق احمد یوسفی نے کہیں ذکر نہیں کیا۔ میرے پہلے گروپ کے شعر اسی دور کی یادگار ہیں

دل بجھنے لگا آتش رخسار کے ہوتے
تنہا نظر آتے ہیں غم یار کے ہوتے

خوش جو آئے تھے پشیمان گئے
اے تغافل تجھے پہچان گئے

اے شیشہ گرو' کچھ تو کرو' آئنہ خانہ
رنگوں سے خفا' رخ سے جدا یوں نہ ہوا تھا

اب تک شریک محفل اغیار کون ہے
ہم بے وفا ہوئے تو خطا وار کون ہے
کوئی کرتا ہے اگر پیار بھری بات تو ہم
شہر کا شہر ستاروں سے سجا دیتے ہیں

ان شعروں میں دوسروں سے جان چھڑانے کی کوشش اور اپنی ذات کے آہنگ کی تلاش ہے' ابھی آپ پوری طرح سے کامیاب نہیں ہوئیں مگر اپنی آواز کے تعاقب میں ہیں۔ خاص کر آخری شعر جسے میں نے آپ کی نظم سے نکال لیا کہ نظم کمزور ہے اور اسی شعر کی بیساکھی پر کھڑی تھی۔ یہ شعر مجروح کے شعر، ترا ہاتھ' ہاتھ میں آگیا------ سے بھی آگے جاتا ہے۔ اور اس سے بڑا شعر ہے۔ اس میں ایک وحشت اور رقص کی کیفیت

بھی شامل ہے۔ خاص کر دوسرے مصرعے میں ایک نشاط انگیز اور لذت آگیں لمحے کو زنجیر کر کے اسے زندہ اور بہتے ہوئے وقت سے الگ کر دیا گیا ہے۔

اب میرے دوسرے گروپ کے شعروں کو دیکھئے:

بھولیں اگر تجھے تو کہاں جائیں کیا کریں
ہر رہ گزر میں تیرے گزرنے کا حسن ہے

برسوں ہوئے تم کہیں نہیں ہو
آج ایسا لگا یہیں کہیں ہو

ہم خاک تھے پر جب اسے دیکھا تو بہت روئے
سنتے تھے کہ صحراؤں میں دریا نہیں ہوتے

کڑے سفر میں مجھ کو چھوڑ دینے والا ہم سفر
بچھڑتے وقت اپنے ساتھ ساری دھوپ لے گیا

آنکھوں میں دیدار کا کاجل ڈالا تھا
آنچل پہ امید کا تارہ ٹانکا تھا

اس گروپ کے شعر پہلے گروپ کے شعروں سے اس لئے الگ ہیں کہ ان میں اردو شاعری کے مردوں کے بنائے ہوئے استعارے سے ہجرت ہے۔ یہاں آپ نے اپنی آواز کو پا لیا ہے' یہ ان تین غزلوں کی طرح ہیں جن پر اجمالا" یا شاید تفصیلا" پچھلے صفحات میں لکھ چکا ہوں۔ یہ کوئی بہت بڑے شعر نہیں ہیں مگر ان کی خوبی یہ ہے کہ یہ آپ کے اپنے ہیں۔ اردو شاعری کے کلیشے سے الگ' ان میں اس عورت کے دکھ اور خواب ہیں جو اپنی ذات کی آزاد فضا میں پہلی بار سانس لینے کی کوشش کر رہی ہے۔ پر تول رہی اور نئے آسمانوں کی خبر دے رہی ہے۔ آپ کو ایسے ہی اشعار کے سائے میں سفر کرنے کی

ضرورت ہے۔ آپ میرا بائی یا قرۃ العین طاہرہ تو نہیں بن سکتیں مگر زہرا نگاہ کی طرح ضرور زندہ رہیں گی۔

اب وقت آگیا ہے کہ نظموں پر بات کی جائے۔ مجموعے میں 52 نظمیں ہیں۔ غالباً سال کے 52 ہفتوں کا خیال رکھا گیا ہے۔ مجھے 23 نظمیں پسند آئیں یعنی 44ء1 فی صد۔ اس بات پر ہم دونوں کو خوش ہونا چاہئے۔ ہر نظم پر لکھنے کا یارا نہیں کہ خط بہت طویل ہو گیا ہے مگر ان کی بنیادی خوبیوں کی طرف اشارے کرتا چلوں گا اور کتاب کی کلیدی نظم پر ذرا تفصیل سے گفتگو کروں گا۔

مگر خوبیاں گنانے سے پہلے ان نظموں کی برائیوں کی فہرست دیکھتی چلئے جو مجھے پسند نہیں آئیں:

-1 سخت رومانی فضا کہ صحت مند آدمی کا دم گھٹ جائے۔ جوش صاحب کے الفاظ ہیں

جذبہ حاتم کی طرح دریا دل
شعر قارون کی طرح کنجوس

پھر فیض کی زبردست چھاپ ہے جیسے "اہتمام شب امید" اور "آج کی بات" وغیرہ۔ بزرگ ہمعصروں سے آدمی کو ہر حال میں جان بچانی چاہئے۔ یہ الیٹ اور راشد کا ہی نہیں میرا بھی خیال ہے۔

-2 لفظوں کا بے جا استعمال یعنی ایسی صفات کا استعمال جو آنے والے مصرعے کو نہ آگے بڑھاتی ہیں نہ پیچھے ہٹاتی ہیں۔ مثلاً نظم "آج کی بات" صرف دو مصرعوں:

(درد میٹھا ہو
تو رک رک کے کسک ہوتی ہے
یاد گہری ہو
تو تھم تھم کے قرار آتا ہے)

کی نظم ہوتی تو کھٹ سے دل پر لگتی اور اس کا پورا Impact ہوتا

"تعمیل وفا کا عہد نامہ" 24 مصرعوں کی بجائے مندرجہ ذیل 6 مصرعوں کی نظم ہوتی تو To the point ہوتی اور اپنا گہرا نشان چھوڑتی:

اجڑے ہوئے گھر کی خامشی میں
نوحے کی ندائیں ایک سی ہیں
ماتم کا ایک سا ہے لہجہ،
رونے کی صدائیں ایک سی ہیں
لاشوں کا کوئی وطن نہیں ہے
مُردوں کی کوئی زبان نہیں ہے

3- کلیشے یعنی اس قسم کے ٹکڑے:
"تمنا کے موتی" - "خیالوں کے رنگین محل" - "روح انسانی" - "نرگس چشم تر" - "نسیم سحر" ــــــ اس طرح کی پچاسوں ترکیبیں ان نظموں میں ہیں۔ ان سے نجات کی کوشش بہت ضروری ہے۔

4- سیاست پر صحافیانہ تبصرہ۔ جیسے "جنوبی افریقہ" وغیرہ نغمے کو سینے میں تھامنے کی ضرورت ہے۔ ترقی پسندوں کی بے وقت موت کا سبق نہیں بھولنا چاہئے۔

5- مولویانہ خطابت جیسے "تن نحیف سے انبوہ جبر ہار گیا" اے بہن، اے دوست۔ یہ نہ آپ کا لہجہ ہے نہ آپ کی آواز۔ ایسا لگتا ہے آپ کے خیالات فوجی وردی پہن کر نکل آئے ہیں شاید ایک لمحے کو آپ بھول گئیں کہ آپ ساڑی میں بہت دل آویز لگتی ہیں۔

6- آخر آخر میں یہ کہ Concorde پر آپ بھکے اڑیے بلکہ اپنے میاں سے کہہ کر مجھے بھی اڑوایئے مگر اس پر نظم مت کہئے۔ یہ نہ شاعری سے انصاف ہے نہ Concorde سے۔

اب میں ان نظموں کے عنوانات گنواتا ہوں جو مجھے بہت بہت پسند آئیں/بہت پسند آئیں/ اور پسند آئیں۔

(1) شام کا پہلا تارا (2) جرم وعدہ (3) بلاوا (4) متاع الفاظ (5) آنگن (6) گل چاندنی (7) اگر تم کہو تو (8) نیا گھر (9) سمجھوتہ (10) تراشیدم۔ شکستم (11) کیسی ستھری شام

ہے دیکھو (12) بن باس (13) مری سہیلی (14) دیوار (15) سوچتی ہوں اپنے رستے لوٹ جاؤں (16) نائٹ شفٹ (17) ایک لڑکی (18) ہمارے اور تمہارے راستوں میں' (19) علی کے نام (20) ایران (21) نظر بھر کے تم ان پہاڑوں کو دیکھو (22) اندریں شہر مراسایہ دیوارے نیست (23) کچھ دن ہوئے اس گھر میں تھی۔

یہ نظمیں اتنی انوکھی' البیلی اور نئی ہیں کہ جی چاہتا ہے' ہر نظم کا تجزیہ کروں اور Appreciation لکھوں مگر یہ ممکن نہیں لیکن جیسا کہ میں نے غلطی سے وعدہ کر لیا ہے اس مجموعے کی کلیدی نظم "شام کا پہلا تارا" پر تبصرہ کروں گا۔ مگر اس سے پہلے اس عورت کا تذکرہ ضروری ہے جو ان نظموں میں منکشف ہوئی ہے۔ یہ ایک فرد کی کہانی بھی ہے' ہندوستانی عورت کی بپتا بھی اور مشرق وسطیٰ اور مشرق بعید کی عورت کا المیہ بھی۔ ان نظموں کی عورت ظلم سہہ رہی مگر اپنی ذات میں سکڑ نہیں گئی ہے بلکہ ہمیں اپنے اوپر ہونے والے ظلم کا احساس دلاتی ہے۔ اسے اپنے "دوسرے درجے کا شہری" ہونے کا بڑا قلق ہے۔ اس نے اپنے اس رول سے سمجھوتا کر رکھا ہے مگر قبول نہیں کیا ہے' وہ اپنی Upbringing کے باعث شوہر' محبوب یا بیٹے سے بھی برابری سے نہیں ملتی مگر وہ عورت پن کے غرور کے ٹوٹنے کی گونج سے باولی ہوئی جاتی ہے۔ ہم مردوں نے عورت کو کبھی اس کا صحیح مقام نہیں دیا ("اور کبھی" سے میری مراد وہی ہے جو اس لفظ میں ہے)۔ ہم جھوٹ بولتے ہیں جب یہ کہتے ہیں کہ:

دور بیٹھا غبار میر اس سے
عشق بن یہ ادب نہیں آتا

آپ کی یہ نظمیں اور فہمیدہ ریاض کی کئی نظمیں اور کشور ناہید کی کئی نظمیں اور پروین شاکر کی کئی نظمیں مرد کے دوغلے پن کے گرد آلود شیشے پر ہیرے کی لکیریں ہیں۔ میں خوش آمدید کہتا ہوں اور مرد کی بڑائی کی "آرام کرسی" پر بیٹھ کر نہیں بلکہ برابری کی "قالین" پر آلتی پالتی مار کے۔ ان نظموں میں اظہار کے بھی نئے پیرائے ملے ہیں مثلاً

کہاں تک اپنے بوسیدہ بدن محفوظ رکھیں گے

یا

اپنی مٹھی کے گھنگھرو بجاتا رہے گا

یا

ملائم گرم سمجھوتے کی چادر

یا

برسوں کی تپتی آنکھوں میں دھانی رنگ کھلے جاتے ہیں

یا

جسم کی آسائشوں سے کس طرح دامن چھڑاؤں

یہ تو ہوئی اس جہاد کی کہانی جو عورت کی حیثیت سے آپ کے ہاں جاری ہے۔ دوسری طرف وہ جنگ بھی ہے جو تمام شاعروں' ادیبوں اور فلسفیوں کا مقدر ہے۔ ظلم سہتے ہوئے آدمی کے خلاف آواز اٹھانا۔ جیسا کہ میں اوپر لکھ چکا ہوں کئی جگہ انداز صحافیانہ ہو گیا ہے مگر 5'4 نظمیں بہت محسوس کی ہوئی ہیں اور بہت خوبصورت ہیں۔ اس سسکنے والے آدمی کی کراہ ایسے مصرعوں میں عجب طرح سے سنائی دیتی ہے:

ذرا دیر کو اپنا بہتا لہو اپنی مٹھی میں لے لو

یا

ویرانے میں زندگی بسی ہے
سناٹے میں دل دھڑک رہے ہیں

یا

اور کب دودھ سے بادل' جو میں سوچوں گا وہ بن جائیں گے

یا

کہ میرے شاہوں کی تعداد کچھ زیادہ ہے

یا

اس کے روندے ہوئے جسم سے' صرف کچے لہو کی مہک آ رہی ہے

یا

نگاہیں خجل ہیں /زبانیں ورق ہو گئی ہیں

اب آخر میں (اور آخر اس لئے کہ نیند آ رہی ہے) نظم "شام کا پہلا تارا" پر کچھ

جملے لکھنا چاہتا ہوں۔

اس نظم کی ایک ایسی عورت ابھرتی ہے جو بظاہر اپنی زندگی سے مطمئن نظر آتی ہے اور اپنے محبوب کی شکر گزار بھی مگر لہجے میں ایک حزنیہ تھکن ہے جیسے بہت کچھ پانے کے ساتھ ساتھ بہت کچھ کھونے کا احساس بھی ہو۔

نظم کے پہلے حصے اور دوسرے حصے کے درمیان زندگی کا ایک طویل سفر ہے یا لمبا وقفہ ہے۔ پہلے حصے میں دو ذاتوں کی جان پہچان ہے مگر ابتدائے عشق میں بھی نوجوان لڑکے لڑکیوں سا والہانہ پن نہیں ہے۔ سپردگی میں بھی تمکنت ہے۔ مگر یہ اردو شاعری کے محبوب کی تمکنت نہیں ہے، مصرعوں میں سوچ اور نرمی کا احساس لاشعور میں سہمے ہوئے کسی خوف کی نشاندہی کرتا ہے۔ جیسے کوئی محبت آمیز مگر سہمی آنکھوں سے دلاسا دے، اداس نہ ہو، ہم کھلیں گے آہستہ آہستہ۔ طلسم کی طرح، یا "ہم نے اتنے دکھ دیکھے ہیں کہ ہمیں اپنی خوش قسمتی پر اعتبار نہیں آ رہا۔" وغیرہ

نظم کے دوسرے حصے کے دو مصرعے ہمسفری اور سنگت اور ساتھ ساتھ دکھوں اور سکھوں میں شرکت کا بہت خوبصورت اظہار ہیں۔ ان مصرعوں کو Improve نہیں کیا جا سکتا:

تب میں نے کھڑکی کھولی تھی
تم نے پردہ سرکایا تھا

اس نظم کا کلیدی مصرع شام کے ستارے کے بارے میں ہے: جس نے ہمیں دکھ سے دیکھا تھا۔ اور اس مصرعے کا کلیدی لفظ بھی غالب کے ہشت پہلو مصرعے (میں اور دکھ تری مژہ ہائے دراز کا) کی طرح "دکھ" ہے۔ آخر یہ دکھ کیوں؟ دو محبت کرنے والے، کسی رنجش سے نجات حاصل کرنے کے لئے، ایک دوسرے کا ہاتھ بٹانا چاہتے ہیں کہ ستارہ انہیں دکھ سے دیکھتا ہے۔ اصل میں یہ ستارہ ان دونوں روحوں کے اندر ٹپ ٹپ گرتے ہوئے آنسوؤں کا استعارہ ہے۔ اور یہ آنسو اس سوگ میں ہیں کہ وہ وقت جو ہم دونوں ایک دوسرے کی دردگساری میں صرف کرتے، رائیگاں گیا۔

اس نظم میں ایک گداز کرنے والا پہلو یہ بھی ہے کہ دونوں تجدید عہد کرنا چاہتے ہیں مگر مہر خاموشی پہلے کون توڑے؟ اصل میں گرمی شوق کے آداب یہ ہیں کہ لفظ شور

بچائیں، دریا کی طرح۔ اور تجدید عہد کی تہذیب یہ ہے کہ خاموشی بہتی رہے، ندی کی طرح۔

بہت ملائم نظم ہے، کاش آپ "رائے" کا لفظ نکال سکیں۔

اب سوچتا ہوں یہ باتیں تو منہ زبانی بھی کی جا سکتی تھیں۔ 30 کافیوں، 12 بیئروں اور وسکی کے ادھے کے بغیر۔ اسی لئے میں کتابوں پر تبصرے نہیں کرتا ——— مگر خیر ———

آپ کا دوست

ساقی فاروقی

ساقی فاروقی

(اس مضمون کی حیثیت ایک اشاریہ کی سی ہے)

معزز خواتین و حضرات، میں تنہا ہوں اور تنہائی میں آپ سے مخاطب ہوں تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ میری مجبوری دوہری ہے۔ اظہار بھی اور رسائی بھی یعنی دکھ اٹھانا اور لفظوں کو زنجیر کرنا تو لکھنے والے کا مقدر ہے مگر یہ احساس کہ جس استعارے کو جنم دینے کی کوشش میری شاعری میں ملتی ہے اس سے کہیں نہ کہیں کسی نہ کسی ذہن میں کوئی نہ کوئی ارتعاش پیدا ہو گا —— عجب جان آفریں ہے۔ یہ خوش خیالی مجھے خاموش نہیں ہونے دیتی ورنہ یوں ہے کہ لفظوں پر بے اعتباری بڑھتی جاتی ہے۔

○ میں ایک Committed Individual ہوں اور ہجوم سے میری دلچسپی کا سبب یہ ہے کہ اسے افراد بناتے ہیں۔ دس ہزار مزدور کے مشتعل ہجوم کے معنی ہوئے دس ہزار مختلف شخصیتوں کے دس ہزار مختلف ذہنوں کا مجموعی اشتعال'۔ دراصل میں ظلم سہتے ہوئے فرد کا طرفدار ہوں۔ یعنی میں اس کا آدمی ہوں جو دکھ اٹھا رہا ہے۔

اب میں خیال کی اس منزل پر ہوں جہاں دولت یا غربت کے باعث انسانوں (افراد) سے نفرت یا محبت ممکن نہیں۔ ایک جاہل کسان یا ایک فوجی کمانڈر یا ایک گنوار مزدور یا ایک کروڑ پتی سیٹھ میرا دوست یا ہم جلیس اس لئے نہیں بن سکتا کہ ہماری ذہنی لہریں جدا جدا ہیں اور ترسیل کا امکان نہیں مگر میں اس معاشرے کے لئے جنگ کرتا رہوں گا جس میں ہم کسی نہ کسی سطح پر کہیں نہ کہیں مل سکیں۔ سچی بات تو یہ ہے کہ یہ کبھی نہ ختم ہونے والی جنگ ہمیشہ سے جاری ہے مگر تماشائی بن کر بیٹھنا اور تماشے میں شامل نہ ہونا میرے اختیار میں نہیں کہ ذہنی بیداری ایک طرح کا جبر ہے۔

یوں ہے کہ میلان طبع بائیں بازو کی طرف ہے مگر اس لئے نہیں کہ Left is Right بلکہ اس لئے کہ اپنے تجزیے کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ مجھے گفتگو عوام سے ہے۔

○ میں مذہبی آدمی نہیں ہوں۔ مجھے معلوم ہے کہ مسلمان اس لئے پیدا ہوا کہ میرے

ماں باپ مسلمان تھے۔ وہ عیسائی یا ہندو یا یہودی ہوتے تو میرا پیدائشی مذہب کچھ اور ہوتا کہ یہ فیصلہ پیدا ہونے والا نہیں پیدا کرنے والے کرتے ہیں اور میں ایسے کسی فیصلے کا پابند نہیں جو میری فلاح و بہبود کے لئے ہی سہی' میری اجازت کے بغیر کیا گیا ہو۔ یہ تو ممکن نہیں کہ نومولود سے اجازت مانگی جائے مگر یہ تو ممکن ہے کہ وہ نومولود جب آپ سوچ بچار کے قابل ہو تو دوسروں کا فیصلہ بدل سکے۔ پھر خدا کا معاملہ تو بہت ذاتی معاملہ ہے' یہ ایک فرد اور "نامعلوم" کا رشتہ ہے اور فرد اگر ذہن بھی رکھتا ہو تو اسے اس رشتے کا سراغ خود لگانا چاہئے۔ میرے دل میں مذہبی لوگوں کی قدرومنزلت غیرمذہبی لوگوں کی قدرو منزلت سے کم نہیں مگر میں بدقسمتی یا خوش قسمتی سے خدا کی نعمت سے محروم ہوں۔ اگر میرے ذہن کے کمپیوٹر کی پروگرامنگ میں کوئی تبدیلی ہوئی تو میری آنکھیں بیدار ہوں گی۔ یا میرے دل میں کبھی کوئی ٹک ٹک سنائی دی تو میں اس آواز پر اپنے کان بند نہیں کروں گا۔

○ جوں جوں میری عمر گزرتی جاتی ہے' نباتات اور حیوانات سے میری محبت بڑھتی جاتی ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ کائنات پر ان کا اتنا ہی حق ہے جتنا ہم انسانوں کا۔ بلکہ ہم انسانوں نے تو اس کائنات کو بدصورت بنانے میں کوئی دقیقہ نہیں اٹھا رکھا۔ ان بچاروں نے تو خوبصورتی ہی خوبصورتی بکھیری ہے۔ گائے' سور' مینڈک' کچھوا' وہیل' شارک' توتا' مینا' ہرن' کبوتر' فاختہ' زیبرا' شیر' ہاتھی' اونٹ' گدھا' گھوڑا' لنگور' آم' جامن' کٹھل' انار' بیلا' جوہی' موتیا' گلاب اور ایسی ہی کروڑوں چیزیں ہماری توجہ چاہتی ہیں کہ یہ عشرت نظارہ ہیں اور جان مناظر ہیں۔ ان سے محبت کرنے کے یہ معنی نہیں کہ انسانوں سے محبت کم ہو جائے گی ——— میرا تو یہ عالم ہے کہ جیسے جیسے محبت بڑھتی جاتی ہے دل میں کشادگی آتی جاتی ہے۔ محبت کا دائرہ محدود ہو تو دل محدود ہو جاتا ہے۔ میں نے کچھوے کا ایک بچہ پال رکھا ہے۔ جب اس سے گفتگو کرتا ہوں تو اس کی زندہ اور دوررس آنکھوں میں ایک عجب تحریر ابھرتی ہے: "یہ کائنات کیا خوبصورت جگہ ہے مگر افسوس کہ یہاں انسان بہت ہیں ———" ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم اپنے آپ کو اپنے دوسرے "ہم عصروں" کی نظروں سے بھی دیکھنے کی کوشش کرتے رہا کریں۔ اس میں شاید ہمارا ہی بھلا ہو۔

سرورق: آسٹریا کے عظیم مصور KARL KORAB تصویر مصنف: فوٹوگرافر مائیک ٹرنر

ISBN - 969 -35 - 0627 - 8 Rs. 250.00